دہر میں اللہ کے بندے ہیں بہت کیف دار

جس رخ زمانہ پھرے اوسی رخ پھر جاؤ

مقدمہ

جسمین شاعری کی ماہیت اور اوسکے حسن و قبح پر مفصل بحث کی گئی ہے

مع

دیوانِ حالی

مشتملبر قطعات و غزلیات و ترکیب بندات و رباعیات وغیرہ

مصنفہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی مقیم مدرسۃ العلوم علی گڈھ

سنہ ۱۸۹۳ع

مطبع انصاری واقع دہلی میں چھپکر

ٹائیٹل پیج

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپا

حسب ضابطہ رجسٹری ہوگئی ہے

قسم سوم فی جلد ۸ عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

شعروشاعری پر

تمہید

حکیم علی الاطلاق نے اس ویرانہ آباد نما یعنی کارخانہ دنیا کی رونق اور انتظام کے لیئے انسان کے مختلف گروہوں میں مختلف قابلیتیں پیدا کی ہیں تاکہ سب گروہ اپنے اپنے مذاق اور استعداد کے موافق جدا جدا کاموں میں مصروف رہیں۔ اور ایک دوسرے کی کوشش سے سب کی ضرورتیں رفع ہوں اور کسیکا کام اٹکا نہ رہے۔ اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چنداں سودمند نہیں معلوم ہوتے۔ مگر چونکہ قسامِ ازل سے انکو یہی حصہ پُہنچا ہے اسلئے وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ جو کام اُن کی کوشش سے سرانجام ہوتا ہی گو تمام عالم کی نظر میں اُسکی کچھ وقعت نہ ہو۔ مگر اُن کی نظر میں وہ ویسا ہی ضروری اور ناگزیر ہے جیسے اور گروہوں کے مفید اور عظیم الشان کام تمام عالم کی نظر میں ضروری اور ناگزیر ہیں۔ کسان اپنی کوشش سے عالم کی پرورش کرتا ہے۔ اور معمار کی کوشش سے لوگ سردی

گرمی مینہہ اور آندھی کی گزند سے بچتے ہیں اسلیئے دونو کے کام سب کے نزدیک عزت اور قدر کے قابل ہیں۔ لیکن ایک بانسری بجانے والا جو کسی سُنسان ٹیکرے پر تن تنہا بیٹھا بانسری کی لَے سے اپنا دل بہلاتا اور شاید کبھی کبھی سننے والوں کے دل بھی اپنی طرف کھینچتا ہی گو اُسکی ذات سے بنی نوع کے فائدہ کی چنداں توقع نہیں۔ مگر وہ اپنے دلچسپ شغلہ کو کسان اور معمار کے کام سے کچھ کم ضروری نہیں سمجھتا۔ اور اِس خیال سے اپنے دل میں خوش ہی کہ اگر اس کام کو سلسلۂ تمدن میں کچھ دخل نہوتا تو صانعِ حکیم انسان کی طبیعت میں اسکا مذاق ہرگز پیدا نہ کرتا

ہزار رنگ دریں کارخانہ در کار ست   مگیر نکتہ نظیری ہمہ نکو بستند

شعر کی مدح و ذم

شعر کی مدح و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جسقدر اُسکی مذمت کی گئی ہے وہ بہ نسبت مدح کے زیادہ قرین قیاس ہے۔ خود ایک شاعر کا قول ہی کہ دنیا میں شاعر کے سوا کوئی ذلیل سے ذلیل پیشہ والا ایسا نہیں ہے جسکی سوسائٹی کو ضرورت نہو۔ افلاطون نے جو یونان کے لیئے جُمہوری سلطنت کا ایک خیالی ڈھانچ بنایا تھا۔ اُسمیں شاعروں کے سوا ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگوں کی ضرورت تسلیم کی تھی۔ زمانۂ حال میں بعضوں نے شعر کو میجک لینٹرن سے تشبیہ دی ہی یعنی میجک لینٹرن جسقدر زیادہ تاریک کمرے میں روشن کیجاتی ہے اُسیقدر زیادہ جلوے دکھاتی ہی۔ اسیطرح شعر جسقدر جہل و تاریکی کے زمانہ میں ظہور کرتا ہے اُسیقدر زیادہ رونق پاتا ہی۔

[illegible]

یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں جو شعر کے برخلاف کہی گئی ہیں۔ ایسی ہیں جو لامحالہ تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ مگر اس بات کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوئے ہیں جنکو قدرت نے اسی کام کے لیئے بنایا تھا اور یہ ملکہ انکی طبیعت میں ودیعت

کیا تھا اگرچہ اکثر نے اُس ملکہ کو مقتضائے فطرت کے خلاف استعمال کیا۔ پس ایک ایسے عطیہ کو جو قدرت نے عنایت کیا ہو صرف اس وجہ سے کہ اکثر لوگ اُسکو فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں کسی طرح عبث اور بیکار نہیں کہا جاسکتا عقل خدا کی ایک گراں بہا نعمت ہے۔ مگر بہت سے لوگ اسکو مکر و فریب اور شر و فساد میں استعمال کرتے ہیں۔ اسیطرح شجاعت ایک عطیۂ الٰہی ہے مگر بعض اوقات وہ قتل و غارت و رہزنی میں صرف کیجاتی ہے۔ کیا اِس سے عقل کی شرافت اور شجاعت کی فضیلت میں کچھ فرق آسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسیطرح ملکۂ شعر کسی کے بُرے استعمال سے بُرا نہیں ٹھیر سکتا +

یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ جسمیں شاعری کا مادہ ہوتا ہے وہی شاعر بنتا ہے۔ شاعری کی سب سے پہلی علامت موزونیِ طبع سمجھی جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو اشعار بعضے فاضلوں سے موزوں نہیں پڑھے جاتے اُنکو بعض اَن پڑھ اور صغیر سن بچے بلا تکلف موزوں پڑھ دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ بعض طبیعتوں میں اُسکی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ پس جو شخص اس عطیۂ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا ممکن نہیں کہ اُس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے +

شعر کی تاثیر

شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ سامعین کو اکثر اُس سے حزن یا نشاط یا جوش یا افسردگی کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اور اِس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر اُس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ بھاپ سے جو حیرت انگیز کرشمے اب ظاہر ہوئے ہیں اُنکا سراغ اول اُس خفیف حرکت میں لگا تھا جو اکثر پکتی ہانڈی پر چپنی کو بھاپ کے زور سے ہوا کرتی ہے

اُسوقت کون جانتا تھا کہ اِس ناچیز گیس میں جرار لشکروں اور زفتار دریاؤں کی طاقت چھپی ہوئی ہے۔

تھیٹر

ہمارے مُلک میں بھانڈ اور نقالوں کا کام بہت ذلیل سمجھا جاتا ہے اور ہولی میں جو سوانگ بھرے جاتے ہیں وہ سوسائٹی کے لیئے مضر خیال کیئے جاتے ہیں لیکن یورپ میں اسی سوانگ اور نقالی نے اصلاح پاکر قوموں کو بے انتہا اخلاقی اور تمدنی فائدے پہنچائے ہیں +

نوبت

باجے کے تمام آلات جو ہمارے ہاں ہمیشہ لہو ولعب کے مجمعوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور جنکو یہاں کے عقلا محض فضول جانتے ہیں شایستہ قوموں نے اُنکے مناسب استعمال سے نہایت گرانبہا فائدے اُٹھائے ہیں۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ میدان جنگ میں جب اصول مقررہ کے موافق باجا بجتا ہے تو سپاہ کے دل حد سے زیادہ بڑھجاتے ہیں۔ اور افسر کے حکم پر ہر سپاہی جان فدا کرنے کو موجود ہو جاتا ہے۔ اور جب کسیوجہ سے جنگ کے موقع پر باجا بجنے سے رُک جاتا ہے تو اُن کے دل سرد ہو جاتے ہیں اور افسر کا حکم بہت کم مانا جاتا ہے +

شعر کا عمل

تاریخ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کی ہے۔ بعض اوقات شاعر کا کلام جمہور کے دل پر ایسا تسلط کرتا ہے کہ شاعر کی ہر ایک چیز یہاں تک کہ اُسکے عیب بھی خلقت کی نظر میں مستحسن معلوم ہونے لگتے ہیں اور لوگ اسبات میں کوشش کرتے ہیں کہ آپ بھی اُن عیبوں سے متصف ہو کر دکھائیں بائرن کی نسبت مشہور ہے کہ " لوگ اُسکی تصویر نہایت شوق سے خریدتے تھے اور اُسکی نشانیاں اور یادگاریں سینت سینت کر رکھتے تھے۔ اُسکے اشعار حفظ یاد کرتے تھے اور ویسے ہی اشعار کہنے میں کوشش کرتے تھے۔ بلکہ یہ چاہتے تھے کہ خود بھی ویسے ہی دکھائی دینے لگیں۔ اکثر لوگ آئینہ

سامنے رکھکر مشق کیا کرتے تھے کہ اوپر کے ہونٹ اور پیشانی پر ویسی ہی شکن ڈال لیں جیسی کہ لارڈ بائرن کی بعض تصویروں میں پائی جاتی ہے۔ بعضوں نے اُسکی ریس[8] سے گلوبند باندھنا چھوڑ دیا تھا"

پولٹکل معاملات میں شعر سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں

یوروپ میں پولٹکل مشکلات کیوقت قدیم سے پوئٹری کو قوم کی ترغیب و تحریض کا ایک زبردست آلہ سمجھتے رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں ایتھنز اور مگارا والوں میں جزیرہ سیلمس کی بابت مدت دراز تک جنگ رہی جسمیں ایتھنز والوں کو برابر شکستیں ہوتی رہیں۔ اور رفتہ رفتہ اُنکا حوصلہ ایسا پست ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے لڑائی سے دست بردار ہو گئے۔ اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ جو شخص اس لڑائی کا ذکر کرے یا دوبارہ لڑنے کی تحریک دے وہ قتل کیا جائے۔ اُسوقت ایتھنز کا مشہور مقنن سولن زندہ تھا۔ اُسکو نہایت غیرت آئی۔ اُسنے اہل وطن کو پھر لڑائی پر آمادہ کرنا چاہا۔ وہ دانستہ مجنون بن گیا۔ جب ایتھنز میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ سولن دیوانہ ہو گیا ہے اُسنے کچھ اشعار نہایت درد انگیز لکھے اور پرانے زدہ کپڑے پہنکر اور اپنے گلے میں ایک رسّی اور سر پر پرانی چادر ڈالکر گھر سے نکلا۔ لوگ یہ حال دیکھکر اُسکے گرد جمع ہو گئے۔ وہ ایک بلندی پر جہاں اکثر فصحا منادی کیا کرتے تھے جا کھڑا ہوا۔ اور اپنی عادت کے خلاف اشعار پڑھنے شروع کیے جنکا مضمون یہ تھا "کاش مَیں ایتھنز میں پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ عجم یا بَربَر یا کسی اور ملک میں پیدا ہوتا

---

[8] لکھنؤ میں میر انیس اور مرزا دبیر نے بھی تقریباً ایسی ہی قبولیت حاصل کی تھی جو لوگ میر انیس کو پسند کرتے تھے وہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں جہاں تک ہو سکتا تھا میر انیس کی تقلید کرتے تھے اور جو فریق مرزا دبیر کا طرفدار تھا وہ ہر ایک بات میں اُنکی پیروی کرتا تھا مگر لارڈ بائرن اور ان دونو صاحبوں کی قبولیت میں اتنا فرق ہے کہ لارڈ بائرن کی عظمت اہل انگلستان کے دل میں صرف اسوجہ سے تھی کہ وہ اُسکو اپنا قومی شاعر سمجھتے تھے اور اسی لیئے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونو فرقے اُسکو یکساں عزیز رکھتے تھے۔ بخلاف انیس و دبیر کے کہ اُنکی عظمت محض ایک مذہبی شاعر ہونے کی وجہ سے تھی اور اسی لیئے ان کی بڑائی اور بزرگی جیسی کہ عموماً ایک فرقہ کے دل میں تھی ویسی علی العموم دوسرے فرقہ کے دل میں نہ تھی یہ امتیاز یعنے قومی اور مذہبی حیثیت کا ہمارے اور اہل یوروپ کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے ۱۲

جہاں کے باشندے میرے ہموطنوں سے زیادہ جفاکش۔ سنگدل اور یونان کے علم و حکمت سے بیخبر ہوتے۔ وہ حالت میرے لیئے اِس سے بہت بہتر تھی کہ لوگ مجھے دیکھکر ایک دوسرے سے کہیں کہ یہ شخص اُسی ایتھنز کا رہنے والا ہے جو سیلمس کی لڑائی سے بھاگ گیئے۔ اے عزیزو جلد دشمنوں سے انتقام لو۔ اور یہ ننگ و عار ہمسے دور کرو۔ اور چین سے نہ بیٹھو۔ جب تک کہ اپنا چھنا ہوا ملک ظالم دشمنوں کے پنجے سے نہ چھڑالو" اِن غیرت انگیز اشعار سے ایتھنز والوں کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اُسیوقت سب نے ہتھیار سنبھالکر سولن کو سپاہ کا سردار اور حاکم مقرر کیا اور سب کے سب ماہی گیروں کی کشتیوں میں سوار ہوکر سیلمس پر چڑھ گئے۔ آخر جیسا کہ تاریخ میں بتفصیل مذکور ہے جزیرہ سیلمس پر قابض ہو گئے۔ اور دشمنوں میں سے بہت سے قید ہوئے اور باقی تمام مال و اسباب چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایکبار پھر غنیم نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ سیلمس پر چڑھائی کی مگر کچھ فائدہ نہوا۔ +

ویلز | انگلستان کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِڈورڈ نے جب ویلز پر چڑھائی کی تو ویلز کے شاعروں نے قومی ہمدردی کے جوش میں نہایت ولولہ انگیز اشعار کہنے شروع کیئے۔ تاکہ اہل ویلز کی ہمت اور غیرت زیادہ ہو۔ اگرچہ انگلستان کی سپاہ کے آگے اُنکی کچھ حقیقت نہ تھی لیکن شاعروں کے پرجوش کلام نے اُنمیں حُبّ وطن کا جوش اسقدر پھیلا دیا تھا کہ جب وہ فوج شاہی کے مقابلہ میں کامیابی سے بالکل مایوس ہو گئے تو بھی اطاعت خوشی سے قبول نہ کی۔ شاعروں کے کلام سے اڈورڈ کی اسقدر مزاحمت ہوئی اور اُسکو ایسی دقتیں اُٹھانی پڑیں کہ فتح کے بعد اُسنے ویلز کے تمام شاعروں اور نسابوں کو قتل کروا ڈالا۔ اگرچہ شاعری کا نتیجہ ویلز کے شاعروں کے حق میں بہت بُرا ہوا

اور ملک کے لیئے بھی کچھ مفید نہوا۔ لیکن اس واقعہ سے شعر کی تاثیر اور کرامت بخوبی ثابت ہوتی ہے ✣

مثال ۳ لارڈ بائرن کی نظم موسوم بہ چائلڈ ہیرلڈز پلگریمیج ایک مشہور نظم ہے جسکے ایک حصہ میں فرانس۔ انگلستان اور روس کو غیرت دلائی ہے اور یونان کو ترکوں کی اطاعت سے آزاد کرانے پر برانگیختہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو فائدے یونان کے علم و حکمت سے یوروپ نے اور خاصکر فرانس اور انگلستان نے حاصل کیئے ہیں اُسکا بدلہ آجتک یونان کو کچھ نہیں دیا گیا۔ اور رُوس نے بھی جو کہ گریک چرچ کی پیروی کا دم بھرتا ہے یونان کو کسی قسم کی مدد نہیں دی۔ پھر تینوں سلطنتوں کو غیرت دلانے کے لیئے یونانیوں کو ترغیب دی ہے کہ غیروں سے کچھ امید رکھنی نہ چاہیئے۔ بلکہ خود اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے ترکوں کی غلامی سے آزاد ہو جانا چاہیئے۔ سنہ ۱۸۱۲ء میں اس نظم کی اشاعت ہوئی جسکے سبب بائرن کی شاعری کی تمام یوروپ میں دھوم ہو گئی اور انگریز اُس کی نظم پر مفتون ہو گئے۔ نتیجہ اِسکا یہ ہوا کہ فرانس۔ انگلستان اٹلی۔ آسٹریا اور روس میں اس نظم نے وہ کام کیا جو آگ بارود پر کرتی ہے۔ جس وقت یونان نے ٹرکی سے بغاوت اختیار کی یوروپ کا متفقہ بیڑا فوراً اُس کی کمک کو پہنچا۔ سنہ ۱۸۲۷ء میں متفقہ بیڑے نے ترکوں کے بیڑے کو شکست دی اور ٹرکی کو یونان کے آزاد کرنے پر مجبور کیا گیا اور اُسکی آزادی کو تمام یوروپ نے تسلیم کر لیا۔ ادھر ایک ڈنمارک کا شہزادہ یونان کا بادشاہ بنایا گیا اور یونان میں پارلیمنٹ قائم کی گئی ✣

مثال ۴ سنہ ۱۸۳۰ء میں جب کہ چارلس دہم بادشاہ فرانس نے قانون آزادی کے برخلاف کارروائی

کرنی شروع کی اور عاملے فرانس میں سخت اضطراب اور سرگی پیدا ہوئی۔ اُسوقت فرانس میں بھی دو قصیدے[8] ایک منسوب بہ پیرس اور دوسرا منسوب بہ مارسلیز لکھے گئے تھے جو گذرگاہوں اور شاہ راہوں میں طبل جنگ پر گائے جاتے تھے۔ اور جنہیں لوگوں کو بادشاہ سے بغاوت اور آزادی کی حمایت کرنے پر اُکسایا گیا تھا

الغرض یوروپ میں لوگوں نے شعر سے بہت بڑے بڑے کام لئے ہیں خصوصاً ڈرمیٹک پوئیٹری نے یوروپ کو جسقدر فائدہ پہنچایا ہے اسکا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے اسیواسطے شکسپیر کے ڈراما۔ جنسے پولٹیکل سوشل اور مورل ہر طرح کے بیشمار فائدے اہل یوروپ کو پہنچے ہیں ہبائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ جو لوگ مذہب کی قید سے آزاد ہیں وہ انکو بائبل سے بھی زیادہ سودمند اور فائدہ رساں خیال کرتے ہیں +

ایشیا کی شاعری میں اگرچہ ایسی مثالیں جیسی کہ اوپر ذکر کی گئیں شاید مشکل سے مل سکیں لیکن ایسے واقعات بکثرت بیان کئے جاسکتے ہیں جنسے شعر کی غیر معمولی تاثیر اور اُسکے جادو کا کافی ثبوت ملتا ہے +

[8] رفاعہ افندی ناظر مدرسۂ السنہ مختلفۂ مصر نے اِن دونو قصیدوں کو عربی نظم میں ترجمہ کرکے اپنے سفرنامہ میں جسکا نام الدیوان النفیس بایوان ... ہے نقل کیا ہے۔ ان دونو کا پہلا ایک ایک بند یہاں لکھا جاتا ہے

قصیدۂ باریسیہ

یا اهل فرانسة الغرّا — یا شجعانا بشهامتکم
عشقتم فی الحریة وطنیه — والآن خذوا حریتکم
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

قصیدۂ مرسیلیہ

فیا یابنی الاوطان هیّا — فوقت فخارکم لکم [illegible]
اقیموا الرایة فعظمی سویّا — وشنوا غارة الهیجا مثنا
علیکم یالسلاح ابا الاهالی — ونظموا صفوفکم مثل اللآلی
وخوضوا فی دماء الرجال — فهم اعداؤکم فی [illegible]
وجودهم غدا فیکم جلیا — باخوضوا دماء [illegible]

اعشیٰ کے کلام کی تاثیر

عرب کا مشہور شاعر میمون بن قیس جسکو نابینا ہونے کے سبب اعشیٰ کہتے تھے اُسکے کلام میں یہ تاثیر ضرب المثل تھی کہ جسکی مدح کرتا ہے وہ عزیز و نیکنام اور جسکی ہجو کرتا ہے وہ ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے۔ ایک بار ایک عورت اُسکے پاس آئی اور یہ کہا کہ میری لڑکیاں بہت ہیں اور کہیں اُنکو بَر نہیں ملتا۔ اگر تو چاہے تو لوگوں کو شعر کے ذریعہ سے ہمارے خاندان کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اعشیٰ نے اُسکی لڑکیوں کے حسن و جمال و خصائل پسندیدہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جسکی بدولت اُن لڑکیوں کی صورت اور سیرت کا چرچا تمام ملک میں پھیل گیا اور چاروں طرف سے اُنکے پیغام آنے لگے۔ یہاں تک کہ اُمرا نے بھاری بھاری مہر مقرر کر کے اُنسے شادیاں کر لیں۔ لڑکیوں کی ماں جب کوئی لڑکی بیاہی جاتی تھی ایک اونٹ بطور شکریہ کے اعشیٰ کے واسطے ہدیہ بھیجدیتی تھی ٭

زمانہ جاہلیت کے شعرا کی تاثیر

اسکے سوا زمانہ جاہلیت کی شاعری میں ایسی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ مثلاً شاعر اپنے قبیلہ کو جب کہ تمام قبیلہ کے لوگ اپنے مقتول کا خوں بہا لینے پر راضی ہیں ملامت کرتا ہے اور قاتل سے انتقام لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ یا کسی رنجش کی وجہ سے اپنے قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے لڑنے یا بدلہ لینے کے لیئے برانگیختہ کرتا ہے۔ یا اپنے پانی کے چشمہ یا چراگاہ کے چھن جانے پر قوم سے مدد لینی اور اُن میں جوش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اکثر اپنی تحریک میں کامیاب ہوتا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن معدیکرب جو کہ بنی زبید کا سردار تھا

٭ یہ ایک مخضرمی شاعر ہے یعنی اسنے جاہلیت اور اسلام دونو زمانے دیکھے ہیں اسنے ایک قصیدہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت میں بھی لکھا تھا اور یہی عرب کا پہلا شاعر ہے۔ جسنے مدح گوئی کا مدار صلہ و جائزہ پر رکھا تھا۔ اور محض مداحی کی بدولت دولتمند ہو گیا تھا ٭ ۱۲

ایک روز بنی مازن کی مجلس میں بیٹھا تھا اور شراب پی رکھی تھی کہ مخزوم مازنی کے ایک حبشی غلام نے کچھ اشعار ایک عورت کی تشبیب کے جو کہ بنی زبید میں سے تھی گائے۔ عبد اللہ نے اُٹھکر زور سے اُسکے مُنہ پر طمانچہ مارا۔ غلام چلّایا۔ بنی مازن نے غیظ و غضب میں آکر عبد اللہ کو مار ڈالا۔ پھر عمرو بن معدیکرب کے پاس جو کہ عبد اللہ کا بھائی تھا جاکر عذر کیا کہ تمھارے بھائی کو ہم میں سے ایک نادان آدمی نے جو نشہ میں مدہوش تھا مار ڈالا ہے۔ سو ہم تمسے عفو کے خواستگار ہیں اور خون بہا جسقدر چاہو دینے کو تیار ہیں۔ عمرو خونبہا لینے پر آمادہ ہوگیا۔ جب بھائی کی آمادگی کا حال کبشہ بنت معدیکرب کو معلوم ہوا تو اُسنے نہایت ملامت آمیز اشعار کہے جنمیں عمرو کو انتقام نہ لینے پر سخت غیرت دلائی ہے۔ آخر عمرو بہن کی ملامت سے متاثر ہوکر انتقام لینے کو کھڑا ہوگیا۔ اور مازنیوں سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لیکر چھوڑا۔

رودکی کے کلام کی تاثیر

ایران کے مشہور شاعر رودکی کا قصہ مشہور ہے کہ امیر نصر بن احمد سامانی نے جب خراسان کو فتح کیا اور ہرات کی فرحت بخش آب و ہوا اُسکو پسند آئی تو اُسنے وہیں مقام کر دیا اور بخارا جو کہ سامانیوں کا اصلی تختگاہ تھا اُسکے دل سے فراموش ہوگیا۔ لشکر کے سردار اور اعیان اُمرا جو بخارا میں عالیشان عمارتیں اور عمدہ باغات رکھتے تھے ہرات میں رہتے رہتے اُکتا گئے اور اہل ہرات بھی سپاہ کے زیادہ ٹھیرنے سے گھبرا اُٹھے۔ سب نے اُستاد ابو الحسن رودکی سے یہ درخواست کی

---

8 کبشہ کے اشعار یہ ہیں۔

اَرْسَلَ عبدُ اللّٰهِ اِذْ حَانَ یَوْمُہٗ ۔۔۔ اِلٰی قَوْمِہٖ لَا تَعْقِلُوْا لَھُمْ دَمِی

وَلَا تَاْخُذُوْا مِنْھُمْ اِفَالاً وَّ اَبْکُرًا ۔۔۔ وَاُتْرَکُ فِیْ بَیْتٍ بِصَعْدَۃَ مُظْلِمِ

وَدَعْ عَنْکَ عَمْرًا اِنَّ عَمْرًا مُسَالِمٌ ۔۔۔ وَھَلْ بَطْنُ عَمْرٍو غَیْرُ شِبْرٍ لِمَطْعَمِ

فَاِنْ اَنْتُمْ لَمْ تَثْاَرُوْا وَاتَّدَیْتُمْ ۔۔۔ فَمَشُّوْا بِاٰذَانِ النَّعَامِ الْمُصَلَّمِ

وَلَا تَرِدُوْا اِلَّا فُضُوْلَ نِسَآئِکُمْ ۔۔۔ اِذَا ارْتَمَلَتْ اَعْقَابُھُنَّ مِنَ الدَّمِ

کہ کسیطرح امیر کو بخارا کیطرف مراجعت کرنے کی ترغیب دے۔ رودکی نے ایک قصیدہ[8] لکھا اور جسوقت بادشاہ شراب اور راگ رنگ میں محو ہو رہا تھا اُسکے سامنے پڑھا۔ اِس قصیدہ نے امیر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ جمی جمائی محفل چھوڑ کر اُسیوقت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر مع لشکر کے بخارا کو روانہ ہو گیا۔ اور دس کوس پر جاکر پہلی منزل کی +

شاید اِس قبیل کے واقعات ایشیائی شاعری میں کم دستیاب ہوں۔ لیکن ایسی حکایتیں بیشمار ہیں کہ شعر کسی مناسب موقع پر پڑھا یا گایا گیا۔ اور سامعین کے دل قابو سے باہر ہو گئے۔ اور صحبت کا رنگ دگرگوں ہو گیا۔ اِس موقع پر ایک حکایت نقل کیجاتی ہے +

حکایت میراں صاحب اور نور بائی

نور بائی گائن جسنے اپنے حسن و جمال۔ خوش آوازی۔ بذلہ سنجی۔ اور مصاحبت کی عمدہ لیاقت کے سبب محمد شاہ کے تقرب کا درجہ حاصل کیا تھا۔ اور جو تمام امراے دربار کے دلوں پر قابض تھی ایک روز نواب روشن الدولہ کے ہاں بیٹھی تھی اور ہنسی چہل کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں غالباً میراں سید بھیک صاحب کی سواری جنسے نواب کو کمال عقیدت تھی آپہنچی۔ نواب نے فوراً بائی کو دوسرے کمرے میں بٹھا کر آگے سے چلمن چھڑوا دی۔ **میراں صاحب** آئے اور اتفاق سے بہت دیر تک بیٹھے۔ **بائی** جو ایک نہایت چلبلی اور بے چین طبیعت کی عورت تھی تنہائی میں زیادہ

---

[8] اِس قصیدہ کے اول کے چند شعر یہ ہیں +

بوئے یار مہرباں آید ہے — یاد جوئے مولیاں آید ہے
ریگ آموے و درشتیہائے او — پائے ما را پرنیاں آید ہے
آب جیحون و شگر فیہائے او — خنگ ما را تا میاں آید ہے
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ سویت میہماں آید ہے
شاہ ماہ ہست و بخارا آسماں — ماہ سوئے آسماں آید ہے
شاہ سرو ست و بخارا بوستاں — سرو سوئے بوستاں آید ہے

بیٹھنے کی تاب نہ لاکر بیباکانہ باہر نکل آئی۔ اور شیخ کی حضور میں جُھک کر آداب بجالائی۔ اور عرض کی کہ لونڈی کو حکم ہو تو کچھ گائے **میراں صاحب** چونکہ سماع کے عاشق تھے خاموش ہو رہے بائی نے اُن کی خاموشی کو اجازت سمجھ کر یہ رباعی نہایت سوز و گداز کی لَے میں گانی شروع کی۔

شیخے بہ زنے فاحشہ گفتا مستی　　کز خیر گُسستی و بہ شر پیوستی

زن گفت چنانکہ مینمُایم ہستم　　تو نیز چنانکہ مینمُائی ہستی ؟

شیخ کی حالت اِس برمحل رباعی کے سُننے سے ایسی متغیر ہوگئی کہ بائی کو اپنی جسارت سے سخت نادم ہونا پڑا۔ باوجودیکہ نوربائی کو خاموش کردیا گیا تھا شیخ کی شورش کسیطرح کم نہ ہوتی تھی۔ وہ زمین پر مرغ بسمل کیطرح لوٹتے تھے اور دیواروں میں سر دے دے مارتے تھے۔ دیر تک یہی حال رہا۔ اور بہت مشکل سے ہوش میں آئے ؛

شاعری شائستگی کے زمانہ میں ترقی پا سکتی ہے

بہرحال شعر اگر اصلیت سے بالکل متجاوز اور محض بے بنیاد باتوں پر مبنی نہو تو تاثیر اور دلنشینی اُسکی نیچر میں داخل ہے۔ لیکن شاعری کی نسبت جو رائیں زمانہ حال کے اکثر محققوں نے قائم کی ہیں اُنکا جُھکاؤ اسطرف پایا جاتا ہے کہ سویلزیشن کا اثر شعر پر بُرا ہوتا ہے جسقدر کہ علم زیادہ محقق ہوتا جاتا ہے۔ اُسیقدر تخیل جسپر شاعری کی بُنیاد ہے گھٹتا جاتا ہے اور رُکید کی عادت جو ترقی علم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ شعر کے حق میں سم قاتل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک سوسائٹی نیم شائستہ اور اُسکا علم اور واقفیت محدود رہتی ہے اور علل و اسباب پر اطلاع کم ہوتی ہے اُسوقت تک زندگی خود ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کی سرگذشت جو کہ بالکل ایک واقعات کا سلسلہ ہوتا ہے اگر ایک نیم شائستہ سوسائٹی میں سیدھے سادے طور پر بھی

بیان کیجائے تو اُس سے کہیں خوف اور کہیں تعجب اور کہیں جوش خود بخود پیدا ہو جاتا ہے - اور انھیں چیزوں پر شاعری کی بنیاد ہی - لیکن جب شایستگی زیادہ پھیلتی ہی تو یہ چشمے بند ہو جاتے ہیں - اور اگر کہیں بند نہیں ہوتے تو اُنکو نہایت احتیاط کے ساتھ روکا جاتا ہے - تاکہ اُن کا مضحکہ نہ اُڑے ٭

اِس رائے کا ایک بڑا حامی یہ کہتا ہے کہ شعر دل پر ویسا ہی پردہ ڈالتا ہے جیسا میجک لینٹرن آنکھ پر ڈالتی ہے. جسطرح اس لال ٹین کا تماشا بالکل اندھیرے کمرے میں پورے کمال کو پہنچتا ہے اسیطرح شعر محض تاریک زمانہ میں اپنا پورا کرشمہ دکھاتا ہی - اور جسطرح روشنی کے آتے ہی میجک لینٹرن کی تمام نمائشیں نابود ہو جاتی ہیں اسیطرح جوں جوں حقیقت کی حدود اربعہ صاف اور روشن اور احتمالات کے پردے مرتفع ہوتے جاتے ہیں اُسیقدر شاعری کے سیمیائی جلوے کافور ہوتے جاتے ہیں کیونکہ دو متناقض چیزیں یعنے حقیقت اور دھوکا جمع نہیں ہو سکتیں "

فردوسی کی مثال

اِس مطلب کے زیادہ دلنشین ہونے کے لیئے ذیل کی مثال پر غور کرنی چاہیئے فردوسی نے اپنے ہیرو رستم کی زورمندی اور بہادری کے متعلق جو کچھ شاہنامہ میں لکھا ہے. ایک زمانہ وہ تھا کہ اُسکو سُنکر رستم کی غیر معمولی عظمت اور بڑائی کا یقین دل میں پیدا ہوتا تھا. اُسکے زور اور شجاعت کا حال سُنکر تعجب کیا جاتا تھا. سامعین کے دلمیں خود بخود اُسکے ساتھ ہمدردی اور اُسکے حریفوں سے برخلافی کا خیال پیدا ہوتا تھا - لیکن اب جسقدر کہ علم بڑھتا جاتا ہے روز بروز وہ طلسم ٹوٹتا جاتا ہے اور وہ زمانہ قریب آتا ہے کہ رستم ایک معمولی آدمی سے زیادہ نہ سمجھا جائیگا ٭

[illegible]

اگرچہ یہ رائے جو شاعری کی نسبت اوپر بیان ہوئی کسیقدر صحیح ہے مگر اسکو بھی بے سوچے

سمجھے قبول کرنا نہیں چاہیے۔ جو لوگ اس رائے کے برخلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ علم کی ترقی سے الفاظ کے معنی محدود اور بہت سی باتوں کی واقعیت کے خیال محو ہوگئے ہیں۔ مگر زبانیں پہلے کی نسبت زیادہ لچکدار اور اکثر مقاصد کے بیان کرنیکے زیادہ لائق ہوتی جاتی ہیں۔ بہت سی تشبیہیں بلاشبہ اس زمانہ میں بیکار ہوگئی ہیں مگر ذہن نئی تشبیہیں اختراع کرنیسے عاجز نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ سائنس اور مکینکس جو شاعرانہ خیالات کو مردہ کرنے والے ہیں لیکن اُنھیں کی بدولت شاعر کے لیئے نئی نئی تشبیہات اور تمثیلات کا لازوال ذخیرہ جو پہلے موجود نہ تھا مہیا ہوگیا ہے اور ہوتا جاتا ہی وہ اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ سوسائٹی کے ترقی کرنے سے امیجنیشن یعنے تخیّل کی طاقت ضعیف ہوجاتی ہے بلکہ اُنکا قول ہے کہ جب تک انسان کا یہ عتقاد ہے کہ اَبد کے ساتھ ہمارا رشتہ مضبوط ہے جب تک بیشمار اسباب اور موانع جنکا انکار نہیں ہوسکتا چاروں طرف سے ہمکو گھیرے ہوئے ہیں جبتک عشق انسان کے دل پر حکمراں ہے اور ہر فرد بشر کی روداد زندگی کو ایک دلچسپ قصہ بنا سکتا ہی۔ جب تک قوموں میں حُبّ وطن کا جوش موجود ہے۔ جب تک بنی نوع۔ انسانی ہمدردی پر متفق ہوکر شامل ہونے کے لیئے حاضر ہیں اور جب تک حوادث اور وقائع جو زندگی میں وقتاً بعد وقتِ حادث ہوتے ہیں خوشی یا غم کی سلسلہ جنبانی کرتے ہیں تب تک اِس بات کا خوف نہیں ہوسکتا کہ تخیل کی طاقت کم ہوجائے گی۔ اور اس سے بھی کم خوف جب تک کہ نیچر کی کان کھلی ہوئی ہی اِس بات کا ہے کہ شاعر کا ذخیرہ نبڑ جائے گا۔ ہاں مگر اسمیں شک نہیں کہ نیچر کی جو نمایاں چیزیں تھیں وہ اگلے مزدوروں نے چُن لیں اور چونکہ اُنکے لیئے وہ پہلی تھیں اور اسلیئے عجیب تھیں۔ اَب اُنکے تعجب انگیز بیان پر کوئی سبقت نہیں لیجا سکتا ۱۱

شاعری کا تعلق اخلاق سے

شعر سے جسطرح نفسانی جذبات کو اشتعالک ہوتی ہے ۔اسیطرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں۔ اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اُسکے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جسکے بیان کرنیکی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کیطرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن ازروے انصاف اُسکو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ اِسی بنا پر صوفیۂ کرام کے ایک جلیل القدر سلسلہ میں سماع کو جسکا جزو اعظم اور رکنِ رکین شعر ہے وسیلۂ قربِ الٰہی اور باعثِ تصفیۂ نفس و تزکیۂ باطن مانا گیا ہے +

فائدہ شعر

یوروپ کا ایک محقق کہتا ہے کہ مشاغل دنیوی میں انہماک کے سبب جو قوتیں سوجاتی ہیں شعر اُنکو جگاتا ہے۔ اور ہمارے بچپن کے اُن خالص اور پاک جذبات کو جو لوثِ غرض کے داغ سے منزہ اور مبرا تھے پھر تروتازہ کرتا ہے۔ دنیوی کاموں کی مشق اور ممارست سے بیشک ذہن میں تیزی آجاتی ہے ۔مگر دل بالکل مرجاتا ہے ۔جبکہ افلاس میں قوت لایموت کے لیئے یا تونگری میں جاہ و منصب کے لیئے کوشش کیجاتی ہے اور دنیا میں چاروں طرف خودغرضی دیکھی جاتی ہے ۔اُس وقت انسان کو سخت مشکلیں پیش آتیں اگر اُسکے پاس کوئی ایسا علاج نہوتا جو دل کے بہلانے اور تروتازہ کرنے میں چپکے ہی چپکے مگر نہایت قوت کے ساتھ افلاس کی صورت میں مرہم اور تونگری کی صورت میں تریاق کا کام دے سکے ۔ یہ خاصیت خدا نے شعر میں ودیعت کی ہے ۔وہ ہمکو محسوسات کے دائرہ سے نکالکر گذشتہ اور آئندہ حالتوں کو ہماری موجودہ حالت پر غالب کردیتا ہے۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعہ سے اخلاق پر ہوتا ہے پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ فاضلہ اکتساب

کرسکتی ہے۔ قومی افتخار۔ قومی عزت۔ عہد و پیمان کی پابندی۔ بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا۔ اور ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہوسکیں۔ اور اسی قسم کی وہ تمام خصلتیں جنکے ہونے سے ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک اٹھتی ہی اور جنکے نہونے سے بڑی سے بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے اگر کسی قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا انہیں ہوجاتیں تو بلاشبہہ اُنکی بنیاد تو اُسمیں شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے۔ اگر افلاطون اپنے خیالی کانسٹیٹیوشن سے شاعروں کو جلاوطن کرنیمیں کامیاب ہوجاتا تو وہ ہرگز اخلاق پر احسان نہ کرتا۔ بلکہ اُسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک سرد مہر۔ خودغرض۔ اور مروت سے دور ایسی سوسائٹی قائم ہوجاتی جسکا کوئی کام اور کوئی کوشش بدون موقع اور مصلحت کے محض دل کے ولولہ اور جوش سے نہوتی۔ یہی سبب ہے کہ تمام دنیا شعرا کا ادب اور تعظیم کرتی ہے۔ جنھوں نے اُس خاتم سلیمانی کی بدولت جو قوت متخیلہ نے اُنکے قبضہ میں دی ہے انسان میں ایسی تحریک اور برانگیختگی پیدا کی ہے جو کہ خود نیکی ہے یا نیکی کی طرف لیجانے والی۔"

شاعری سوسائٹی کی تابع ہے

مگر باوجود اِن تمام باتوں کے جو کہ شعر کی تائید میں کہی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ سوسائٹی کے دباؤ یا زمانہ کے اقتضا سے شعر پر ایسی حالت طاری ہوجائے کہ وہ بجائے اسکے کہ قومی اخلاق کی اصلاح کرے اُسکے بگاڑنے اور برباد کرنے کا ایک زبردست آلہ بنجائے قاعدہ ہے کہ جسقدر سوسائٹی کے خیالات۔ اُسکی رائیں۔ اُسکی عادتیں۔ اُسکی رغبتیں۔ اُس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اُسیقدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ تبدیلی بالکل بے معلوم ہوتی ہی۔ کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھکر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ

وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے شفائی صفاہانی کی نسبت جو کہا گیا ہے کہ اُسکے علم کو شاعری نے اور شاعری کو ہجوگوئی نے برباد کیا۔ اسکا منشا وہی سوسائٹی کا دباؤ تھا۔ اور عُبید* زاکانی نے جو علم و فضل سے دست بردار ہو کر ہزل گوئی اختیار کی یہ وہی زمانہ کا اقتضا تھا جسطرح خوشامد اور مذہبیت کا چٹخارا رفتہ رفتہ ایک متدین اور راستباز کی نیت میں خلل ڈالدیتا ہے اسیطرح دربار کی واہ واہ اور صلہ کی چاٹ ایک آزاد خیال اور جذبیلے شاعر کو چپکے ہی چپکے بھٹی۔ جھوٹ اور خوشامد یا ہزل و تمسخر پر اسطرح لاڈالتی ہے کہ وہ اُسکو کمال شاعری سمجھنے لگتا ہے۔

خود مختار بادشاہ جنکا کوئی ہاتھ روکنے والا نہیں ہوتا اور تمام بیت المال جنکا جیب خرچ ہوتا ہے اُنکی بے دریغ بخشش شعرا کی آزادی کے حق میں سم قاتل ہوتی ہے وہ شاعر جسکو قوم کا سرتاج اور سرمایۂ افتخار ہونا چاہیئے تھا۔ ایک بندۂ ہوا و ہوس کے دروازہ پر دریوزہ گروں کی طرح صدا لگاتا اور شَیْئًا لِلّٰہِ کہتا ہوا پہنچتا ہے۔ اول اول مدح و ستایش میں سچ سے بالکل قطع نظر نہیں کیجاتی۔ کیونکہ قومی عروج کی ابتدا میں ممدوح اکثر مدح کے مستحق ہوتے ہیں اور شاعر کی طبیعت سے آزادی کا جوہر دفعۃً زائل نہیں ہو جاتا لیکن جب واقعات نبڑ جاتے ہیں اور مدح سرائی کی گرہ ہمیشہ کیلیے شاعر کے ذمہ لگ جاتی ہے تو اُسکی شاعری کا مدار صرف جھوٹی تہمتیں باندھنے پر رہ جاتا ہے۔ پھر جب آفتاب اقبال کا دورہ جسکی عمر طبیعی شخصی سلطنتوں میں اکثر سو برس سے زیادہ نہیں ہوتی ختم

* عبید زاکانی قزوینی ایک مشہور ہزال شاعر ہے۔ یہ شخص اقسام علوم میں ماہر تھا اِسنے ایک کتاب فن عزیمت میں لکھی تھی اور اُسکو لیکر شاہ ابو اسحاق انجو کے ہاں گذراننے کے لیئے شیراز گیا تھا۔ جب بادشاہ کے دربار میں جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ مسخروں میں مشغول ہے کسی سے ملنے کی فرصت نہیں۔ عبید نے کہا کہ اگر مسخرگی سے تقرب بادشاہی حاصل ہو سکتا ہے تو علم حاصل کرنا فضول ہے۔ اُسی روز سے ہزل گوئی اختیار کی اور اسمیں مشہور ہو گیا۔

ہونے کو ہوتا ہے اور سلاطین و اُمرا میں وہ خوبیاں جنکے سبب سے جمہور انام کے شکر و سپاس مدح و ستایش کے مستحق اور شعرا کی مداحی سے مستغنی ہوں باقی نہیں رہتیں تو اُنکو شاعروں کی بھٹئی کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں سوجھتی جسکو سُن کر اُنکا نفس موٹا ہو۔ لہذا اُنکو شعرا کی زیادہ قدر کرنی پڑتی ہے اس سے جھوٹی شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوتی ہے۔ پھر بہت سے ناشاعر جب شاعروں کو گراں بہا صلے اور خلعت و انعام برابر پاتے دیکھتے ہیں تو اُنکو بتکلف اپنے تئیں شاعر بنانا پڑتا ہے۔ لیکن چونکہ اُن کی طبیعت میں شاعرانہ جدت و اختراع کا مادہ نہیں ہوتا وہ اصلی شاعروں کی نہایت بھونڈی تقلید کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جسطرح بڑھاپے کی تصویر بچپن کی تصویر سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ اسیطرح رفتہ رفتہ شعر کی صورت گویا مسخ ہو جاتی ہے۔ اور شاعری کا ماحصل سوا اسکے کہ اُس سے قرب سلطانی حاصل ہوتا ہے اور کچھ نہیں رہتا +

چوتھی صدی ہجری میں شعر کی نسبت کیا خیال تھا۔

مرزا محمد طاہر نصر آبادی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک روز رات کے وقت **صاحب ابن عباد** طالقانی کی مجلس میں حسب معمول فضلا اور شعرا جمع تھے۔ اثنائے سخن میں شعر کا ذکر چھڑ گیا۔ بعضے شعر کی تعریف کرتے تھے۔ بعضے مذمت۔ جو لوگ مذمت کرتے تھے انھوں نے کہا کہ شعر اکثر مدح یا ذم پر مشتمل ہوتا ہے اور دونو چیزوں کی بنیاد جھوٹ پر ہے اسکے بعد ابو محمد خازن نے جو بہت بڑا صاحب علم و فضل تھا شعر کی تائید میں یہ کہا کہ شعر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہم باوجودیکہ ہر علم و ہنر سے بہرہ مند ہیں۔ اُن میں سے کوئی چیز ہماری کامیابی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی صرف شعر ہی ایسی چیز ہے جسکے ذریعہ سے ہمکو سلاطین و وزرا کے ہاں تقرب کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ شعر میں اکثر جھوٹ اور مبالغہ زیادہ ہوتا ہے

ہاں بے شک ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ تانبا (یعنی جھوٹ) شعر کے طلاء سے مطلا کیا جاتا ہے تو ہم‌رنگِ زرِ خالص ہو جاتا ہے اور شعر کا حسن جھوٹ کی بُرائی پر غالب آ جاتا ہے"۔ اس بات کو سب نے پسند کیا اور بحث ختم ہو گئی +

اس حکایت سے علاوہ اس بات کے کہ صاحب ابن عبّاد کے زمانہ یعنی چوتھی صدی ہجری ہی میں ہماری شاعری محض ایک ذریعہ سلاطین و امرا کے تقرب کا سمجھی جاتی تھی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ شعر کے ذاتیات میں داخل ہو گیا تھا +

مسلمان شاعروں کی کثرت

یوروپ کا ایک مورخ عربی لٹریچر کے ذکر میں لکھتا ہے کہ صرف عرب کی قوم میں اتنے شاعر ہوئے ہیں کہ تمام جہان کی قوموں کے شاعر شمار میں اُنکے برابر نہیں ہو سکتے۔ ظاہراً اُسنے عرب کی قوم کے شعراسے صرف عربی زبان کے شاعر مراد لیئے ہیں۔ اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر عربی کے ساتھ فارسی۔ ترکی۔ پشتو اور اُردو کو بھی جو کہ خاص مسلمانوں کی زبانیں ہیں شامل کر لیا جائے تو مسلمان شاعروں کی تعداد کس حد تک پہنچ جائے گی۔ اور اگر بالفرض عرب کی قوم سے مطلقاً مسلمان شاعر مراد ہوں تو بھی تمام جہان کی قوموں کے شعراسے اُنکی تعداد کا زیادہ ہونا کچھ کم تعجب خیز نہیں +

اس کثرت کا سبب

بظاہر اس کثرت کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مدح و ستایش پر ممدوح کیطرف سے صلہ و انعام ملنے کا رواج جسکی وجہ سے ہر موزوں طبع کو عام اس سے کہ وہ شاعر بننے کے لائق ہو یا نہ ہو شاعری اختیار کرنیکا خیال ہوتا تھا۔ دوسرے ہر درجہ کے شعر پر سامعین کی طرف سے جا و بیجا تحسین و آفریں ہونے کا دستور۔ اور یہ پچھلا سبب پہلے سے بھی زیادہ

شعر گوئی کی تحریک کرنے والا تھا۔ کیونکہ صلہ و انعام کا لالچ صرف انھیں لوگوں کو ہوتا تھا جنھیں اُنکی احتیاج تھی۔ لیکن واہ واہ سننے کی خواہش میں بادشاہ اور امیر اور غریب سب برابر تھے اِن دونو سببوں سے مسلمانوں کی شاعری کو دو طرف سے صدمہ پہنچا۔ جب صلے اور انعام مستحق اور غیر مستحق دونو کو برابر ملنے لگے اور تحسین و آفرین کی بوچھاڑ محل اور بے محل ہر درجہ کے شعر پر ہونے لگی تو جو لوگ فی الحقیقت صلہ و تحسین کے مستحق تھے اُنکے دل بجھ گئے اور شاعری کی اعلیٰ لیاقتیں جو اُن کی طبیعت میں ودیعت تھیں وہ خریداروں کی بے تمیزی کے سبب جیسی چاہیئے ظاہر ہونے پائیں۔ اور جو مستحق نہ تھے اُنکے دل بڑھے اور اُنکو قوم میں اپنی لسانی پھیلانے اور شاعری پر ظلم کرنیکا موقع ملا۔

عرب میں شعرا کی قدر

شعرا کی قدر تمام دنیا میں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے سلطنتوں نے ہمیشہ اُنکی قدر کی ہے اور قوموں نے اُنکے دل بڑھائے ہیں۔ عرب میں شاعر قوم کی آبرو سمجھا جاتا تھا جب کسی قبیلہ میں کوئی شخص شاعری میں ممتاز ہوتا تھا تو اور قبیلوں کے لوگ اُس قبیلہ کو آکر مبارکباد دیتے تھے اور سب ملکر خوشیاں کرتے تھے قبیلہ کی عورتیں اپنے بیاہ کے زیور پہن پہن کر آتی تھیں اور فخریہ اشعار گاتی تھیں کہ ہم میں ایسا شخص پیدا ہوا جو تمام قبیلہ کی ناک رکھنے والا۔ اُنکے نسب اور زبان کی حفاظت کرنے والا۔ اور اُنکے کارہائے نمایاں اخلاف و اعقاب تک پہنچانے والا ہے۔ شعرا کی نازبرداری یہاں تک کیجاتی تھی کہ اگر وہ کوئی محال سوال کر بیٹھتا تو بھی صراحۃً اُسکو رد نہ کیا جاتا تھا۔ ایک بار اعشیٰ بہت سا مال و اسباب لیئے بلادِ بنی عامر میں ہو کر گذرا۔ اور رہزنوں کے خوف سے اثنائے راہ میں علقمہ بن علاثہ کے ہاں ٹھہر گیا

اور پناہ چاہی۔ اُسنے بسر و چشم قبول کیا اعشٰی نے کہا تو نے مجھے جن و انس سے پناہ دی؟ علقمہ نے کہا ہاں۔ اعشٰی نے کہا اور موت سے؟ وہ بولا یہ تو امکان سے خارج ہے۔ اعشٰی وہاں سے ناراض ہوکر عامر بن الطفیل کے ہاں چلا گیا اُسنے دونو باتوں کی ہامی بھرلی۔ اعشٰی نے کہا موت سے کیونکر پناہ دی؟ کہا میری پناہ میں تجھے موت آجائے گی تو تیرا خونبہا تیرے وارثوں کو بھیجدونگا اعشٰی بہت خوش ہوا۔ اور اُسکی مدح میں قصیدہ کہا اور علقمہ کی ہجو لکھی ✦

قومی سلطنتوں میں شعرا کی قدر زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت شخصی حکومت کے

عرب کے سوا اور ملکوں میں بھی شعرا کی قدردانی کا ایسا ہی حال رہا ہے۔ قومی سلطنتوں میں جہاں بادشاہ حاکم علی الاطلاق نہیں ہوتا۔ ایسی قدردانیوں سے شاعری بے انتہا ترقی پاتی ہے۔ شاعر جب تک تمام قوم میں مقبول نہیں ٹھیر جاتا سلطنت سے اُسکی کچھ تقویت اور امداد نہیں ہوتی اور قوم میں وہی شاعر مقبول ہوسکتا ہے جو شاعری کے فرائض بغیر اُمید و بیم کے نہایت آزادی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ نہ اُسکو سلطنت کی دستگیری کی کچھ پروا ہے اور نہ بادشاہ کے مواخذہ کا کچھ خوف ہے۔ لیکن خود مختار سلطنتوں میں شاعر کو ہر حال میں دربار کی رضاجوئی کا لحاظ رکھنا اور آزادی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یہاں تک کہ اُسکے سچے جوش اور ولولے جنکے بغیر شعر کو ایک قالب بے روح سمجھنا چاہیئے۔ سب رفتہ رفتہ خاک میں ملجاتے ہیں۔ نہ وہ اپنے دل کی اُمنگ سے کسی کی مدح کرسکتا ہے۔ نہ سچے جوش سے کسی کی ہجو لکھ سکتا ہے مروان بن ابی حفصہ جو کہ خلیفہ مہدی کے زمانہ میں مشہور شاعر تھا اُسنے معن بن زائدہ کے مرثیہ میں جسکی شجاعت اور سخاوت ضرب المثل تھی یہ شعر لکھدیا تھا۔

وَقُلْنَا اَیْنَ نَرْحَلُ بَعْدَ مَعْنٍ   وَقَدْ ذَهَبَ النَّوَالُ فَلَا نَوَالَا

مہدی نے اُسکو دربار میں بُلا کر یہ شعر اُس سے پڑھوایا اور نہایت بے عزتی کے ساتھ دربار سے نکلوا دیا۔ لکھا ہے کہ جعفر برمکی کے سوا پھر کسی امیر یا خلیفہ نے اُسکو صلہ نہیں دیا۔ جہاں وہ قصیدہ کہکر لیجاتا وہاں سے یہ جواب ملتا۔ فیاضی تو معن کے ساتھ گئی جعفر برمکی جسکا ایک زمانہ اور خاصکر شعرا ممنون احسان تھے۔ اُسکے مرثیے لکھنے پر بہت سے شاعر ہاروں کے حکم سے قتل کیئے گئے رقاشی نے اکثر شعرا کے قتل کے بعد خفیہ ایک مرثیہ لکھا تھا اُسکے اخیر میں کہتا ہے

أَمَا وَاللهِ لَوْلَا خَوْفُ وَاشٍ   وَعَيْنٌ لِلْخَلِيفَةِ لَا تَنَامُ
لَطُفْنَا حَوْلَ قَبْرِكَ وَاسْتَلَمْنَا   كَمَا لِلنَّاسِ بِالْحَجَرِ اسْتِلَامُ

ترجمہ۔ واللہ اگر غماز کا اور خلیفہ کی چشم بیدار کا خوف نہ ہوتا تو ہم تیری قبر کے گرد طواف کرتے۔ اور بوسہ دیتے جیسے کہ لوگ حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں +

شخصی حکومت میں شاعری کی آزادی سے اکثر نقصان پہنچتا ہے

ایسے زمانہ میں اگر کوئی مستغنی مزاج اور آزاد طبع شاعر دربار کی رضا جوئی کا خیال نہیں کرتا تو اُسکو ویسے ہی ثمرے بھگتنے پڑتے ہیں جیسے کہ فردوسی کو بھگتنے پڑے۔ فردوسی ایک آزاد منش اور قانع آدمی تھا۔ باوجودیکہ حسن میمندی وزیر سلطان محمود کو اُسکے فائدہ یا ضرر پہنچانے میں بہت بڑا دخل تھا۔ مگر وہ اُسکو بلکہ خود سلطان کو کچھ خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جب حسن میمندی کی مخالفت کا حال اُسکو معلوم ہوا۔ تو اُسنے یہ دو شعر لکھے تھے۔

من بندہ کز مبادیِ فطرت نبودہ ام   مائل بہ مال ہرگز۔ طامع بہ جاہ نیز
سوئے درِ وزیر چرا ملتفت شوم   چوں فارغم ز بارگہِ پادشاہ نیز

اُسکی آزادی اور راست گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کے مزاج کو اُس سے متغیر کر دیا گیا۔ کبھی

اُسکے کلام سے اُسکی دہریّت پر اور کبھی اعتزال و تشیع پر استدلال کیا گیا۔ اور ساٹھ ہزار بیت کی مثنوی جسکا صلہ فی بیت ایک مثقال طلا قرار پایا تھا اُسکے جلدو میں سوائے محرومی و ناکامی کے اُسکو کچھ نہ ملا۔ مگر فی الحقیقۃ جیسی کہ اُسنے اپنے کلام کی داد پائی ہے۔ شاید ہی کسی شاعر کو ایسی داد ملی ہو۔ اُسکے شاہنامہ نے تمام دنیا کے دلوں کو سخر کرلیا۔ اور بڑے بڑے مسلم الثبوت اُستاد اُسکی فصاحت کا لوہا مان گئے اور اِسکا سبب اور کچھ نہ تھا سوا اسکے کہ سوسائٹی یا دربار کا دباؤ اُسکی آزاد طبیعت پر غالب نہیں آیا۔

صدر اسلام کی شاعری کا حال

صدر اسلام کی شاعری میں جب تک کہ غلامانہ تملق اور خوشامد نے اُسمیں راہ نہیں پائی تمام سچے جوش اور ولولے موجود تھے۔ جو لوگ ہجو کے مستحق ہوتے تھے اُنکی ہجو اور جو ذم کے مستحق ہوتے تھے اُن کی مذمت کیجاتی تھی۔ جب کوئی منصف اور نیک خلیفہ یا وزیر مرجاتا تھا اُسکے دردناک مرثیئے لکھے جاتے تھے۔ اور ظالموں کی مذمت اُنکی زندگی میں کیجاتی تھی۔ خلفاو سلاطین کی مہمات اور فتوحات میں جو بڑے بڑے واقعات پیش آتے تھے۔ اُنکا قصائد میں ذکر کیا جاتا تھا۔ احباب کی صحبتیں جو انقلاب روزگار سے برہم ہوجاتی تھیں اُنپر دردناک اشعار لکھے جاتے تھے۔ پارسا بیویاں شوہروں کے اور شوہر بیویوں کے فراق میں درد انگیز شعر انشا کرتے تھے۔ چراگاہوں۔ چشموں۔ اور وادیوں کی گذشتہ صحبتوں اور جمگھٹوں کی ہو بہو تصویر کھینچتے تھے۔ اپنی اونٹنیوں کی جفاکشی اور تیز رفتاری۔ گھوڑوں کی رفاقت اور وفاداری کا بیان کرتے تھے۔ بڑھاپے کی مصیبتیں۔ جوانی کے عیش۔ اور بچپن کی بے فکریاں ذکر کرتے تھے۔ اپنے بچوں کی جدائی اور اُنکے دیکھنے کی آرزو حالتِ غربت میں لکھتے تھے۔ اہل وطن کی۔ دوستوں کی

اور ہمعصروں کی سچی تعریفیں اور اُنکے مرنے پر مرثیئے کہتے تھے۔ اپنی سرگذشت۔ واقعی تکلیفیں اور خوشیاں بیان کرتے تھے۔ اپنے خاندان اور قبیلہ کی شجاعت اور سخاوت وغیرہ پر فخر کرتے تھے۔ سفر کی محنتیں اور مشقتیں جو خود اُنپر گذرتی تھیں بیان کرتے تھے عالم سفر کے مقامات اور مواضع۔ شہر اور قریئے۔ ندیاں اور چشمے سب نام بنام۔ اور جو بُری یا بھلی کیفیتیں وہاں پیش آتی تھیں اُنکو موثر طریقہ میں ادا کرتے تھے۔ بیوی اور بچوں یا دوستوں سے وداع ہونے کی حالت دکھلاتے تھے۔ اسیطرح تمام نیچرل جذبات جو ایک جوشیلے شاعر کے دل میں پیدا ہوسکتے ہیں سب اُنکے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ دربار کے تملق اور خوشامد نے وہ سرچیوں سوتیں سب بند کردیں اور شعرا کے لیئے عام طور پر صرف دو میدان باقی رہ گئے جنمیں وہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھا سکتے تھے۔ ایک مدحیہ مضامین جنسے ممدوحین کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ دوسرے عشقیہ مضامین جنسے اُنکے نفسانی جذبات کو اشتعال ہوتی تھی۔ پھر جب ایک مدت کے بعد دونو مضمونوں میں چچوڑی ہوئی ہڈی کیطرح کچھ مزا باقی نہ رہا اور سلاطین وامرا کی مجلسیں گرم کرنے کے لیئے اور ایندھن کی ضرورت ہوئی تو سطائبات مضحکات واہاجی وہزلیات کا دفتر کھلا۔ بہتیرے شاعروں نے سب چھوڑ چھاڑ کر یہی کوچہ اختیار کرلیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ رنگ تمام سوسائٹی پر چڑھ گیا۔ اگرچہ ابتدا سے اخیر تک ہر طبقہ اور ہر عہد کے شعرا میں کم وبیش ایسے واجب التعظیم لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کی شاعری پر مسلمان فخر کرسکتے ہیں۔ لیکن شارع عام پر زیادہ تر وہی لوگ نظر آتے ہیں جو پچھلوں کے لیئے شاعری کا میدان نہایت تنگ کرگئے۔ یا اُنکے لیئے بہت بُرے نمونے چھوڑ گئے ہیں*

متوسط اور اخیر زمانہ میں اسلامی شاعری کا کیا حال ہوگیا

پچھلوں نے جب آنکھیں کھولکر بزرگوں کے ترکہ میں مدحیہ قصائد اور عشقیہ غزلوں اور مثنویوں اور اہاجی وہزلیات کے سوا اور سامان بہت کم دیکھا تو انھوں نے شاعری کو انہیں چند مضمونوں میں منحصر سمجھا۔ لیکن ان مضمونوں میں بھی جبکہ چڑیاں کھیت چگ گئیں اب کیا دھرا تھا۔ تعریف اگر سچی ہو اور عشق اصلی تو شاعر کے لیئے مٹیریل کی کچھ کمی نہیں جسطرح کائنات میں دو چیزیں یکساں نہیں پائی جاتیں اسیطرح ایک انسان کے محاسن دوسرے کے محاسن سے اور ایک کے دل کی واردات دوسرے کی واردات سے نہیں ملتی۔ لیکن جب تعریف سراسر جھوٹی اور عشق محض تقلیدی ہو تو شعراکو ہمیشہ وہی باتیں جو اگلے لکھ گئے ہیں دوہرانی پڑتی ہیں ٭

شاعری میں تقلید

اب جو پچھلوں نے اگلوں کی تقلید کرنی شروع کی تو نہ صرف مضامین میں بلکہ خیالات میں۔ الفاظ میں۔ تراکیب میں۔ اسالیب میں۔ تشبیہات میں۔ استعارات میں۔ بحر میں۔ قافیہ میں۔ رویف میں۔ غرضکہ ہر ایک بات اور ہر ایک چیز میں اُنکے قدم بہ قدم چلنا اختیار کیا پھر جب ایک ہی لکیر پیٹتے پیٹتے اجیرن ہوگئی تو نہایت بھونڈے اختراع ہونے لگے۔ جن پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ خشکہ باگندہ بروزہ اگرچہ گندہ لیکن ایجاد بندہ ٭

بری شاعری سے سوسائٹی کو کیا کیا نقصان پہنچتے ہیں

اگرچہ شاعری کو ابتدائً سوسائٹی کا مذاق فاسد بگاڑتا ہے۔ مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اُسکی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے جب جھوٹی شاعری کا رواج تمام قوم میں ہوجاتا ہے تو جھوٹ اور مبالغہ سے سب کے کان مانوس ہوجاتے ہیں۔ جس شعر میں زیادہ جھوٹ یا نہایت مبالغہ ہوتا ہے اُسکی شاعر کو زیادہ داد ملتی ہے۔ وہ مبالغہ میں اور غلو کرتا ہے تاکہ اور زیادہ داد ملے۔ اُدھر اُسکی طبیعت راستی سے دور ہوتی

جاتی ہے اور اِدھر جھوٹی اور بے سر و پا باتیں وزن و قافیہ کے دلکش پیرایہ میں سُنتے سُنتے سوسائٹی کے مذاق میں زہر گُھلتا جاتا ہے۔ حقائق و واقعات سے لوگوں کو روز بروز مناسبت کم ہوتی جاتی ہے۔ عجیب و غریب باتوں۔ سوپر نیچرل کہانیوں اور محال خیالات سے دلوں کو انشراح ہونے لگتا ہے۔ تاریخ کے سیدھے سادے وقائع سُننے سے جی گھبرانے لگتے ہیں۔ جھوٹے قصے اور افسانے حقائق واقعیہ سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ ریاضی اور سائنس سے طبیعتیں بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ اور چپکے ہی چپکے مگر نہایت استحکام کے ساتھ اخلاقِ ذمیمہ سوسائٹی میں جڑ پکڑتے جاتے ہیں۔ اور جب جھوٹ کے ساتھ ہزل و سُخریت بھی شاعری کے قوام میں داخل ہو جاتی ہے تو قومی اخلاق کو بالکل گُھن لگ جاتا ہے۔

بُری شاعری سے لٹریچر اور زبان کو کیا صدمہ پہنچتا ہے

سب سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے یا اُسکے محدود ہو جانے سے ملک کو پہنچتا ہے وہ اُسکے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی ہے۔ جب جھوٹ اور مبالغہ عام شعرا کا شعار ہو جاتا ہے تو اُسکا اثر مصنفوں کی تحریر اور فصحا کی تقریر اور خواص اہلِ ملک کے روزمرہ اور بول چال تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ ہر زبان کا نمایاں اور برگزیدہ حصہ وہی الفاظ و محاورات اور ترکیبیں سمجھی جاتی ہیں۔ جو شعرا کے استعمال میں آ جاتے ہیں۔ پس جو شخص ملکی زبان کی تحریر یا تقریر یا روزمرہ میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا ہے اُسکو بالضرور شعرا کی زبان کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ اور اسطرح مبالغہ لٹریچر اور زبان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ شعرا کی ہزل گوئی سے زبان میں کثرت سے نامہذب اور مخش الفاظ داخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ لغات میں وہی الفاظ مستند اور ٹکسالی سمجھے جاتے ہیں جن کی توثیق و تصدیق شعرا کے

کلام سے کی گئی ہو۔ پس جو شخص ملکی زبان کی ڈکشنری لکھنے بیٹھتا ہی اُسکو سب سے پہلے شعرا کے دیوان ٹٹولنے پڑتے ہیں۔ پھر جب شاعری چند مضامین میں محدود ہو جاتی ہے۔ اور اُسکا مدار محض قوم کی تقلید پر آرہتا ہے تو زبان بجائے اسکے کہ اُسکا دائرہ زیادہ وسیع ہو وہ اپنی قدیم وسعت بھی کھو بیٹھتی ہے۔ زبان کا وہ قلیل حصہ جسکے ذریعہ سے شاعر اپنے چند معمولی مضامین ادا کرتا ہے۔ زیادہ تر وہی مانوس اور فصیح گنا جاتا ہے۔ اور باقی الفاظ و محاورات غریب او وحشی خیال کیئے جاتے ہیں۔ پس سوا اسکے کہ کچھ اُن میں سے اہل زبان کی بول چال میں کام آئیں باقی لُغت کی کتابوں میں بند پڑے رہیں۔ اور کچھ ایک مدت کے بعد متروک الاستعمال ہو جائیں اور کسی مصرف میں نہیں آتے۔ نہ مصنفوں کو تحریر میں اور نہ فصحا کو تقریر میں اُنسے کچھ مدد نہیں پہنچتی قدما کی تقلید کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں میں بضرورت شعر اُنھوں نے تصرف کیا ہے اُنکے سوا کسی لفظ میں کوئی تصرف نہیں کرسکتا۔ جو محاورے جس پہلو پر وہ برت گئے ہیں وہ دوسرے پہلو پر ہرگز نہیں برتے جاسکتے۔ جو تشبیہیں اُنکے کلام میں پائی گئی ہیں اُنسے سرمو تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ الغرض کسی ملک کی شاعری کو اُسکے لٹریچر کے ساتھ وہی نسبت ہی جو قلب کو جسد کے ساتھ کہ اِذَا صَلَحَ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ +

شاعری کی اصلاح

جب فن شعر استحالت کو پُہنچ جاتا ہے تو اُسکی اصلاح قریب ناممکن کے ہو جاتی ہے۔ اول تو شعرا کو قدیم اُلف و عادت کے سبب اِس بات کا شعور ہی نہیں ہوتا کہ جس راہ پر وہ جارہے ہیں اسکے سوا کوئی اور بھی رستہ ہی۔ اور اگر بالفرض کسی نے قوم کا شارع عام چھوڑ کر دوسری راہ اختیار بھی کی تو اُسکو دو نہایت سخت مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اول تو طریق غیر مسلوک میں قدم رکھنا

اور اُسکے تمام مرحلوں سے عبور کرکے منزل مقصود تک پہنچنا ہی نہایت کٹھن اور دشوار کام ہے دوسری مشکل اس سے بھی زیادہ سخت یہ ہے کہ موجودہ سوسائٹی کا مذاق چونکہ اس نئی روش سے بالکل بیگانہ ہوتا ہے اسلئے نہ کوئی اُسکی مشکلات کا اندازہ کرسکتا ہے اور نہ کہیں اُسکی محنت کی داد مل سکتی ہے۔ بس کوئی شخص جبتک کہ زمانہ کی قدردانی سے بالکل دست بردار ہوکر اُس دہقان کی مانند جو اخیر عمر میں کھرنی کی پود اپنی زمین میں لگائے محض ایک اُمیدِ موہوم پر آئندہ نسلوں کی ضیافت طبع کا منصوبہ نہ باندھے اِس کوچہ میں ہرگز قدم نہیں رکھ سکتا +

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ نئی روش پر چلنے والا شاعر کوئی مضمون زمانہ کی ضرورت اور مقتضائے حال کے موافق شعر کے لباس میں جلوہ گر کرکے ملک کے جدت پسند لوگوں میں کچھ شہرت یا قبولیت حاصل کرلے۔ اور ایک خاص حیثیت سے اُسکے کلام کی داد توقع سے زیادہ اُسکو ملجائے۔ مگر شاعری کی حیثیت سے نہ تو فی الواقع وہ اُسکے کلام کی داد ہوتی ہے اور نہ وہ اُسکو داد سمجھتا ہے۔ بلکہ ایسی داد سُنکر چپکے ہی چپکے اپنے دل میں یہ شعر پڑھتا ہے ؎

بخوں آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسیں تو اول زیب اسپ و زینتِ برگستواں بینی

شعرائے ہمعصر کچھ تو قدیم شاعری کے تعصب سے اور زیادہ تر اجنبیت اور بیگانگیِ مذاق کے سبب اُسکی روش کو اس جہت سے کہ وہ شارعِ عام سے الگ ہے تسلیم نہیں کرتے۔ اور بعضے اپنے نزدیک اُسکی ہجوِ ملیح اسطرح فرماتے ہیں کہ فلاں شخص نے شاعری نہیں کی بلکہ مفید اور اخلاقی مضامین لکھکر اپنے لئے زادِ آخرت جمع کیا ہے۔ لیکن اگر وہ فی الواقع موجودہ نسل کی قدرشناسی سے قطع نظر کرچکا ہے تو اُسکو ایسی باتوں کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ اگر

قوم کی زمین میں کچھ آل باقی ہے تو تخم اکارت نہ جائے گا۔

گولڈسمتھ کی نظم

گولڈسمتھ نے جب اول ہی اول اپنے ملک کے قدیم شاعروں کا سلک جسکی بنیاد جھوٹ اور مبالغہ اور ہوا و ہوس کے مضامین پر تھی چھوڑکر سچی نیچرل شاعری اختیار کی تو اُسکو بہی مشکلات پیش آئی تھیں۔ چنانچہ اُسنے اسحالت کو ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ اُسمیں اپنی نئی روش کی نظم کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے "اے میری پیاری نظم تو اُن موقعوں سے پہلی بھاگنے والی نظم ہے۔ جہاں نفسانی خواہشوں کی طغیانی ہوتی ہے۔ تو اِس بے قدری کے زمانہ میں بجائے اسکے کہ دلوں کو اپنی طرف مائل اور پاک شہرت حاصل کرے۔ ہر جگہ ملامت کیجاتی ہے۔ تیری بدولت عام جلسوں میں مجھکو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جب تنہا ہوتا ہوں تو تجھپر فخر کرتا ہوں۔ تو کمال کے طالبوں کی رہنما ہے۔ اور نیکی کی دایہ۔ پس خدا ہی تیرا نگہبان ہوگا۔ دنیا کے کسی حصہ میں خواہ وہ **ٹورنو**[8] کی چوٹیاں ہوں یا **پیمبارکا**[†] کی ٹیلیٹی اور خواہ وہ خط استوا کا نہایت گرم خطہ ہو یا قطب کا منجمد کرنے والا جاڑا۔ جہاں کہیں تجھپر نکتہ چینی ہو تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور بادِ مخالف کے جھکڑوں پر غالب آئیو۔ اور اپنے دردناک نالوں سے سچ کی مدد کیجیو۔ جسکو لوگ حقیر جانتے ہیں۔ تو گمراہوں کو دولت کی حقارت کرنی سکھا۔ اور اُنکو اسبات کا یقین دلا کہ جو لوگ اپنے قدرتی ذریعوں پر بھروسا کرتے ہیں اگرچہ وہ مفلس ہوں لیکن خوشحال ہو سکتے ہیں۔ مگر جو ترقی تجارت سے ملک میں ہوتی ہی

[8] ٹورنو یورپ میں روس کے شمال مغرب میں ایک پہاڑ ہے ۱۲

[†] پیمبارکا جنوبی امریکا میں شہر کنیٹو دار الخلافہ ملک ایکویڈر کے پاس ایک پہاڑ ہے ۱۲

وہ بظاہر ایک زمانہ تک دھوم دھام دکھلاتی ہے۔ مگر بہت جلد آوے کی طرح بیٹھ جاتی ہے جیسے کہ سمندر کی موجیں آخر اُس بند کو برباد کر دیتی ہیں جو کمال محنت و مشقت سے باندھا گیا ہو۔ جو ملک اپنے قدرتی ذریعوں پر بھروسا کرتے ہیں وہ زمانہ کی سختیوں اور بربادیوں کا اسطرح مقابلہ کرتے ہیں جیسے چٹانیں سمندر کی موجوں اور طغیانیوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اور جہاں تھیں وہیں بدستور جمی رہتی ہیں +

شاعری کی اصلاح کیونکر ہوسکتی ہے

نئی شاعری کی بنیاد ڈالنے کے لیئے جسطرح یہ ضرور ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُسکے عمدہ نمونے پبلک میں شائع کیئے جائیں اسیطرح یہ بھی ضرور ہے کہ شعر کی حقیقت اور شاعر بننے کے لیئے جو شرطیں درکار ہیں اُنکو کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے +

اردو میں شاعر بننے کے لیئے فی زمانہ کس قدر کم ضرورت سمجھی جاتی ہے

ہمارے مُلک میں فی زماننا شاعری کے لیئے صرف ایک شرط یعنی موزوں طبع ہونا درکار ہے۔ جو شخص چند سیدھی سادی متعارف بحروں میں کلام موزوں کرسکتا ہی گویا اُسکے شاعر بننے کے لیئے کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہتی۔ معمولی مضامین۔ معمولی تشبیہوں اور استعاروں کا کسیقدر ذخیرہ اُسکے لیئے موجود ہی ہے۔ جسکو متعدد صدیوں سے لوگ دوہراتے چلے آتے ہیں اور اتفاق سے وہ موزوں طبع بھی ہے۔ اب اُسکے لیئے اور کیا چاہیئے۔ مگر فی الحقیقۃ شعر کا پایہ اِس سے بمراتب بلند تر ہے +

شعر کے لیئے وزن ضروری ہے یا نہیں

شعر کے لیئے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیئے بول۔ جسطرح راگ فی حد ذاتہ الفاظ کا محتاج نہیں اسیطرح نفس شعر وزن کا محتاج نہیں۔ اسموقع پر جیسے انگریزی میں دو لفظ مستعمل ہیں ایک پوئٹری اور دوسرا وَرس اسیطرح ہمارے ہاں بھی دو لفظ

استعمال میں آتے ہیں ایک **شعر** اور دوسرا **نظم** اور جسطرح اُنکے ہاں وزن کی شرط **پوئٹری** کے لیئے نہیں۔ بلکہ **ورس** کے لیئے ہی اسیطرح ہمارے ہاں بھی یہ شرط **شعر** میں نہیں بلکہ **نظم** میں معتبر ہونی چاہیئے ✦

اہل عرب شعر کسکو کہتے تھے

قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے یہی معنی سمجھتے تھے۔ جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھکر کوئی مؤثر اور دلکش تقریر کرتا تھا۔ اُسی کو شاعر جانتے تھے جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کے برجستہ اور دلاویز فقرے اور مثلیں پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب قریش نے قرآن مجید کی نرالی اور عجیب عبارت سُنی تو جنھوں نے اُسکو کلام الٰہی نہ مانا وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر کہنے لگے۔ حالانکہ قرآن شریف میں وزن کا مطلق التزام نہ تھا۔ محقق طوسی اساس الاقتباس میں لکھتے ہیں کہ عبری اور سُریانی اور قدیم فارسی میں شعر کے لیئے وزن حقیقی ضرور نہ تھا۔ سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے ✦

وزن کی شعر میں کسقدر ضرورت ہے

البتہ اسمیں شک نہیں کہ وزن سے شعر کی خوبی اور اُسکی تاثیر دو بالا ہو جاتی ہے یوروپ کا ایک محقق لکھتا ہے کہ اگرچہ وزن پر شعر کا انحصار نہیں ہی اور ابتدا میں وہ مدتوں اس زیور سے معطل رہا ہے مگر وزن سے بلا شُبہہ اسکا اثر زیادہ تیز اور اسکا نشتر زیادہ کارگر ہو جاتا ہے ✦

قافیہ شعر کے لئے ضروری ہے یا نہیں

قافیہ بھی ہمارے ہاں شعر کے لیئے ایسا ہی ضروری سمجھا گیا ہے جیسے کہ **وزن** مگر درحقیقت وہ بھی **نظم** ہی کے لیئے ضروری ہے نہ شعر کے لیئے۔ اساس میں

لکھا ہے کہ یونانیوں کے ہاں قافیہ بھی (مثل وزن کے) ضروری نہ تھا اور جشوئی نام ایک پارسی گو شاعر کا ذکر کیا ہے۔ جسنے ایک کتاب میں اشعار غیر مقفےٰ جمع کیئے ہیں۔ یوروپ میں بھی آج کل بلینک ورس یعنی غیر مقفےٰ نظم کا بہ نسبت مقفےٰ کے زیادہ رواج ہے۔ اگرچہ قافیہ بھی وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے جس سے کہ اُسکا سُننا کانوں کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور اُسکے پڑھنے سے زبان زیادہ لذت پاتی ہے۔ مگر قافیہ اور خاصکر ایسا جیسا کہ شعرائے عجم نے اُسکو نہایت سخت قیدوں سے جکڑ بند کر دیا ہے اور پھر اُسپر ردیف اضافہ فرمائی ہے۔ شاعر کو بلا شُبہہ اُسکے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے جسطرح صنائع لفظی کی پابندی معنی کا خون کر دیتی ہے اسیطرح بلکہ اِس سے بہت زیادہ قافیہ کی قید ادائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شاعر کو بجائے اسکے کہ اول اپنے ذہن میں ایک خیال کو ترتیب دیکر اُسکے لیئے الفاظ مہیا کرے سب سے پہلے قافیہ تجویز کرنا پڑتا ہے اور پھر اُسکے مناسب کوئی خیال ترتیب دیکر اُسکے ادا کرنے کے لیئے ایسے الفاظ مہیا کیئے جاتے ہیں جنکا سب سے اخیر جزو قافیہ مجوزہ قرار پا سکے۔ کیونکہ اگر ایسا نکرے تو ممکن ہے کہ خیال کی ترتیب کے بعد کوئی مناسب قافیہ بہم نہ پہنچے اور اُس خیال سے دست بردار ہونا پڑے۔ پس درحقیقت شاعر خود کوئی خیال نہیں باندھتا بلکہ قافیہ جس خیال کے باندھنے کی اُسے اجازت دیتا ہے اُسکو باندھ دیتا ہے اکثر غزل اور قصیدہ میں اول اخیر مصرع جسمیں قافیہ ہوتا ہے اندھا دُھند کسی نہ کسی مضمون کا گھڑ لیا جاتا ہے اور پھر اُسکے مناسب پہلا مصرع اُسپر لگایا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ شعر کو زیادہ خوشنما بنانے کے لیئے اُسمیں ایک ایسی قید لگانی جس سے شعر کی اصلیت باقی نہ رہے بعینہ ایسی بات ہے

کہ لباس کو زیادہ خوشنما بنانے کے لیئے اُسکی لمبی قطع رکھی جائے۔ جس سے لباس کی علت غائی یعنی آسایش اور پردہ دونو فوت ہو جائیں۔ الغرض وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دارو مدار ہے اور جنکے سوا اُسمیں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جسکے سبب سے شعر پر شعر کا اطلاق کیا جاسکے یہ دونو شعر کی ماہیت سے خارج ہیں۔ اِسی لیئے زمانۂ حال کے محقق شعر کا مقابل جیساکہ عموماً خیال کیا جاتا ہے نثر کو نہیں ٹھیراتے بلکہ علم و حکمت کو ٹھیراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جسطرح حکمت کا کام براہِ راست یہ ہی کہ ہدایت کرے تحقیقات میں مدد پہنچائے اور حقائق کو روشن کرے عام اِس سے کہ کوئی اُس سے محظوظ یا متعجب یا متاثر ہو یا نہو۔ اسیطرح شعر کا کام براہِ راست یہ ہی کہ فی الفور لذت یا تعجب یا اثر پیدا کردے عام اِس سے کہ حکمت کا کوئی مقصد اُس سے حاصل ہو یا نہو اور عام اِس سے کہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ +

شعر کی تعریف

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر کوئی تعریف ایسی نہیں جو اُسکے تمام افراد کو جامع اور مانع ہو دخول غیر سے۔ البتہ لارڈ مکالی نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے گو اُسکو شعر کی تعریف نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن جو کچھ شعر سے آجکل مراد لیجاتی ہے اُسکے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہی وہ کہتے ہیں کہ " شاعری جیساکہ دو ہزار[8] برس پہلے کہا گیا تھا۔ ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہی۔ مگر مصور۔ بُت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسیقدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعر کی کُل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے۔ اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر ہومر اور ڈینٹی جیسے صناع بھی اُنکو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اُتار سکتے

8 یہ ارسطو کے قول کی طرف اشارہ ہے ۱۲

جیسا موقلم اور چھینی کے کام دیکھکر ہمارے خیال میں اُترتا ہے۔ لیکن شاعری کا میدان وسیع اسقدر ہے کہ بت تراشی۔ مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اُسکی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اُتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اُسکے لیئے الفاظ مہیا کر دیئے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجودیکہ اشیاے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا کام دے سکتی ہے اُسکو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔ نہ وہاں مصوری کی رسائی ہے نہ بت تراشی کی اور نہ ناٹک کی۔ مصوری اور ناٹک وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اسقدر ظاہر کر سکتے ہیں جسقدر کہ چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے اُن کیفیات کے ہوتے ہیں جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں۔ مگر نفس انسانی کی باریک گہری اور بوقلمون کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیاے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات۔ دولت کے انقلابات۔ سیرت انسانی معاشرت نوع انسانی۔ تمام چیزیں جو فی الحقیقۃ موجود ہیں۔ اور تمام وہ چیزیں جنکا تصور مختلف اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جسکی قلمرو اُسیقدر وسیع ہے۔ جسقدر خیال کی قلمرو۔"

ایک اور محقق نے شعر کی تعریف اسطرح کی ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اسلیئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اُسکو سُنکر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے

خواہ نظم میں ہو اور خواہ نثر میں " مذکورہ بالا تقریروں کا مطلب زیادہ دلنشین کرنے کے لیئے ہم اِس مقام پر چند مثالیں ذکر کرنی مناسب سمجھتے ہیں +

(۱) فردوسی کہتا ہے۔

بمالید چاچی کماں را بدست　　　به چرم گوزن اندر آورد شست

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست　　　خروش از خم چرخ چاچی بخاست

اِن دونو شعروں میں رستم کی وہ حالت دکھائی ہے جبکہ وہ اشکبوس کشانی سے لڑنے کے لیئے پیادہ میدان کارزار میں گیا ہے اور اُسپر وار کرنے کے لیئے کمان میں تیر جوڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان شعروں کے مضمون کو اگر ایک غیر شاعر معمولی طور پر بیان کرتا تو صرف اسقدر کہنا کافی تھا کہ رستم نے کمان کے چلہ میں تیر جوڑا لیکن اس بیان میں اُس حالت کی جبکہ وہ تیر چلانے کے لیئے کمان تانے کھڑا تھا نقل مطلق نہیں پائی جاتی۔ البتہ جو اسلوب فردوسی نے اُسکے بیان میں اختیار کیا ہے اُسمیں جہاں تک کہ الفاظ مساعدت کر سکتے تھے اُس حالت کی کافی طور پر نقل اُتاری گئی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسی حالت ہی جو آنکھ سے محسوس ہو سکتی ہے اِس لیئے اُسکو ایک بت تراش یا ایک مصور فردوسی کی نسبت زیادہ واضح اور زیادہ نمودار صورت میں ظاہر کر سکتا ہے +

(۲) سعدی شیرازی +

چناں قحط سالے شد اندر دمشق　　　که یاراں فراموش کردند عشق

اِس شعر میں دمشق کے کسی قحط کا وہ عالم بیان کیا ہے جو وہاں کے باشندوں پر طاری تھا

اس مضمون کو ایک غیر شاعر اس سے زیادہ بیان نہیں کر سکتا کہ خلقت بھوکی پیاسی مر رہی تھی یا اناج اور پانی نایاب تھا۔ یا اور اسی قسم کی معمولی باتیں جو قحط کے زمانہ میں عموماً پیش آتی ہیں لیکن منتہائے سختی قحط کی تصویر جن لفظوں میں کہ سعدی نے کھینچی ہے ایسے معمولی بیانات سے ہرگز نہیں کھچ سکتی۔ اور چونکہ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو محسوس نہیں ہو سکتی۔ اسلیئے شاعر کے سوا مصور اور بت تراش دونو اُسکی نقل اُتارنے سے عاجز ہیں۔ البتہ ایکٹر ایسا تماشا دکھلانے سے کسیقدر عہدہ برآ ہو سکتا ہے بشرطیکہ شاعر نے اُسکے لیئے کافی الفاظ مہیا کر دیئے ہوں +

(۳) ابن دراج اندلسی ایک قصیدہ میں اپنے شیر خوار بچہ کی وہ حالت جبکہ وہ خود گھر والوں سے رخصت ہو کر کہیں دور جانے والا ہے اور بچہ اُسکے مُنہ کو تک رہا ہے۔ بیان کرتا ہے +

عَيِيٌّ بِمَرْجُوعِ الْخِطَابِ وَلَحْظُهُ ۔۔۔ بِمَوْقِعِ اَهْوَاءِ النُّفُوسِ خَبِيرُ

یعنی وہ بات کا جواب دینے سے تو عاجز ہے مگر اُسکی آنکھ اُن اداؤں سے واقف ہے۔ جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اِس شعر میں اُستاد نے ایک محض وجدانی کیفیت کی تصویر کھینچی ہے جسکی محاکات زمانۂ حال کے مصور۔ بت تراش اور ایکٹر بھی بلاشُبہہ کسیقدر کر سکتے ہیں لیکن نہ ایسی جیسی کہ شاعر نے کی ہے۔ نیز شاعر کے سوا کسی کو یہ اسلوب بیان ہرگز نہیں سوجھ سکتا کیونکہ جس مطلب کو اُسنے اِس پیرائے میں بیان کیا ہے اُسکا ماحصل صرف اسقدر ہے کہ رخصت ہوتے وقت جو وہ میری طرف دیکھتا تھا اُسپر بے اختیار پیار آتا تھا۔ اِس معمولی بات کو وہ اسطرح ادا کرتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ جسکے مُنہ میں بول تک نہ تھا اُسکی آنکھ ایک ایسے بھید سے واقف تھی جس سے اکثر بڑے بڑے عاقل اور دانشمند واقف نہیں ہوتے یعنی یہ کہ کس طرح اوروں کے

دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ✦

(۴) نظیری نیشاپوری۔

بہ زیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

فصل بہار میں پھولوں کے کھلنے۔ یا ہوا میں اعتدال پیدا ہونے۔ یا بدن میں دوران خون کے تیز ہو جانے سے جو نشاط اور اُمنگ بلبل کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور جسکو شعرا گل و گلشن کے عشق سے تعبیر کرتے ہیں اور جسکے جوش اور ولولہ میں وہ دن بھر چہکتا رہتا ہے۔ اُس حالت اور کیفیت کو شاعر نے افعی کے کاٹے کی لہر سے تعبیر کیا ہے۔ گو یہ تمثیل بھی اُس حالت کی اصل حقیقت ظاہر کرنے سے قاصر ہو۔ مگر جسقدر کہ اُس حالت کا تصور ان لفظوں کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اُتنا بھی تصویر یا ناٹک کے ذریعہ سے تعبیر نہیں ہو سکتا۔ گویا اس کیفیت کا ظاہر کرنا مصوری بُت تراشی اور ناٹک کی دسترس سے باہر ہے ✦

شاعری کے لئے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں۔

اُمید ہے کہ اِن مثالوں سے شاعر اور غیر شاعر کے کلام میں اور نیز شعر اور مصوری میں جو فرق ہے وہ بخوبی ظاہر ہو گیا ہو گا۔ اب ہمکو یہ بتانا ہے کہ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے کونسی شرطیں ضروری ہیں اور شاعر میں وہ کونسی خاصیت ہے جو اُسکو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے ✦

(۱) تخیل

سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے۔ قوت متخیلہ یا تخیل ہے جسکو انگریزی میں ایمجینیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جسقدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہو گی اُسیقدر اُسکی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہو گی۔ اور جسقدر یہ ادنیٰ درجہ کی ہو گی۔ اُسیقدر اُسکی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہو گی۔ یہ وہ ملکہ ہے جسکو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لیکر نکلتا ہے۔ اور جو

اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمال شاعری کے لیئے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو وہ اُس کمی کا تدارک اس ملکہ سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکہ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اُسکے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ وہ طاقت ہی جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ اور ماضی و استقبال کو اُسکے لیئے زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہی وہ آدمؑ اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اُسنے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اُس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیئے۔ اُسمیں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری۔ عنقا اور آب حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کر سکتا ہے کہ اُنکی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جو نتیجے وہ نکالتا ہے گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن جب دل اپنی معمولی حالت سے کسیقدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں مثلاً فیضی کہتا ہے۔

سخت ست سیاہیِ شبِ من ... لختے ز شب۔ ست کوکبِ من

اسپر منطقی قاعدہ سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لیئے یکساں ہوتی ہے پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے زیادہ تاریک کیونکر ہو سکتی ہے۔ اور تمام کوکب ایسے اجرام ہیں جنکا وجود بغیر روشنی کے تصور میں نہیں آ سکتا پھر ایک خاص کوکب ایسا مظلم اور سیاہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اُسکو کالی رات کا ایک ٹکڑہ کہا جا سکے۔ مگر جس عالم میں شاعر اپنے تئیں دکھاتا

چاہتا ہے وہاں یہ سب ناممکن باتیں ممکن بلکہ موجود نظر آتی ہیں۔ یہی وہ ملکہ ہے جس سے بعض اوقات شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے +

تخیل کی تعریف

تخیل یا امیجنیشن کی تعریف کرنی بھی ایسی ہی مشکل ہے جیسی کہ شعر کی تعریف۔ مگر من وجہ اُس کی ماہیت کا خیال ان لفظوں سے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اُس کو مکرر ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اُسکو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسیقدر الگ ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیل کا عمل اور تصرف جسطرح خیالات میں ہوتا ہے۔ اسیطرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقہ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصورات اور خیالات میں تصرف کرتی ہے اور کبھی الفاظ و عبارات میں۔ اگرچہ اس قوت کا ہر ایک شاعر کی ذات میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اسکا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا۔ بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم ہوتا ہے۔ اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں۔ یہاں چند مثالیں بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں +

(۱) غالب دہلوی۔

جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے اَور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے۔ اور جامِ جمشید ایک ایسی چیز تھی جسکا بدل دُنیا میں موجُود نہ تھا۔ اُسکو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جامِ سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جسکی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے فایق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں شراب پی جاتی تھی۔ اور مٹی کے کوزہ میں بھی شراب پی جا سکتی ہے اب قوت متخیلہ نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیکر ایسی صورت میں جلوہ گر کردیا کہ جام سفال کے آگے جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ اور پھر اُس صورت موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک دلفریب پیرایہ دیکر اس قابل کردیا کہ زبان اُسکو پڑھکر متلذذ اور کان اُسکو سُن کر محظوظ اور دل اُسکو سمجھکر متاثر ہو سکے۔ اِس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا امیجنیشن ہے۔ اور اِس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہنکر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اسکا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں امیجنیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونو کے لحاظ سے بمرتبہ غایت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے +

(۲) غالب کا اسی زمین میں دوسرا شعر یہ ہے +

اُنکے آنے سے جو آجاتی ہی رونق مُونہ پر   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت بحال ہوجاتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالتِ زار اور اُس کی

جدائی کا صدمہ نہ جتائے دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا الیقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعض خوشی سے دفعتہً ایسی بشاشت ہو سکتی ہے کہ رنج اور غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے۔ اب امیجنیشن نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کسیطرح اپنی جدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اُسوقت معشوق نہیں ہوتا۔ اور جب معشوق ہوتا ہے اُسوقت تکلیف نہیں رہتی۔ اس مثال میں بھی امیجنیشن کا عمل معنیً اور لفظاً دونوطرح بدرجۂ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحبِ ذوق سلیم پر ظاہر ہے +

(۳) خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را　　که سر بکوه و بیاباں تو دادۂ ما را

اس شعر کا خلاصۂ مطلب اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہم صرف معشوق کی بدولت پہاڑوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں امیجنیشن کا عمل خیالات میں اگر ہو بھی تو نہایت خفیف اور مختصر ہوگا مگر الفاظ میں اُسنے وہ کرشمہ دکھایا ہے جسنے شعر کو بلاغت کے اعلےٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ اسی قسم کے کلام کی نسبت کہا گیا ہے ؎ عبارتے کہ معنی برابری دارد اول تو صبا کی طرف خطاب کرنا جسمیں یہ اشارہ ہے کہ کوئی ذریعہ دوست تک پیغام پہنچانے کا نظر نہیں آتا۔ ناچار صبا کو یہ سمجھکر پیغامبر بنایا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہی شاید دوست تک بھی اُسکا گذر ہو جائے گویا شوق نے ایسا ازخود رفتہ کر دیا ہے کہ جو چیز پیغامبر ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی اُسکے ہاتھ پیغام بھیجتا ہے اور جواب کا اُمیدوار رہے

پھر معشوق حقیقی کو جسکی ذات بے نشاں ہی۔ بطور استعارہ کے غزالِ رعنا کے ساتھ تعبیر کرنا جس سے بہتر استعارہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اُسکی طلب کو غزالِ رعنا کی مناسبت سے کوہ و بیابان میں پھرنے سے تعبیر کرنا اور پھر باوجود ضمیر متصل کے جو کہ دادۂ میں موجود تھی ضمیر مخاطب منفصل یعنی لفظ **تو** اضافہ کرنا جس سے پایا جائے کہ تیرے سوا کوئی شے ہماری اِس سرگشتگی کا باعث نہیں ہی۔ اور چونکہ پیغام شکایت آمیز تھا اسلیئے صبا سے یہ درخواست کرنی کہ **بلطف بگو** یعنی نرمی اور ادب سے یہ پیغام دینا تاکہ شکایت ناگوار نہ گزرے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنھوں نے ایک معمولی بات کو سقدر بلند کر دیا ہے کہ اعلےٰ درجہ کے باریک خیالات بھی اُس سے زیادہ بلندی پر نہیں دکھائے جا سکتے۔

دوسری شرط کائنات کا مطالعہ

اگرچہ قوت متخیلہ اُسحالت میں بھی جبکہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اُسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنیکے لیئے یہ بھی ضرور ہے کہ نسخۂ کائنات اور اُسمیں سے خاصکر نسخۂ فطرۃ انسانی کا **مطالعہ** نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اُسکو پیش آتی ہیں اُنکو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا۔ جو امور مشاہدہ میں آئیں اُنکے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی۔ کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اِس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانہ میں محفوظ رکھے۔

مختلف چیزوں سے متحد خاصیت اخذ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مرزا غالب کہتے ہیں ؎

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دوسری مثال

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بغمزہ کُشت و مرّیخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس مانا گیا ہے پس دونو باعتبار ذات اور صفات کے مختلف ہیں مگر شاعر کہتا ہی کہ اُنکے سعادت و نحوست کے اختلاف کو رہنے دو مجھپر تو انکا اثر یکساں ہی ہوتا ہے مریخ قہر سے قتل کرتا ہے تو زہرہ غمزہ سے +

اور متحد اشیا سے مختلف خاصیتیں استنباط کرنے کی مثال میر ممنون کا یہ شعر ہی

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنون وہی فتنہ ہے لیکن یہاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

یعنی قامت معشوق اور قیامت فتنہ ہونے میں تو دونو متحد ہیں مگر فرق یہ ہے کہ فتنۂ قیامت سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں ہے اور قامت معشوق سانچے میں ڈھلا ہوا ہے +

غرضکہ یہ تمام باتیں جو اوپر ذکر کی گئیں ایسی ضروری ہیں کہ کوئی شاعر اُنسے استغنا کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انکے بغیر قوت متخیلہ کو اپنی اصلی غذا جس سے وہ نشو و نما پاتی ہی نہیں پہنچتی۔ بلکہ اُسکی طاقت آدھی سے بھی کم رہجاتی ہے +

قوت متخیلہ کوئی شئے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتی بلکہ جو مصالح اُسکو خارج سے ملتا ہے اُسمیں وہ اپنا تصرف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے جتنے بڑے بڑے نامور شاعر

دنیا میں گذرے ہیں وہ کائنات یا فطرت انسانی کے مطالعہ میں ضرور مستغرق رہے ہیں۔ جب رفتہ رفتہ اس مطالعہ کی عادت ہوجاتی ہے تو ہر ایک چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ ہوجاتا ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینۂ خیال میں خود بخود جمع ہونے لگتے ہیں۔

سروالٹر سکوٹ کی شاعری

سروالٹر سکوٹ جو انگلستان کا ایک مشہور شاعر ہے اُسکی نسبت لکھا ہی کہ اُسکی خاص خاص نظموں میں دو خاصیتیں ایسی ہیں جنکو سب نے تسلیم کیا ہے۔ ایک اصلیت سے تجاوز نہ کرنا۔ دوسرے ایک ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ جہاں کہیں اُسنے کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا کا بیان کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس موقع کی روح میں جو خاصیتیں تھیں سروالٹر نے وہ سب انتخاب کرلی تھیں **سروالٹر** کی نظم پڑھکر آنکھوں کے سامنے بالکل وہی سماں بندھ جاتا ہے جو پہلے خود اُس موقع کے دیکھنے سے معلوم ہوا تھا۔ اور اب دھیان سے اُتر گیا تھا۔ ظاہرا اُسنے ان بیانات میں قوت متخیلہ پر ایسا بھروسا نہیں کیا کہ اصلیت کو چھوڑکر محض تخیل ہی پر قناعت کرلیتا۔" کہتے ہیں کہ جب وہ **روکبی** کا قصہ لکھ رہا تھا۔ ایک شخص نے اُسکو دیکھا کہ پاکٹ بک میں چھوٹے چھوٹے خودرو پھول پتے اور میوے جو وہاں اُگ رہے تھے اُنکو نوٹ کررہا ہے۔ ایک دوست نے اُس سے کہا کہ اس دردِ سر سے کیا فائدہ؟ کیا عام پھول کافی نہ تھے جو چھوٹے چھوٹے پھولوں کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ سروالٹر نے کہا تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں ہیں جو بالکل یکساں ہوں"۔ پس جو شخص محض اپنے تخیل پر بھروسا کرکے مذکورۂ بالا مطالعہ سے چشم پوشی یا غفلت کریگا اُسکو بہت جلد معلوم ہوجائیگا کہ اُسکے دماغ میں چند معمولی تشبیہوں یا تمثیلوں کا

ایک نہایت محدود ذخیرہ ہے جنکو برتتے برتتے خود اُسکا جی اُکتا جائے گا اور سامعین کو سنتے سنتے نفرت ہو جائے گی۔ جو شخص شعر کی ترتیب میں اصلیت کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور محض ہوا پر اپنی عمارت کی بنیاد نہیں رکھتا وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک مطلب کو جتنے اسلوبوں میں چاہے بیان کرے۔ اُسکا تخیل اُسیقدر وسیع ہوگا جسقدر کہ اُسکا مطالعہ وسیع ہے ✤

تیسری شرط تفحص الفاظ

کائنات کے مطالعہ کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا نہایت ضروری مطالعہ یا تفحص اُن الفاظ کا ہے جنکے ذریعہ سے مخاطب کو اپنے خیالات مخاطب کے روبرو پیش کرنے ہیں۔ یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا۔ شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر انکو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے۔ اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اسکے اُس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کر لے۔ اس مرحلہ کا طے کرنا جسقدر دشوار ہے اُسیقدر ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اُسکے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔ اگرچہ شاعر کے متخیلہ کو الفاظ کی ترتیب میں بھی ویسا ہی دخل ہے جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں۔ لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی ✤

جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعہ سے اپنے ہمجنسوں کے دل میں اثر

پیدا کر سکتے ہیں اُنکو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے۔ اور اُسکے اختیار کرنے یا ترک کرنیسے کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے۔ نظم الفاظ میں اگر بال برابر بھی کمی رہجاتی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے شعر میں کونسی بات کی کسر ہے جسطرح ناقص سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز فوراً چُغلی کھاتی ہے اسیطرح اُنکے شعر میں اگر تاؤ بھاؤ بھی فرق رہجاتا ہے معاً اُنکی نظر میں کھٹک جاتا ہے۔ اگرچہ وزن اور قافیہ کی قید ناقص اور کامل دونو قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات ایسے لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مگر فرق صرف اسقدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اُسی لفظ پر قناعت کر لیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اُس لفظ پر قانع نہیں ہوتا۔ شاعر کو جب تک الفاظ پر کامل حکومت اور اُنکی تلاش و جستجو میں نہایت صبر و استقلال حاصل نہو ممکن نہیں کہ وہ جمہور کے دلوں پر بالاستقلال حکومت کر سکے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ "شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کودتا۔ بلکہ خیال کی ابتدائی ناہمواری سے لیکر انتہا کی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شاید محسوس نہ ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں۔"

اِس بحث کے متعلق چند امور ہیں جنکو فکر شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے

اول خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا۔ پھر اُنکو جانچنا اور تولنا۔ اور ادائے معنی کے لحاظ سے اُنمیں جو قصور رہجائے اُنکو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ

صورۃً اگرچہ نثر سے متمیز ہو مگر معنی اُسیقدر پورے ادا کرے۔ جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکتے بشرطیکہ شاعر ہو۔ اول تو وہ اِن باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے بالفعل اُسکو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو اطمینان کے وقت دیکھتا ہے اُسکو ضرور کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعروں کا کلام مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے +

آمد اور آورد میں فرق

اکثر لوگوں کی یہ رائے ہی کہ جو شعر شاعر کی زبان یا قلم سے فوراً بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے وہ اُس شعر سے زیادہ لطیف اور بامزہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ پہلی صورت کا نام اُنھوں نے **آمد** رکھا ہے اور دوسری کا **آورد**

بعضے اس موقع پر یہ مثال دیتے ہیں کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے وہ اُس شیرہ سے زیادہ لطیف و بامزہ ہوتا ہے جو انگور سے نچوڑ کر نکالا جائے۔ مگر ہم اِس رائے کو تسلیم نہیں کرتے اول تو یہ مثال جو اسموقع پر دیجاتی ہے اِسی سے اُس رائے کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ جو شیرہ انگور سے خود بخود اُسکے پک جانے کے بعد ٹپکتا ہے وہ یقیناً اُس شیرہ کی نسبت بہت دیر میں طیار ہوتا ہے جو کچے یا ادھ کچرے انگور سے نچوڑ کر نکالا جاتا ہے مستثنےٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول۔ زیادہ لطیف۔ زیادہ بامزہ۔ زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ یہ ممکن ہی کہ شاعر کسی موقع پر پاکیزہ خیالات جو اُسکے حافظہ میں پہلے سے ترتیب وار محفوظ ہوں مناسب الفاظ میں جو حسن اتفاق سے فی الفور اُسکے ذہن میں آ جائیں ادا کر دے لیکن اول تو ایسے اتفاقات شاذ و نادر ظہور میں آتے ہیں۔ والنادر کالمعدوم دوسرے

اُن خیالات کو جودت سے انگور کے شیرہ کی طرح اُسکے ذہن میں پک رہے تھے کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ وہ جھٹ پٹ بغیر غور وفکر کے سرانجام ہوگئے ہیں۔ شعر میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک خیال دوسرے الفاظ۔ خیال تو ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن میں فوراً ترتیب پاجائے مگر اُسکے لیئے الفاظ مناسب کا لباس تیار کرنے میں ضرور دیر لگے گی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مستری مکان کا نہایت عمدہ اور نرالا نقشہ ذہن میں فوراً تجویز کرلے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ اُس نقشہ پر مکان بھی ایک چشم زدن میں تیار ہوجائے۔ وزن اور قافیہ کی اوگھٹ گھاٹی سے صحیح سلامت نکل جانا اور مناسب الفاظ کے تفحص سے عہدہ برا ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر ایک دن کا کام ایک گھنٹے میں کیا جائیگا تو وہ کام نہ ہوگا۔ بلکہ بیگار ہوگی +

روما کے مشہور شاعر **ورجل** کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو اپنے اشعار لکھوا تا تھا اور دن بھر اُنپر غور کرتا تھا اور اُنکو چھانٹتا تھا۔ اور یہ کہا کرتا تھا کہ ریچھنی بھی اسیطرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے۔" **ایرسٹو** شاعر جس کے کلام میں مشہور ہے کہ کمال بے ساختگی اور آمد معلوم ہوتی ہے۔ اُسکے مسودے اب تک **فیرا** علاقہ اٹلی میں محفوظ ہیں۔ اُن مسودوں کے دیکھنے ولے کہتے ہیں کہ جو اشعار اُسکے نہایت صاف اور سادے معلوم ہوتے ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ **ملٹن** بھی اسبات کو تسلیم کرتا ہے کہ نہایت سخت محنت اور جانفشانی سے نظم لکھی جاتی ہی اور نظم کی ایک ایک بیت میں اُسکے سڈول ہونے سے پہلے کتنی ہی تبدیلیاں پے در پے کرنی پڑتی ہیں۔ ایک فارسی گو شاعر بھی فکر شعر کی حالت اسطرح بیان کرتا ہے ؎

برائے پاکیٔ لفظے شبے بروز آرد   کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ۔ او بیدار

سچ یہ ہے کہ کوئی نظم جسنے کہ استقلال کے ساتھ جمہور کے دل پر اثر کیا ہو خواہ طویل ہو خواہ مختصر ایسی نہیں ہے جو بے تکلف لکھکر پھینک دی گئی ہو جسقدر کسی نظم میں زیادہ بیساختگی اور آمد معلوم ہو اُسیقدر جاننا چاہیئے کہ اُسپر زیادہ محنت زیادہ غور اور زیادہ حک و اصلاح کی گئی ہوگی

ابن رشیق اپنی کتاب عمدہ میں لکھتے ہیں کہ "جب شعر سر انجام ہو جائے تو اُسپر بار بار نظر ڈالنی چاہیئے اور جہاں تک ہو سکے اُسمیں خوب تنقیح و تہذیب کرنی چاہیئے پھر بھی اگر شعر میں جوّدت اور خوبی پیدا نہو تو اُسکے دور کرنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے جیسا کہ اکثر شعرا کیا کرتے ہیں۔ انسان اپنے کلام پر اسلیئے کہ وہ اُسکی مجازی اولاد ہوتی ہے مفتوں اور فریفتہ ہوتا ہے۔ پس اگر اُسکے دور کرنے میں مضائقہ کیا جائے گا تو ایک بُرے شعر کے سبب سارا کلام درجۂ بلاغت سے گر جائے گا"

انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے نہ معانی پر

ابن خلدون اسی الفاظ کی بحث کے متعلق کہتے ہیں کہ انشا پردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں محض الفاظ میں ہی۔ معانی میں ہر گز نہیں۔ معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں۔ پس اُنکے لیئے کسی ہنر کے اکتساب کرنے کی ضرورت نہیں ہی۔ اگر ضرورت ہی تو صرف اس بات کی ہے کہ اُن معانی کو کسطرح الفاظ میں ادا کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ۔ اور معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالہ میں بھر لو۔ اور چاہو چاندی کے پیالہ میں اور چاہو کانچ یا باور یا سیپ کے پیالہ میں۔ اور چاہو مٹی کے پیالہ میں۔ پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی

وغیرہ کے پیالہ میں اُسکی قدر بڑھجاتی ہے۔اور مٹی کے پیالہ میں کم ہوجاتی ہی۔اسیطرح معانی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہوجاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہی"

مگر ہم اُنکی جناب میں عرض کرتے ہیں کہ حضرت اگر پانی کھاری یا گدلا یا بوجھل یا اُدھن ہوگا۔یا ایسی حالت میں پلایا جائیگا جبکہ اُسکی پیاس مطلق نہ ہو تو خواہ سونے یا چاندی کے پیالہ میں پلایئے خواہ بلور اور پھٹک کے پیالہ میں وہ ہرگز خوشگوار نہیں ہوسکتا اور ہرگز اُسکی قدر نہیں بڑھ سکتی +

ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جسقدر الفاظ پر ہے اُسقدر معانی پر نہیں معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کئے جائینگے ہرگز دلوں میں گھر نہیں کرسکتے اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابل تحسین ہوسکتا ہے لیکن معانی سے یہ سمجھکر کہ وہ ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں اور اُنکے لیئے کسی ہنر کے اکتساب کی ضرورت نہیں۔بالکل قطع نظر کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔اگر شاعر کے ذہن میں صرف وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جنکو اگلے شعرا باندھ گئے ہیں یا صرف وہی معمولی باتیں اُسکو بھی معلوم ہیں جیسی کہ عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں اور اُسنے شاعری کی تکمیل کے لیئے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی۔اور صحیفہ فطرت کے مطالعہ کی عادت نہیں ڈالی اور قوت متخیلہ کے لیئے زیادہ مصالح جمع نہیں کیا۔گو زبان پر اُسکو کیسی ہی قدرت اور الفاظ پر کیسا ہی قبضہ حاصل ہو اُسکو دو مشکلوں میں سے ایک مشکل ضرور پیش آئے گی۔یا تو اُسکو وہی خیالات جو اگلے شعرا باندھ چکے ہیں تھوڑے تھوڑے تغیر کے ساتھ اُنھیں کے اسلوب پر بار بار باندھنے پڑینگے یا ایک ایک مبتذل اور پامال

مضمون کے لئے نئے نئے اسلوبِ بیان ڈھونڈھنے پڑینگے جنکا مقبول ہونا نہایت مشتبہ ہی اور نامقبول ہونا قرینِ قیاس ٭

نیچر یعنی کائنات کا مطالعہ

اسکے سوا معنی کے متعلق ایک اور کمال حاصل کرنے کی ضرورت ہی جسکو الفاظ سے کچھ تعلق نہیں ہے صرف نیچر کا مطالعہ اور معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینا ہی شاعر کا کام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں اُنکا انتخاب کرنا اور اُنکی تصویر کھینچنا شاعر کا کام ہی۔ شاعر مثلاً نباتات اور پھول اور پھل کو اُس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے کہ ایک محقق علم نباتات کا دیکھتا ہے۔ یا وہ ایک واقعۂ تاریخی پر اُس حیثیت سے نظر نہیں ڈالتا جس حیثیت سے کہ ایک مورخ نظر ڈالتا ہے۔ وہ ہر ایک شے میں سے صرف وہ خاصیتیں چُن لیتا ہے جنپر قوتِ متخیلہ کا عمل چل سکے اور جو عام نظروں سے مخفی ہوں۔ جسطرح ایک نیاریا ریت میں سے چاندی کے ذرے نکال لیتا ہے جو کسی کو نہیں سوجھتے اسیطرح شاعر ہر ایک چیز اور ہر ایک واقعہ میں سے صرف ذوقیات لے لیتا ہے جنمیں اُسکے سوا کسیکا حصہ نہیں۔ اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً سکندر کے مرنے کا حال اور اُسکے اخیر وقت کے واقعات مورخین نے جو کچھ لکھے ہوں سو لکھے ہوں مگر ایک مورلسٹ شاعر اُنسے صرف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ؎

سکندر کہ بر عالمے حکم داشت	در آں دم کہ بگذشت و عالم گذاشت
مُیسّر نبودش کزو عالمے	ستانند و مُہلت دہندش دمے

یا فصلِ بہار میں بلبل ہزار داستان کے غیر معمولی چہچہے دیکھکر ایک خواص حیوانات کا محقق اُسکے جو کچھ اسباب قرار دے سو دے مگر ایک متصوف شاعر اُسکے یہ معنی بتاتا ہے ؎

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت | و ندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت
گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست | گفت مارا جلوۂ معشوق بر ایں کار داشت

پس یہ کہنا کہ شاعری کا کمال محض الفاظ میں ہے معانی میں ہرگز نہیں کسیطرح ٹھیک نہیں سمجھا جاسکتا ✦

اعلیٰ طبقہ کے شعرا کا کلام یاد ہونا چاہیے

ابن رشیق کہتے ہیں کہ "شاعر کو اعلےٰ طبقہ کے شعرا کا کلام یاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے شعر کی بنیاد اُسی منوال پر رکھے۔ جو شخص اساتذہ کے کلام سے خالی الذہن ہوگا اگر وہ محض طبیعت کی اُپج سے کچھ لکھ بھی لیگا تو اُسکو شعر نہیں بلکہ نظم ساقط از اعتبار یا ٹکسال باہر کہینگے۔ پس جب اُسکا حافظہ بلغا کے کلام سے پُر ہوجائے اور اُنکی روش ذہن کی لوح پر نقش ہوجائے تب فکرِ شعر کیطرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اب جسقدر مشق زیادہ ہوگی اُسیقدر ملکہ شاعری مستحکم ہوگا ✦

ابن رشیق نے یہ ہدایت خاص عربی زبان کی نسبت کی ہے۔ شاید عربی زبان کے لیئے یہ ہدایت مناسب ہو کیونکہ وہاں ایک مُدّت دراز سے شاعری کا دور دورہ چلا آتا تھا۔ ہزار برس سے زیادہ گذر چکے تھے کہ ہر عہد اور طبقہ میں ایک سے ایک بہتر و برتر شاعر نظر آتا تھا۔ زبان میں بے انتہا وسعت پیدا ہوگئی تھی ہر مطلب کے ادا کرنے کے لیئے صدہا اسلوب اور پیرایے لٹریچر میں موجود تھے۔ شاید وہاں یہ بات ممکن ہو کہ ہر مطلب کے ادا کرنے کے لیئے قُدما کا اسلوب اختیار کیا جائے اور نئے اسلوب پیدا کرنے کی ضرورت نہو۔ لیکن ایک ایسی ناکمل زبان جیسی کہ اُردو ہے جسکی شاعری ابھی تک محض طفولیت کی حالت میں ہے۔ جسکے لٹریچر کی عمر اگر انصاف سے دیکھا جائے تو پچاس ساٹھ

برس سے زیادہ نہیں۔ جسکا لغت آجتک مدوّن نہیں ہوا جسکی گریمر آجتک اطمینان کے قابل نہیں بنی۔ جسکے لایق مصنف اور شاعر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ایسی زبان میں اگر اساتذہ کے تتبع ہی پر تکیہ کر لیا جائے تو جسطرح ابابیل کا گھونسلا ابتداے آفرینش سے ایک ہی حالت پر چلا آتا ہے اور اُسی حالت پر چلا جائے گا اسیطرح اردو شاعری جس گہوارہ میں اُسنے آنکھیں کھولی ہیں اُسی گہوارہ میں ہمیشہ جھولتی رہے گی *

اسکے بعد ابن رشیق کہتے ہیں کہ "بعضوں کی راے یہ ہی کہ ایکبار اساتذہ کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالکر اُسکو صفحۂ خاطر سے محو کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ اُسکا بعینہ ذہن میں محفوظ رہنا ویسی ترکیبوں اور اسلوبوں کے استعمال کرنے سے ہمیشہ مانع ہوگا۔ لیکن جب وہ کلام صفحۂ خاطر سے محو ہو جائیگا تو بسبب اُس رنگ کے جو کلام بلغا کی سیر کرنے سے طبیعت پر خود بخود چڑھ گیا ہی اُسمیں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ کہ ویسی ہی ترکیبیں اور اسلوب جیسے کہ اساتذہ کے کلام میں واقع ہوئے ہیں دوسرے لفظوں میں خود بخود بغیر اس تصور کے کہ یہ ترکیب فلاں ترکیب پر مبنی ہے اور یہ اسلوب فلاں اسلوب کا چربا ہے جیسی ضرورت پڑے گی بناتا چلا جائے گا "

ہمارے نزدیک یہ راے بہ نسبت پہلی راے کے زیادہ وقعت کے قابل ہے اسمیں اُس فائدہ کے سوا جو صاحب راے نے بیان کیا ہے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کا کلام جب تک صفحۂ خاطر سے محو نہو جائے طبیعت اُنھیں اسلوبوں اور پیرایوں میں مقید او محصور رہتی ہے جو اُنکے کلام کو بار بار پڑھنے اور یاد کرنے سے بمنزلۂ طبیعت ثانی کے ہو جاتے ہیں اور جنکے سبب سے سلسلۂ بیان میں نئے اسلوب اور نئے پیرائے ابداع کرنے کا ملکہ پیدا نہیں ہوتا اور اسلیئے فنِ شعر کو کچھ ترقی

نہیں ہوتی ✤

الغرض شاعر کی ذات میں جیساکہ اوپر بیان ہوا تین صفتیں متحقق ہونے ضرور ہیں ایک وہبی یعنی تخیل یا امیجینیشن ۔ اور دو کسبی یعنی صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی عادت اور الفاظ پر قدرت ✤

تخیل کو قوت ممیزہ کا محکوم رکھنا چاہئے

اب تخیل کی نسبت اتنا جان لینا اور ضرور ہے کہ اُسکو جہانتک ممکن ہو اعتدال پر رکھنا اور طبیعت پر غالب نہونے دینا چاہیئے ۔ کیونکہ جب اُسکا غلبہ طبیعت پر زیادہ ہوجاتا ہی اور وہ قوت ممیزہ کے قابو سے جوکہ اُسکی روک ٹوک کرنے والی ہے باہر ہوجاتا ہے تو اُسکی یہ حالت شاعر کے حق میں نہایت خطرناک ہی ۔ قوت متخیلہ ہمیشہ خلاّقی اور بلند پروازی کی طرف مائل رہتی ہی مگر قوتِ ممیزہ اُسکی پرواز کو محدود کرتی ہے اُسکی خلاّقی کی مزاحم ہوتی ہے اور اُسکو ایک قدم بے قاعدہ نہیں چلنے دیتی ۔ قوت متخیلہ کیسی ہی دلیر اور بلند پرواز ہو جب تک کہ وہ قوت ممیزہ کی محکوم ہی شاعری کو اُس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جسقدر اُسکی پرواز بلند ہوگی اُسیقدر شاعری اعلیٰ درجہ کو پہنچے گی ۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں اُنمیں قوت متخیلہ کی بلند پروازی اور قوتِ ممیزہ کی حکومت دونو ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں ۔ اُنکا تخیل نہ خیالات میں بے اعتدالی کرنے پاتا ہی نہ الفاظ میں کجروی ۔ مگر دوسری صورت میں جبکہ تخیل قوت ممیزہ پر غالب آجائے شاعر کے لیئے اُسکی پرواز ایسی ہی خطرناک ہی جیسے سوار کے لیئے نہایت چالاک گھوڑا جسکے مونہ میں لگام نہو ۔ ہزاروں ہونہار شاعروں کو اس قوت کی آزادی اور مطلق العنانی نے گمراہ کردیا ہے اور بعضے جو گمراہ ہوکر پھر راہ راست پر آئے ہیں وہ اُسوقت تک نہیں آئے جب تک کہ قوت ممیزہ کو اُسپر حاکم نہیں بنالیا قوت

متخیلہ کی دلیری اور بلند پروازی زیادہ تر اُسوقت بڑھتی ہی جبکہ شاعر کے ذہن میں اُسکو اپنی غذا یعنی حقایق وواقعات کا ذخیرہ جسمیں وہ تصرف کرسکے نہیں ملتا جسطرح انسان بھوک کی شدت میں جب معمولی غذا نہیں پاتا تو مجبور ہو کر بناس پتی سے اپنا دوزخ بھرکر صحت کو خراب کرلیتا اور اکثر ہلاک ہوجاتا ہے اسیطرح جب قوت متخیلہ کو اُسکی معتاد غذا نہیں ملتی تو وہ غیر معتاد غذا پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ خیالاتِ دور از کار جنمیں اصلیت کا نام ونشان نہیں ہوتا تراش کر بتکلف اُنکو شعر کا لباس پہناتی ہے اور قوت ممیزہ کو اپنے کام میں خلل انداز سمجھکر اُسکی طاعت سے باہر ہوجاتی ہے اور آخرکار شاعر کو مہمل گو۔ اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق بنادیتی ہے۔

شاعر کے لیئے نیچر کا خزانہ ہر وقت کھُلا ہوا ہے اور قوت متخیلہ کے لیئے اُسکی اصلی غذا کی کچھ کمی نہیں ہے بس بجائے اسکے کہ وہ گھر میں بیٹھکر کاغذ کی پھُول پنکھڑیاں بنائے اُسکو چاہیئے کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اور خود اپنی ذات میں قدرتِ حق کا تماشا دیکھے۔ جہاں بھانت بھانت کے اصلی پھُول اور پنکھڑیوں کے لازوال خزانے موجود ہیں۔ ورنہ اُسکی نسبت کہا جائیگا

جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تو   کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں

یہانتک اُن خاصیتوں کا بیان ہوا جنکے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچتا اب وہ خصوصیتیں بیان کرنی ہیں جو دنیا کے تمام مقبول شاعروں کے کلام میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ ملٹن نے اُنکو چند مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو"۔ ایک یوروپین محقق اِن لفظوں کی شرح اسطرح کرتا ہے "سادگی سے صرف لفظوں ہی کی سادگی مراد نہیں ہے۔ بلکہ

خیالات بھی ایسے نازک اور دقیق نہ ہونے چاہئیں جنکے سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجایش نہو محسوسات کے شارع عام پر چلنا۔ بے تکلفی کے سیدھے رستے سے ادھر اُدھر نہ ہونا اور فکر کو جولانیوں سے باز رکھنا اسی کا نام سادگی ہے۔ علم کا رستہ اُسکے طالبوں کے لیئے ایسا صاف نہیں ہو سکتا جیسا کہ شعر کا رستہ اُسکے سامعین کے لیئے صاف ہونا چاہیئے۔ طالب علم کو پستی اور بلندی۔ غار اور ٹیلے کنکر اور پتھر۔ موجیں اور گرداب طے کر کے منزل پر پہنچنا ہوتا ہے۔ لیکن شعر پڑھنے یا سننے والے کو ایسی ہموار اور صاف سڑک ملنی چاہیئے جسپر وہ آرام سے چلا جائے۔ ندی نالے اُسکے ادھر اُدھر چل رہے ہوں اور پھل پھول درخت اور مکان اُسکی منزل ہلکی کرنیکے لیئے ہر جگہ موجود ہوں۔ دنیا میں جو شاعر مقبول ہوئے ہیں اُنکا کلام ہمیشہ ایسا ہی دیکھا گیا ہے اور ایسا ہی سنا گیا کہ اُسکی ہر ذہن سے مصالحت اور ہر دل میں گنجایش ہوتی ہے۔ **ہومر** نے اپنے کلام میں ہر جگہ نیچر کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اُسکو جوان۔ بوڑھے اور وہ قومیں جو ایک دوسرے سے قطبوں کے فاصلے پر رہتی ہیں برابر سمجھ سکتی اور یکساں مزا لے سکتی ہیں۔ عالمِ محسوسات کے چپے چپے پر جہاں جہاں کہ اُسکا کلام پہنچا ہے اُسکی روشنی سورج کیطرح پھیلی ہوئی ہے۔ وہ آباد اور ویرانہ کو برابر روشن کرتا ہے اور فاضل و جاہل پر یکساں اثر ڈالتا ہے۔ **شکسپیر** کا بھی ایسا ہی حال ہے جیسا ہومر کا۔ یہ دونو برخلاف عام شاعروں کے مستثنیات کو نہیں لیتے بلکہ ہمیشہ عام شق اختیار کرتے ہیں۔ یہ خاص خاص صورتیں اور نادر اتفاقات[8]

8 مستثنی صورتوں پر شعر کی بنیاد رکھنے کی مثال ایسی ہے جیسے مومن کا یہ شعر ؎ رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام ؛ آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں ؛ یعنی شاعر نے معشوق کے چند خریدار جنکو بمقابلہ تمام بنی نوع کے مستثنیات میں شمار کرنا چاہیئے اُسکے کوچہ میں جمع دیکھکر یہ حکم لگایا ہے کہ سارا جہان اُسکے کوچہ میں مجتمع رہتا ہے اگرچہ اسکی طرز بیان سے شاعر کا لطف طبع ضرور ثابت ہوتا ہے لیکن اثر کچھ نہیں۔ بخلاف اسکے یہی شاعر دوسری جگہ کہتا ہے ؎ ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس ؛ ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے ؛ اسمیں اُسنے ایسی عام شق اختیار کی ہے جسمیں استثنا کو بہت ہی کم دخل ہے کیونکہ بوالہوس کا انجام ہمیشہ پشیمانی ہوتی ہے اور اُسکی ابتدا شوق اور ارمان سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ پس ہر شخص کا دل اس بات کو فوراً قبول کر لیتا ہے اور اسلیئے اُس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے ۱۲

دکھا کر لوگوں کو اپنی خاص لیاقت پر فریفتہ کرنا نہیں چاہتے۔"

" دوسری بات جو ملٹن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ شعر اصلیت پر مبنی ہو اس سے یہ غرض ہے کہ خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہونی چاہیئے جو در حقیقت کچھ وجود رکھتی ہو۔ نہ یہ کہ سارا مضمون ایک خواب کا سا تماشا ہو کہ ابھی تو سب کچھ تھا اور آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا۔ یہ بات جیسی مضمون میں ہونی ضرور ہے ایسی ہی الفاظ میں بھی ہونی چاہیئے مثلاً ایسی تشبیہات استعمال نہ کی جائیں جنکا وجود عالمِ بالا پر ہو"

" تیسری بات یہ تھی کہ شعر جوش سے بھرا ہوا ہو۔ اِس سے صرف یہی مراد نہیں کہ شاعر نے جوش کیحالت میں شعر کہا ہو۔ یا شعر کے بیان سے اُسکا جوش ظاہر ہوتا ہو۔ بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ جو لوگ مخاطب ہیں اُنکے دل میں جوش پیدا کرنے والا ہو۔ اور اس غرض کے لیئے ضرور ہے کہ اُنکے دل ٹٹولے جائیں اور اُنکے دلوں کو جذب کرنے کے لیئے ایک مقناطیسی کشش بیان میں رکھی جائے "

جس مقناطیسی کشش کا ذکر اس محقق نے ملٹن کے الفاظ کی شرح میں کیا ہے لارڈ مکالے کہتے ہیں کہ وہ خود ملٹن ہی کے بیان میں پائی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یہ جو مشہور ہے کہ شعر میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ عموماً یہ فقرہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔ مگر جب ملٹن کے کلام پر لگایا جاتا ہے تو بہت ہی ٹھیک بیٹھتا ہے۔ اُسکا شعر افسوں کی طرح اثر کرتا ہے۔ حالانکہ بادی النظر میں اُسکے الفاظ میں اوروں کے الفاظ سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتا۔ مگر وہ منتر کے الفاظ ہیں کہ جونہی تلفظ میں آئے فوراً ماضی۔ حال اور دور۔ نزدیک ہو گیا۔ محاسن کی نئی نئی شکلیں موجود ہو گئیں

اور معاً حافظہ کے قبرستان نے اپنے سارے مُردے اُٹھا بٹھائے۔ لیکن جہاں فقرہ کی ترکیب بدلی یا کسی لفظ کی جگہ اُسکا مرادف رکھدیا۔ اُسیوقت سارا اثر کافور ہو گیا۔ جو شخص اُسکے کلام میں ایسی تبدیلی کے بعد وہی طلسم کھڑا کرنا چاہے وہ اپنے تئیں ایسی ہی غلطی میں پائے گا جیسا الف لیلہ میں قاسم نے اپنے تئیں پایا تھا کہ وہ ایک دروازہ پر کھڑا ہوا پکار پکار کر کہہ رہا تھا "کھل گیہوں"، "کھل جو"، مگر دروازہ ہرگز نہ کھلتا تھا جب تک یہ نہ کہا جائے "کھل سِمسِم"8

ملٹن کی تینوں شرطوں کی شرح اگرچہ کسیقدر اوپر بیان ہو چکی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک ابھی اُسمیں کسیقدر اور تشریح کی ضرورت ہے۔

سادگی ایک اضافی امر ہے

سادگی ایک اضافی امر ہے۔ وہی شعر جو ایک حکیم کی نظر میں محض سادہ اور سہل معلوم ہوتا ہے اور جسکے معنی اُسکے ذہن میں بمجرد سننے کے متبادر ہو جاتے ہیں اور جو خوبی اُسمیں شاعر نے رکھی ہے اُسکو فوراً ادراک کر لیتا ہے۔ ایک عامی آدمی اُسکے سمجھنے اور اُسکی خوبی دریافت کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسیطرح ایک عامیانہ شعر جسکو سُن کر ایک پست خیال جاہل اُچھل پڑتا ہے اور وجد کرنے لگتا ہے ایک عالی دماغ حکیم اُسی کو سُن کر ناک چڑھا لیتا ہے اور اُسکو محض ایک سخیف اور رکیک و سبک تُک بندی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا

8 الف لیلہ میں **قاسم** اور **علی بابا** دو نو بھائیوں کے قصہ میں ذکر ہے کہ کسی پہاڑ میں ایک غار تھا۔ قزاق لوگ اِدھر اُدھر سے لوٹ مار کر کے جو لاتے تھے اُسمیں جمع کر دیا کرتے تھے غار کا دروازہ ہمیشہ "کھل سِمسِم" کہنے پر کھل جایا کرتا تھا اور بند ہو سمسم پر بند ہو جاتا تھا۔ ایک بار علی بابا نے چھپ کر قزاقوں کو دروازہ کھولتے اور بند کرتے دیکھ لیا جب وہ چلے گئے تو اُسی ترکیب سے اُسنے دروازہ کھولا اور بہت سا مال و اسباب وہاں سے گدھوں پر لاد کر لے آیا۔ قاسم کو خبر ہوئی تو وہ بھی اُس سے دروازہ کھولنے کا منتر سیکھ کر وہاں پہنچا۔ جب کوئی وہ دروازہ کھولکر اندر جاتا تھا تو کواڑ خود بخود بند ہو جایا کرتے تھے اور پھر اُسی منتر سے کھلتے تھے۔ قاسم اندر گیا تو وہ منتر یاد تھا جب مال لیکر باہر آنا چاہا تو سِمسِم بھول گیا اُسکی جگہ کھل جو یا کھل گیہوں کہنے لگا دروازہ نہ کھلا یہاں تک کہ قزاق آپہنچے اور قاسم کو قتل کر ڈالا ۱۲

ہمارے نزدیک ایسی سادگی پر جو سخافت و رکاکت کے درجہ کو پہنچ جائے سادگی کا اطلاق کرنا گویا سادگی کا نام بدنام کرنا ہے ایسے کلام کو سادہ نہیں بلکہ عامیانہ کلام کہا جائے گا۔ لیکن ایسا کلام جو اعلیٰ و اوسط درجہ کے آدمیوں کے نزدیک سادہ اور سمپل ہو اور ادنیٰ درجہ کے لوگ اُسکی اصل خوبی سمجھنے سے قاصر ہوں ایسے کلام کو سادگی کی حد میں داخل رکھنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ جو عمدہ کلام ایسا صاف و عام فہم ہو کہ اُسکو اعلیٰ سے لیکر ادنےٰ تک ہر طبقہ اور ہر درجے کے لوگ برابر سمجھ سکیں۔ اور اُس سے یکساں لذت اور حظ اُٹھائیں۔ وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اُسکو سادہ اور سمپل کہا جائے۔ مگر کوئی ایسی نظم جسکا ہر شعر عام فہم و خاص پسند ہو خواہ اُسکا لکھنے والا ہومر ہو یا **شکسپیر** نہ آج تک سرانجام ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو **شکسپیر** کے ورکس پر شرحیں لکھنے کی کیوں ضرورت ہوتی۔

ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہو۔ اور الفاظ جہانتک ممکن ہو تحاوُر اور روزمرہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں۔ جسقدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی اُسیقدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی۔ تحاوُر اور روزمرہ کی بول چال سے نہ تو عوام الناس اور سوقیوں کی بول چال مراد ہے اور نہ علما و فضلا کی۔ بلکہ وہ الفاظ و محاورات مراد ہیں جو خاص و عام دونوں کی بول چال میں عامۃ الورود ہیں۔ لیکن اُردو زبان میں سادگی کا ایسا التزام ہر قسم کے کلام میں نبھ نہیں سکتا۔ اگر کچھ نبھ سکتا ہے تو محض عشقیہ غزل یا عشقیہ مثنوی میں جیساکہ میر و **سودا** اور اُنکے اکثر معاصرین اور بعض متاخرین نے خاص ان دو صنفوں میں کیا ہی قصیدہ میں

سودا اور ذوق جیسے مشاق شاعروں سے بھی ایسی سادگی نبھ نہیں سکی میر انیس باوجودیکہ
زبان کی شستگی و صفائی پر نہایت دلدادہ ہیں مگر طرز جدید کے مرثیہ میں انکو بھی کثرت سے عربی و
فارسی الفاظ استعمال کرنے اور ہمیشہ کے لیئے اپنے روزمرہ میں داخل کرنے پڑے ہیں۔ خصوصاً
اس زمانہ میں کہ روز بروز لوگوں کی معلومات اور اطلاع بڑھتی جاتی ہے اور شاعری میں خیالات
جدید اضافہ ہوتے جاتے ہیں جنکے لیئے اردوے معلی میں الفاظ بہم نہیں پہنچتے۔ ممکن نہیں کہ اردو
کے محدود روزمرہ میں ہر قسم کے خیالات ادا کیئے جائیں +

اصلیت سے کیا مراد ہے

اصلیّت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت
نفس الامری پر مبنی ہونا چاہیئے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی
ہو وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو یا
ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اُسکے عندیہ میں فی الواقع موجود ہے۔ نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی
مقصود نہیں ہو کہ بیان میں اصلیت سے سرمو تجاوز نہ ہو۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت
ہونی ضرور ہے۔ اُسپر اگر شاعر نے اپنی طرف سے فی الجملہ کمی بیشی کردی تو کچھ مضایقہ نہیں +

پہلی صورت کی مثال جسمیں شعر کی بنا محض حقایق نفس الامریہ پر ہوا یسی ہو
جیسے شیخ شیرازی بہار کی تعریف میں کہتے ہیں۔

آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب | سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار
باش تا غنچۂ سیراب دہن باز کند | بامداداں چو سر نافۂ آہوے تتار
ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر | ہست چوں عارض گل بوے عرق کردۂ یار

باد بوے سمن آورد و گل و سنبل و بید | در دُکاں بچہ رونق بکشاید عطار
خیری و خطمی و نیلوفر و بستاں افروز | نقشہائے کہ درو خیرہ بماند ابصار
ارغواں ریختہ بر درگہِ خضراے چمن | ہمچنانست کہ بر تختۂ دیبا دینار
ایں ہنوز اولِ آثار جہاں افروز لیست | باش تا خیمہ زند دولتِ نیساں و ابار
شاہدانِ دختر دوشیزۂ باغند ہنوز | باش تا حاملہ گردند بہ الوانِ ثمار

دوسری صورت کی مثال جسمیں شعر کی بنیاد سامعین کے عقیدہ پر رکھی جاتی ہے ایسی ہے جیسے مثلاً میرانیس ماتمِ سید الشہدا میں لکھتے ہیں۔

تھراتے ہیں لوح و قلم و عرش معظم | کرسی پہ یہ صدمہ ہی کہ ہل جاتی ہی ہر دم
باندھی ہیں ملائک کی صفیں حلقۂ ماتم | ڈر ہے نہ اُلٹ جاے کہیں دفترِ عالم
ہاتھوں سے عطارد کے قلم چھوٹ پڑا ہے
ہر فرد پہ اک غم کا فلک ٹوٹ پڑا ہے
مونہ ڈھانپے ہی رونیکے لئے چرخ پہ مہتاب | سر کھولے ہی خورشیدِ فلک چشم ہی پر آب
تاروں پہ بھی طاری ہی غم ایسا کہ نہیں تاب | سیاروں پہ ثابت ہی کہ رحمت ہوئی نایاب
قتلِ پسر سیدِ لولاک کا دن ہے
یہ خاتمۂ پنجتنِ پاک کا دن ہے

تیسری صورت کی مثال جسمیں شاعر محض اپنے عندیہ پر شعر کی بنیاد رکھتا ہے ایسی ہے جیسے شیخ شیرازی معشوق کی طرف خطاب کرکے کہتے ہیں۔

عقلِ من پروانہ گشت و ہم ندید چوں تو شمعے در ہزاراں انجمن

اسی صورت کی دوسری مثال شیراز کی فصلِ بہار کے بیان میں۔

ریح ریحان ست یا بوے بہشت خاکِ شیراز ست یا مشک ختن

چوتھی صورت کی مثال جسمیں سامعین کو یہ معلوم ہو کہ گویا شاعر کے **عندیہ** میں ایسا ہی جسطرح وہ بیان کرتا ہے ایسی ہے جیسے **نظیری** اپنی بڑائی اور زمانہ کی ناقدردانی کے بیان میں کہتا ہے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودے چو مسیح باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ

عرفی اپنی بڑائی اسطرح کرتا ہے۔

سر بزدہ ام بامہ کنعاں ز یکے جیب معشوقِ تماشا طلب و آئینہ گیرم

ایسی خودستائی اور فخر کو **اصلیت** پر مبنی ٹھہرانے سے شاید ناظرین کو بادی النظر میں تعجب ہوگا۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ گو ایسے مضامین مبالغہ سے خالی نہیں ہوتے مگر اُن میں کم و بیش راستی کی جھلک ضرور ہوتی ہے۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ایسے مضامین میں راستی مطلق نہیں ہوتی تو بھی اسمیں کچھ شک نہیں کہ بعض شعرا کے فخر و مباہات میں ایسا جوش ہوتا ہے جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ فی الواقع شعر لکھتے وقت اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتے تھے اور صرف اُنکا ایسا سمجھنا اس بات کے لیے کافی ہے کہ اُنکے فخریہ اشعار کو اصلیت پر مبنی سمجھا جائے کیونکہ اصلیت کے معنی جو کچھ کہ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ شاعر کے بیان کا کوئی منشا یا محکی عنہ نفس الامر میں یا صرف شاعر کے ذہن میں موجود ہو۔

پانچویں صورت کی مثال جسمیں اصلیت پر شاعر نے کسیقدر اضافہ کردیا ہو جیسے شیخ شیرازی ترکان خاتون کرمانی کی مدح میں کہتے ہیں۔

منشور در نواحی و مشہور در جہاں آوازۂ تعبد و خوف و رجاے تو

شکرت مسافراں کہ بہ آفاق می برند گر بر فلک رسد نہ رسد بر عطاے تو

تیغِ مبارزاں نہ کند در دیارِ خصم چنداں اثر کہ ہمتِ کشور کشاے تو

نیز شیخ۔ ابو بکر سعد کی تعریف میں کہتے ہیں۔

بہ تیغ و طعن گرفتند جنگجویاں ملک تو بر و بحر گرفتی بہ عدل و ہمت و راے

دو خصلت اند نگہبانِ ملک و یاور دیں بگوشِ جان تو پندارم ایں دو گفت خداے

یکے۔ کہ گردنِ زور آوراں بقہر بزن دوم۔ کہ از درِ بیچارگاں بلطف درآے

بہ چشمِ عقل مرایں خلق بادشاہانند کہ سایہ بر سرِ ایشاں فگندہ چو ہماے

چونکہ شیخ کے اِن دونو ممدوحوں کا حال معلوم ہے کہ وہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ کسی نہ کسی قدر متصف تھے اسلیے شیخ کے ان مدحیہ اشعار کو اصلیت پر مبنی سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر یہ اوصاف کسی ایسے ممدوح کے حق میں بیان کیے جائیں جو بالکل اُنسے معرا ہو جیساکہ ہمارے شعرا کے قصائد میں عموماً دیکھا جاتا ہے تو کہا جائے گا کہ شعر اصلیت پر مبنی نہیں۔

اِن پانچ صورتوں کے سوا اور کوئی صورت ایسی نہیں نکل سکتی جنمیں شعر کو کھینچ تان کر کسیطرح اصلیت پر مبنی قرار دیا جائے اور ایسے کلام کی ہماری شاعری میں کچھ کمی نہیں ہے نہ صرف متاخرین کے بلکہ متقدمین کے کلام میں بھی ایسی مثالیں دفتر دفتر موجود ہیں۔ یہاں

صرف نمونہ کے طور پر ایک دو مثال لکھی جاتی ہیں۔

(۲)۔ نظیریِ نیشاپوری باوجودیکہ ایک نہایت معقول و سنجیدہ شاعر ہے شاہزادہ مراد کی مدح میں کہتا ہے۔

توئی کہ بودہ و نابودہ جہاں از تست　　سخن درست بگفتیم ہر چہ بادا باد

(۳) عرفی حکیم ابوالفتح کے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے۔

آں سبکسیر کہ چوں گرم عنانش سازی　　از ازل سوے ابد و ز ابد آید بہ ازل

قطرہ کش دم رفتن چکد از پیشانی　　شبنم آسائش نشیند گہ رجعت بہ کفل

جوش سے کیا مراد ہے

جوش سے یہ مراد ہے کہ مضمون ایسے بیساختہ الفاظ اور مؤثر پیرائے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادہ سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اُس سے بندھوایا ہے۔

ایسا جوش شاعر کے ہر قسم کے بیان میں عام اس سے کہ وہ خود اپنی حالت بیان کرے یا دوسرے کی۔ اور خوشی کا بیان کرے یا غم کا۔ اور تعریف کرے یا مذمت۔ یا نہ تعریف کرے نہ مذمت۔ غرضکہ اصناف مضامین میں جو کہ شعر کے پیرایہ میں بیان کیے جا سکتے ہیں پایا جانا ممکن ہے۔ شاعر کی ذات میں ہر چیز سے متاثر ہونے۔ ہر شخص کی خوشی یا غم میں شریک ہونے۔ اور ہر ایک کے جذبات سے متکیف ہو جانے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے۔ وہ بے زبان بلکہ بے جان چیزوں کی حالت اُنکی زبانِ حال سے ایسی بیان کر سکتا ہے کہ اگر اُن میں گویائی ہوتی تو وہ بھی اپنی حالت اُس سے زیادہ بیان نہ کر سکتیں خاقانی نوشیرواں کی بارگاہ

کے اُن کھنڈروں کی زبانِ حال سے جو مدائن میں اُسنے اپنی آنکھ سے دیکھے اُنکی تباہی و بربادی کو اسطرح بیان کرتا ہے۔

ما بارگہِ دادیم۔ ایں رفت ستم بر ما   بر قصرِ ستمگاراں آیا چہ رود خذلان؟

یعنی ہم جو کبھی نوشیرواں کے عدل و انصاف کی بارگاہ تھے جب گردشِ روزگار نے ہمیں اسحال کو پہنچا دیا تو ظالموں کے محلوں پر کیا نوبت گذرتی ہوگی

فردوسی اُس گفتگو کو جو یزدجرد نے سعد وقاص کے ایلچی سے کی تھی اسطرح بیان کرتا ہے

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار   عرب را بجائے رسیدست کار

کہ ملکِ عجم را کنند آرزو   تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

فردوسی نے اسموقع پر جیسا کہ اُسکے بیان سے ظاہر ہے بالکل یزدجرد کا جامہ پہن لیا ہے اور اُسکے غصہ اور جوش کی نقل کو بالکل اصل کر دکھایا ہے۔

جوش سے یہ مراد نہیں ہے کہ مضمون خواہ نخواہ نہایت زوردار اور جوشیلے لفظوں میں ادا کیا جائے ممکن ہے کہ الفاظ نرم ملائم اور دھیمے ہوں۔ مگر انمیں غایت درجہ کا جوش چھپا ہوا ہو۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں

شنیدہ ام سخنے خوش کہ پیرِ کنعاں گفت   فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

میر تقی کہتے ہیں۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا   دلِ ستمزدہ کو ہمنے تھام لیا

مگر ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں اور اس جوش کا پورا پورا اندازہ کرنا اُن لوگوں کا کام ہے جو صاحب ذوق ہیں اور جنپر بے محل ہزاروں آہیں اور نالے اتنا اثر نہیں کرتے جتنا کہ برمحل کسیکا ایک ٹھنڈا سانس بھرنا۔

عبرانی اور عربی شاعری میں سب سے زیادہ جوش تھا

عبرانیوں کی شاعری سب سے زیادہ جوشیلی مانی گئی ہے۔ ایک یوروپین محقق کا قول ہے کہ "عبرانی شاعروں کے کلام میں اسقدر جوش ہے کہ اُنکا شعر سُن کر یہ معلوم ہوتا ہے گویا صحرا میں ایک تناور درخت جل رہا ہے یا ایک شخص پر وحی نازل ہو رہی ہے" عرب کی شاعری بظاہر عبرانی شاعری پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اُسمیں بھی بے انتہا جوش پایا جاتا ہے۔ اسلیئے جیسا کہ یوروپ کے مؤرخ لکھتے ہیں عرب یونانیوں کی شاعری سے نفرت کرتے تھے کیونکہ اُنکو یونانی شاعری اپنی شاعری کے آگے پھیکی۔ ٹھنڈی اور آورد سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یونانیوں کی جتنی کتابیں اُنھوں نے ترجمہ کیں اُنمیں ایک بھی دیوانِ شعر ترجمہ نہیں ہوا۔ وہ **ہومر**۔ **سفوکلیز** اور **پنڈار** کو اپنے شعرا کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر ایک مختصر عربی نظم کا ماحصل اردو میں لکھکر ناظرین کو دکھاتے ہیں تاکہ اُنکو معلوم ہو کہ عرب شعر میں کسقدر جوش ظاہر کرتے تھے۔ مگر چونکہ اردو میں عربی زبان کی خوبی باقی رہنی ناممکن ہے اسلیئے یہ ایک ناقص نمونہ عربی اشعار کا ہوگا۔

بَشَامَہ بن حَزَن **نَہشَلی** جو ایک اسلامی شاعر ہے فخریہ اشعار میں کہتا ہے۔

" ہم نہشل کے پوتے نہشل کے پوتے ہونے پر فخر کرتے ہیں اور نہشل ہمارا دادا ہونے پر فخر کرتا ہے "

" عزت اور برتری کی کسی حد تک گھوڑے دوڑائے جائیں سب سے آگے بڑھنے والے جب پاؤ گے بنی نہشل ہی کے گھوڑے پاؤ گے "

" ہم میں سے کوئی سردار جب تک کہ کوئی لڑکا اپنا جانشین بننے کے لائق نہیں چھوڑ جاتا دنیا سے نہیں اُٹھتا۔ "

" لڑائی کے دن ہم اپنی جانیں سستی کر دیتے ہیں مگر امن کے زمانے میں اگر اُنکی قیمت پوچھے تو انمول ہیں "

" ہماری مانگوں کے بال (عطریات کے استعمال سے) سفید ہیں ہماری دیگیں مہمانوں کے لیے گرم ہیں ہمارا مال ہمارے مقتولوں کے خونبہا کے لیے وقف ہے "

" میں اُس قوم میں سے ہوں جسکے بزرگوں نے دشمنوں کے اتنے کہنے پر کہ " کہاں ہیں قوم کے حمایتی " اپنے کو نیست و نابود کر دیا "

" اگر ہزار میں ہمارا ایک موجود ہو تو بھی جب یہ کہا جائے گا کہ " کون ہے شہسوار " تو اُسکی اپنے ہی پر نگاہ پڑے گی "

" ہمارے لوگوں پر کیسی ہی سخت مصیبت پڑے اُنکو اور نکی طرح اپنے مقتولوں پر روتا نہ پاؤ گے "

" ہم کیسے ہی ہولناک موقعوں میں گھس جاتے ہیں مگر حمیت اور تلواریں جنھوں نے ہم سے قول ہارا ہے ہماری سب مشکلیں آسان کر دیتی ہیں "

عرب کی شاعری میں زیادہ جوش ہونے کا سبب کچھ تو اُنکے گرم خون کی جبلی خاصیت تھی اور زیادہ تر یہ بات تھی کہ اُنکی شاعری کا مدار محض واقعات اور دل کے سچے حالات اور واردات پر تھا۔ عشقیہ اشعار زیادہ تر وہی لوگ کہتے تھے جو فی الواقع کسی کے ساتھ عاشقانہ وابستگی رکھتے تھے۔ رزمیہ اشعار وہی لوگ پڑھتے تھے جو فی الواقع حرب و کارزار کے مرد میدان تھے فخریہ اشعار میں وہ وہی واقعات بیان کرتے تھے جو اُنسے یا اُنکے بزرگوں سے یا اُنکے قبیلہ کے لوگوں سے علی الاعلان ظاہر ہوتے تھے اور جنکے سبب سے اُنکی بہادری یا فیاضی یا فصاحت ضرب المثل ہوجاتی تھی۔ اُن کی مرثیہ گوئی محض تقلیدی نہیں ہوتی تھی بلکہ جس شخص کے دل پر کسی دوست یا عزیز یا بزرگ یا نامور آدمی کی موت سے چوٹ لگتی تھی وہ اُسکا مرثیہ لکھتا تھا اور صحیح صحیح اپنے دل کی واردات کا نقشہ کھینچتا تھا۔ محبت۔ عداوت ہمدردی۔ صبر۔ استقلال۔ غصہ۔ انتقام۔ جوانی۔ بڑھاپا۔ دنیا کی بے ثباتی۔ خدا کی عظمت و جلالت ظالم کی مذمت۔ مظلوم کی فریادرسی۔ صلۂ رحم۔ یا قطع رحم۔ غرضکہ جس مضمون کا جوش اُن کے دلمیں اُٹھتا تھا اُسکو بغیر ساختگی اور تصنع کے بیان کرتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ خلافت عباسیہ کے زمانہ سے یہ سچا جوش کم ہونا شروع ہوا اور آخر کار شعر کے تمام اصناف میں تقلید پھیل گئی شعر بجائے اسکے کہ خود شاعر کے جذبات کا آئینہ ہو وہ قدما کی طرز روش بلکہ اُنھیں کے جذبات کا آئینہ اور اُنھیں کے خیالات کا ارگن بنگیا۔ قدما سچ مچ اپنے اور اپنے بڑوں کے کارہائے نمایاں پر فخر کرتے تھے۔ متاخرین جھوٹی خودستائیاں کرکے اُنکا مونہ چڑانے لگے اور اُسکا نام سنت رکھا۔ قدما سچ مچ کسی نہ کسی اصلی معشوقہ کی محبت میں اپنے دل کے جذبات اور واردات

بیان کرتے تھے اور یہی تے اُنکے ہاں صدہا اصلی نام اُنکی معاشیق کے موجود ہیں جیسے لیلےٰ سلمیٰ سُعاد۔ سُعدیٰ۔ عذرا۔ عزہ۔ خولہ۔ بُثینہ۔ عُنیزہ۔ فاطم۔ زینب وغیرہ وغیرہ۔ مگر متاخرین نے شیر خوار بچوں کیطرح کہ روتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیوں روتے ہیں محض تقلیداً فرضی ناموں سے اُنکی لگا کر اُنکی جدائی اور شوق و آرزو کا دُکھڑا رونا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ عرب سے یہ رنگ ایران میں اور وہاں سے ہندوستان میں پہنچا اور آخر کار مسلمانوں کی شاعری کا حال اُس ویران بستی کا سا ہو گیا جو کبھی آدمیوں سے معمور تھی مگر اب وہاں سُونے مکانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اب ہم چند مثالیں ایسے اشعار کی لکھتے ہیں جنمیں ملٹن کی تینوں شرطیں یا اُنمیں سے ایک یا دو شرط پائی جائے۔ یا بالکل کوئی شرط نہ پائی جائے۔

(۱) ابن یحییٰ بن زیادہ۔ مکروہات دنیوی کو خوشی سے قبول کرنے کے باب میں کہتے ہیں

وَلَمَّا رَأَیْتُ الشَّیْبَ لَاحَ بَیَاضُہٗ ۔۔۔ بِمَفْرِقِ رَأْسِیْ۔ قُلْتُ لِلشَّیْبِ مَرْحَبًا
وَلَوْ خِفْتُ اَنِّیْ اِنْ کَفَفْتُ تَحِیَّتِیْ ۔۔۔ تَنَکَّبَ عَنِّیْ۔ رُمْتُ اَنْ یَتَنَکَّبَا
وَلٰکِنْ اِذَا مَا حَلَّ کُرْہٌ۔ فَسَامَحَتْ ۔۔۔ بِہِ النَّفْسُ یَوْمًا۔ کَانَ لِلْکُرْہِ اَذْھَبَا

یعنی جب میں نے دیکھا کہ بڑھاپا میرے سر کے بالوں میں نمودار ہوا۔ تو میں نے اُسکو خیر مقدم کہا۔ اگر یہ امید ہوتی کہ وہ ایسا نہ کرنیسے ٹل جائے گا۔ تو میں اُسکے ٹالنے میں کوشش کرتا مگر بات یہ ہے کہ مصیبت کے دفع کرنے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ اُسکو بہ کشادہ پیشانی قبول کیا جائے۔

(۲) متمم بن نُویرہ اپنے بھائی مالک کے مرثیہ میں لکھتے ہیں۔

لَقَدْ لَامَنِی عِندَ القبورِ عَلَی البُکَا　　رفیقی لِتَذرافِ الدُّموعِ السوافکِ
فقالَ اتَبکِی کُلَّ قبرٍ رَأیتَہٗ　　لِقبرٍ ثَوَیٰ بَینَ اللِّویٰ والدَّکادِکِ
فقُلتُ لَہٗ اِنَّ الشَّجَا یبعثُ الشَّجَا　　فدعنی فھٰذا کُلُّہٗ قبرُ مالکِ

یعنی میں جو قبرستان کو دیکھکر رونے لگا تو میرے رفیق نے میرے آنسو جاری دیکھکر مجھکو ملامت کی کہ جو قبر (یہاں سے بہت دور) مقام لویٰ اور دکادک کے بیچ میں واقع ہے (یعنی قبر مالک) اُسکے لیئے تو ہر قبر کو دیکھکر رو پڑتا ہے۔ میں نے کہا (اے عزیز) مصیبت مصیبت کو یاد دلاتی ہے بس مجھکو رونے دے میرے نزدیک یہ سب مالک ہی کی قبریں ہیں۔

(۳) **ناصر خسرو** دنیا کی حقیقت بیان کرتا ہے

ناصرِ خسرو براہے میگذشت　　مست ولایعقل نہ چوں میخوارگاں
دید گورے چند و مبرز روبرو　　بانگ برزد گفت کاے نظارگاں
نعمتِ دنیا و نعمت خوارہ بیں　　اینش نعمت اینش نعمت خوارگاں

(۴) **نظامی** مناجات میں کہتے ہیں۔

پردہ برانداز و بروں آے۔ فرد　　درمنم آں پردہ بہم درنورد

(۵) **نظیری** بیت اللہ سے رخصت ہوتے وقت کہتا ہے۔

مطربِ مستم زخلوتگاہ سلطاں آمدہ　　سرخوشِ احساں شدہ با خود بہ الحاں آمدہ

(۶) **خواجہ حافظ** اپنی ایک خاص جدائی حالت کو جس سے بے درد لوگ نامحرم ہیں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں ہائل کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

(۷) **شیخ ابراہیم ذوق** اس بات کو کہ مرنے کے بعد بھی اگر راحت نہ ملی تو دل کو تسلی دینے کی پھر کوئی صورت نہیں یوں بیان کرتے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

(۸) **مرزا غالب** انسان کے لاشئے اور ہیچ ہونے کو اسطرح ادا کرتے ہیں۔

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

(۹) **میر تقی** فرطِ محبت و دلبستگی کی اسطرح تصویر کھینچتے ہیں۔

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے اس طرح کے جینے کو کہانسے جگر آئے

۱۰ **خواجہ میر درد** اپنی شہرت اور مقبولیّت کا محض بے اصل و بے بنیاد ہونا اسطرح ظاہر کرتے ہیں۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے کسلیئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

ان تمام مثالوں میں جیسا کہ ظاہر ہے بیان کی سادگی اصلیت اور جوش تینوں باتیں بوجہ احسن پائی جاتی ہیں۔

(۱۱) **نظیری** اُس حالت کو جب کہ اُسنے سفرِ حج کا ارادہ کیا ہے اور تعلقاتِ دنیوی سے آزاد ہوتے اور خدا کی طرف رجوع کرنے کا شوق اُسکے دلمیں موجزن ہے اسطرح بیان کرتا ہے۔

سگِ آستانم اما ہمہ شب قلادہ خایم کہ سرِ شکار دارم نہ ہوائے پاسبانی

عجب ار نبودہ باشد خضرے بجستجویم کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زلالِ زندگانی

پہلے شعر میں اپنے تئیں بلحاظ اسکے کہ تعلقات میں پھنسا ہوا ہے سگ آستان قرار دیا ہے جو رات بھر اپنے مالک کے مکان کی پاسبانی کرتا ہے مگر بلحاظ اسکے کہ تعلقات کو ترک کرکے رجوع الی اللہ کرنا چاہتا ہے اپنے کو شکاری کُتے سے تشبیہ دی ہے جو رات بھر شکار کے شوق میں اپنے گلے کے پٹے کو چباتا ہے کہ اُسکو کاٹ کر شکار کی تلاش میں جنگل کی راہ لے دوسرے شعر میں اُسنے یہ مضمون ادا کیا ہے کہ انسان جسمیں یہ قابلیت ہی کہ ترقی کرکے ملاًا علے تک پہنچ جائے اُسکا دنیوی تعلقات میں آلودہ رہنا ایسا ہے کہ گویا آب حیات ظلمات میں چھپا ہوا ہے اور چونکہ جاذبۂ لطف الٰہی ہر وقت انسان کی گھات میں ہے کہ اُسکو اپنی طرف کھینچکر تعلقات کے پھندے سے بچات دے اور نیز یہ بھی مشہور ہے کہ خضر سکندر کو ساتھ لیکر آب حیات کی تلاش میں گئے تھے اسلیئے جاذبۂ الٰہی کو خضر سے اور آپ کو آب حیات سے تشبیہ دیکر کہتا ہے کہ تعجب ہے اگر خضر میری تلاش میں نہو کیونکہ میں آب حیات کی طرح ظلمات میں پڑا ہوا ہوں۔

ان دونو شعروں میں اصلیت اور غایت درجہ کا جوش دونو باتیں کمال خوبی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ایسے بلیغ اشعار کی نسبت یہ کہنا بے دردی ہے کہ انمیں کسی چیز کی کسر ہی اور کسی خوبی میں کمی ہے۔ لیکن جو معنی سادگی کے اوپر بیان کیے گئے ہیں اُنکے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اُنمیں سادگی ایسی نہیں پائی جاتی کہ عام اہلِ زبان یا زباں دان اُسکو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

(۱۲) **مومن** اس مضمون کو کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ایک ضروری بات ہے اور اسلیئے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں۔ اسطرح

بیان کرتے ہیں۔

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اس شعر میں اصلیت اور جوش دونو باتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر تیسری چیز یعنی سادگی جس سے الفاظ اور خیال دونو کی سادگی مراد ہے البتہ نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ جب تک یہ جملہ کہ "اہلِ دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے" شعر میں اضافہ نہ کیا جائے۔ عام ذہن معنی مقصود کیطرف انتقال نہیں کر سکتے۔ لیکن اسمیں شاعر نے ایک لطافت رکھی ہے جو سادگی کا نعم البدل ہو سکتی ہے اگر بیان زیادہ صاف ہوتا تو وہ لطافت باقی نہ رہتی۔ اُسنے یہ جملہ گویا قصداً حذف کر دیا ہے اور یہ جتانا چاہتا ہے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اُسکے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں

(۱۳) آتش کہتے ہیں۔

فرصت اکدم عہد طفلی میں نہ رونے سے ملی پرورش پایا ہوا ہوں دامن سیلاب کا

جامۂ تن ہو گیا راہِ عدم میں نذرِ گور بوجھ اُٹھایا تھا اگر ٹھگ کے لیئے اسباب کا

ساحلِ مقصود دیکھا میں نے جاکر گور میں ڈوبنا کشتی تن کو مژدہ تھا پایاب کا

ان تینوں شعروں میں شاید مشکل سے کسی نہ کسی قسم کی اصلیت تو نکل آئے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے نہ بیان میں سادگی ہے نہ جوش۔

(۱۴) نظیری کہتا ہے۔

رہ نداد آنقدرم بر سرِ خوانِ تو فلک کز نمکدانِ تو بر لب زنم انگشت نمک

رستخیزے بکہ شود زیر و زبر وضعِ جہاں چند رختم لبما باشد و بختم بہ سمک

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ خوانِ معرفتِ الٰہی سے مجھکو اتنا بھی حصہ نہ ملا کہ نمکدانی سے نمک تو اُنگلی پر لگا کر چکھ لیتا۔

دوسرے شعر میں وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں باعتبار اپنی قابلیت اور استعداد کے جوہر علوی ہوں مگر بسر النصیب اپنی پستی کے سبب تحت الثریٰ میں پڑا ہوا ہے۔ پس کہتا ہے کہ کاش ایسی رستخیز یعنی انقلاب برپا ہو جس سے جہان زیر و زبر ہو جائے اور بسر النصیب پستی سے بلندی پر پہنچ جائے۔ ان دونو شعروں میں اصلیت اور جوش بخوبی پایا جاتا ہے۔ لیکن طرزِ بیان کسیقدر عام اذہان سے بالاتر ہے۔

(۱۵) آتش کہتے ہیں۔

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں — چلا جب جانور انساں کی چال اُسکا چلن بگڑا
نہیں بے وجہ ہنسنا اسقدر زخمِ شہیداں کا — تری تلوار کا مونہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک — نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

یہ تینوں شعر صاف ہیں مگر انمیں سادگی بیان کے سوا جیسا کہ ظاہر ہے نہ اصلیت ہے نہ جوش۔

(۱۶) ذوق کہتے ہیں۔

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے — جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا
ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

اِن شعروں میں بھی سادگی بیان کے سوا نہ اصلیت ہی نہ جوش۔

اب صرف دو احتمال باقی رہ گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کلام میں صرف جوش پایا جائے اور

سادگی و اصلیت نہ پائی جائے۔ دوسرے یہ کہ سادگی اور جوش پایا جائے اصلیت نہ پائی جائے۔ لیکن جوش کے لیئے اصلیت کا ہونا ایسا ضروری ہے کہ بغیر اسکے ہرگز کلام میں جوش متحقق نہیں ہو سکتا پس یہ دونوں صورتیں ممکن الوقوع نہیں۔

رہا وہ کلام جسمیں نہ سادگی نہ جوش نہ اصلیت تینوں چیزیں نہ پائی جائیں۔ سو ایسے کلام سے ہمارے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں کیونکہ ہماری شاعری زیادہ تر اسی قسم کے مضامین میں منحصر ہے۔ عشقیہ یا مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل مثنوی اور قصائد کی تشبیب میں باندھے جاتے ہیں۔ اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔ سو ان تینوں صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آتے ہیں اور جو بندھتے بندھتے بمنزلہ اصولِ مسلمہ کے ہو گئے ہیں اُنھیں کو ہمیشہ بادنےٰ تغیر باندھتا رہے اور اُنسے سرمو تجاوز نہ کرے مثلاً غزل میں ہمیشہ معشوق کو بے وفا۔ بے مروت۔ بے مہر۔ بے رحم۔ ظالم۔ قاتل۔ صیاد۔ جلاد و ہرجائی۔ اپنے سے نفرت کرنے والا۔ اوروں سے ملنے والا۔ سچی محبت پر یقین نہ لانے والا۔ اہلِ ہوس کو عاشق صادق جاننے والا۔ بدگمان۔ بدخو۔ بدزبان۔ بدچلن۔ غرضکہ ایک حُسن و جمال یا ناز و ادا یا دیگر حرکات مہر انگیز کے سوا اور تمام ایسی برائیوں کے ساتھ اُسکو موصوف کرنا جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اور اپنے تئیں غمزدہ مصیبت زدہ فلک زدہ ضعیف۔ بیمار۔ بدبخت۔ آوارہ۔ بدنام۔ مردودِ خلایق۔ آوارگی پسند۔ بدنامی کا خواہاں حُسن قبول سے نفور۔ خوشی اور عافیت سے کنارہ کرنے والا۔ میخوار۔ بدمست۔ مدہوش۔ خود فراموش و فادار۔ جفاکش۔ کہیں آزاد طبع اور کہیں گرفتاری کا آرزومند۔ کہیں صابر اور کہیں بیقرار

کہیں دیوانہ اور کہیں ہوشیار۔ کہیں غیور اور کہیں چکنا گھڑا۔ رشک کا پتلا۔ رقیبوں کا ش
سارے جہان سے بدگمان۔ آسمان کا شاکی۔ زمین سے نالاں۔ زمانہ کے ہاتھ سے تنگ غرض
ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے تئیں اُن تمام صفات سے متصف کرنا جو عموماً انسان کے
قابل افسوس خیال کیجاتی ہیں۔ یا مثلاً آسمان اور زمانہ یا نصیب اور ستارہ کی شکایت ک
یا زاہد و واعظ و صوفی کو لتاڑنا۔ اور بادہ کش و بادہ فروش اور ساقی و خمار کی تعریف کرنی اور
حُسن عقیدت ظاہر کرنا۔ ایمان و اسلام و زہد و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و معص
سے رغبت ظاہر کرنی۔ کبھی کبھی مال و جاہ و منصب دنیوی کو حقیر ٹھیرانا۔ اور فقر و عشق و آزادگی وغیر
کو علم و عقل و سلطنت وغیرہ پر ترجیح دینی۔ اسیطرح کے اور چند مضامین ہیں جو غزل کے لیے
بمنزلہ ارکان و عناصر کے ہوگئے ہیں۔ غزل کے ساتھ جو الفاظ مخصوص ہیں وہ بھی ایک نہایت
تنگ دائرہ میں محدود ہیں۔ مثلاً معشوق کی صورت کو حور۔ پری۔ چاند۔ سورج۔ گل۔ لالہ۔ باغ
اور جنت وغیرہ سے۔ اُسکی آنکھ کو نرگس۔ آہو۔ بادام۔ ساحر۔ مست۔ بیمار وغیرہ سے۔ زلف کو
سنبل۔ مشک۔ عنبر۔ کافر۔ جادوگر۔ رات۔ ظلمات۔ دام۔ زنجیر۔ کمند وغیرہ سے۔ نگاہ و مژہ و
غمزہ و ادا کو تیر و سناں و شمشیر وغیرہ سے۔ ابرو کو کمان سے۔ ذقن کو کوئیں سے۔ دانتوں کو موتی
سے۔ ہونٹوں کو لعل۔ یاقوت۔ گلبرگ۔ نبات۔ آبحیات وغیرہ سے۔ مونہ کو غنچہ سے۔ کمر کو بال سے
یا دونو کو عدم سے۔ قد کو سرو۔ صنوبر۔ شمشاد۔ قیامت وغیرہ سے۔ رفتار کو فتنہ۔ قیامت
بلا۔ آفت۔ آشوب وغیرہ سے۔ اور اسیطرح اور بعض اعضا کو چند خاص خاص چیزوں سے تشبیہ
دینا۔ معشوق کے سامان آرایش میں سے مشاطہ۔ شانہ۔ آئینہ۔ حنا۔ سرمہ۔ کاجل۔ غازہ۔ مسی

پان۔ کبھی قبا۔ بند قبا۔ کلاہ۔ چیرہ۔ دستار۔ اور کبھی برقع۔ نقاب۔ محرم۔ چادر۔ چوٹی۔ چوڑیاں اور خاص خاص زیوروں کا ذکر کرنا اور اُن کو خاص خاص چیزوں سے تشبیہ دینا۔

باغ میں سے چند چیزوں کو انتخاب کر لینا جیسے سرو۔ قمری۔ گل۔ بلبل۔ صیاد۔ گلچین۔ باغبان۔ آشیانہ۔ قفس۔ دام۔ دانہ۔ یاسمن۔ نسرین۔ نسترن۔ ارغوان۔ سوسن۔ خار۔ گلبن وغیرہ۔

صحرا میں سے وادی۔ چشمہ۔ آبِ رواں۔ سبزہ۔ تشنہ۔ سیراب۔ سراب۔ صرصر۔ گردباد۔ سموم۔ نخل۔ چنار۔ خارِ مغیلاں۔ رہزن۔ رہنما۔ خضر۔ قافلہ۔ جرس۔ آوازِ درا۔ محمل۔ لیلےٰ۔ مجنوں۔ وحشت۔ جنوں وغیرہ

دریا میں سے کشتی۔ ناخدا۔ موج۔ گرداب۔ ساحل۔ حباب۔ قطرہ۔ ماہی۔ نہنگ۔ غوطہ۔ شناوری وغیرہ۔

محفل میں سے شمع۔ پروانہ۔ شراب۔ کباب۔ پیالہ۔ مینا۔ صراحی۔ خُم۔ جرعہ۔ نشّہ۔ خمار۔ صبوحی۔ ساقی۔ دَور۔ نغمہ۔ مطرب۔ چنگ۔ ارغنون۔ مضراب۔ پردہ۔ ساز۔ رقص۔ وجد۔ سماع وغیرہ۔

سامانِ غم میں سے نالہ۔ آہ۔ افغاں۔ قلق۔ اضطراب۔ درد۔ رشک۔ ضبط۔ شوق۔ جدائی۔ یاد۔ تمنا۔ حسرت۔ حرمان۔ رنج۔ غم۔ الم۔ سوز۔ داغ۔ زخم۔ خلش۔ تپش۔ کاہش وغیرہ۔ یہ اور اسی قسم کے چند اَور الفاظ ہیں جن پر بالفعل اُردو زبان کی غزل گوئی کا دارومدار ہے۔

قصیدہ میں بھی صرف چند معمولی سرکلیں ہیں جنمیں ہمیشہ ہمارے شعرا

شبدیزِ فکر کو کاوے دیتے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے زیادہ شاعری کے جوہر دکھانے چاہے تو وہ مدح سے پہلے ایک تمہید لکھتا ہے جسمیں یا تو فصلِ بہار کا ذکر ہوتا ہے (اگرچہ اُسوقت خزاں ہی کا موسم ہو) مگر اُس ذکر میں اس ناپاک دنیا کی فصلِ بہار سے کچھ بحث نہیں ہوتی بلکہ ایک اور عالم سے بحث ہوتی ہے جو عالمِ امکان سے بالاتر ہے **یا** زمانہ۔ آسمان، نصیب اور قسمت کی شکایت ہوتی ہی جسکو درحقیقت خدا کی شکایت سمجھنا چاہیئے جو زمانہ وغیرہ کی آڑمیں خوب دل کھولکر کیجاتی ہی اسمیں بھی شاعر اپنے واقعی مصائب بیان نہیں کرتا اور نہ ممدوح کو اپنے اوپر رحم دلانے کی باتیں کہتا ہے بلکہ جس قسم کے مصائب اگلے زمانہ کے شعرا نے اپنی نسبت بیان کیئے تھے اور جیسے بہتان اُنھوں نے آسمان و زمانہ وغیرہ پر باندھے تھے یہ بھی بہ ادنے تغیر ویسی ہی مصائب بیان کرتا ہے اور اُسی قسم کے بہتان باندھتا ہے **یا** ایک فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف۔ اُسکے جور و ظلم کی شکایت۔ اور اپنے شوق و انتظار کا مسلسل یا غیر مسلسل بیان اسطرح کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عشقیہ مثنویوں یا غزلوں میں ہوتا ہے **یا** فخر و خودستائی میں تمام تمہید ختم کردیجاتی ہے۔

اسکے بعد مدح شروع ہوتی ہے۔ مدح میں اکثر ایک نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کیجاتی ہی کہ اگر بالفرض مداح اس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی؟ عدالت میں ماخوذ ہو جائے تو قصیدہ میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اُسکا جرم ثابت ہوسکے۔ مدح میں زیادہ تر وہی معمولی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعرا باندھتے چلے آتے ہیں اور ہر ایک خوبی کے بیان میں

ایسا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔ ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں اُن سے اصلا تعرض نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے اُنکے ایسی محال باتیں بیان کیجاتی ہیں جو کسی متنفس پر صادق نہ آسکیں۔ ممدوح کی طرف اکثر وہ خوبیاں منسوب کیجاتی ہیں جنکی اضداد اُسکی ذات میں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جاہل کو علم و فضل کے ساتھ ایک ظالم کو عدل و انصاف کے ساتھ۔ ایک احمق اور غافل کو دانشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ ایک عاجز بے دست و پا کو قدرت و مکنت کے ساتھ۔ ایک ایسے شخص کو جسکی ران نے کبھی گھوڑے کی پیٹھ کو مس نہیں کیا شہسواری اور فروسیت کے ساتھ۔ غرضکہ کوئی بات ایسی نہیں بیان کیجاتی جسپر ممدوح فخر کرسکے یا جس سے لوگوں کے دلمیں اُسکی عظمت اور محبت پیدا ہو اور اُسکے محاسن و مآثر زمانہ میں یادگار رہیں۔

ہماری مثنویوں کا یہ حال ہے کہ اُنمیں معمولی حمد و نعت وغیرہ کے بعد اکثر پہلے کسی بادشاہ زادہ یا وزیر زادہ یا امیر زادہ یا سوداگر بچہ کے حسن و جمال وغیرہ کی تعریف ہوتی ہے پھر اُسکو کسی پری یا شاہزادی یا وزیرزادی یا اور کسی کے ساتھ لگا مارا جاتا ہے۔ وہ اول اُسکے فراق میں شہر شہر اور جنگل جنگل مارا مارا پھرتا ہے۔ پھر آخر کار وصل سے کامیاب ہوتا ہے۔ یہ کامیابی ایسی ضروری ہے کہ اُسکی نسبت پہلے ہی سے پیشین گوئی کیجا سکتی ہے۔

جو لوگ فی الواقع مسلم الثبوت شاعر ہیں یا اپنے تئیں ایسا سمجھتے ہیں وہ تو جب مثنوی لکھینگے ضرور اسی قسم کی لکھینگے البتہ جو لوگ اُس درجہ کے شاعر نہیں ہیں اُنکی مثنویاں تاریخی۔ مذہبی یا اخلاقی مضامین پر بھی دیکھی گئی ہیں لیکن اول تو یہ مضامین خود روکھے پھیکے ہوتے ہیں اور پھر اُن کے

لکھنے والے نہ تو بیان میں کچھ گرمی پیدا کرنی چاہتے ہیں اور نہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لہذا ان مثنویوں کو کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ پس ہمارے ہاں وہی مثنویاں رونق پاتی ہیں جن کی بنیاد عشق پر رکھی گئی ہو۔

اگرچہ قصہ کی بُنیاد عشق یا بہادری پر رکھنے کا دستور قدیم سے چلا آتا ہے اور آج کل کے شایستہ قصے بھی جب تک اُنمیں عشق یا بہادری کا رنگ نہیں بھرا جاتا زیادہ مقبول نہیں ہوتے لیکن ہماری مثنویوں میں اور اُنمیں بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارے ہاں جس قسم کے واقعات اول دو چار اُستاد باندھ گئے ہیں اُنھیں واقعات کو بادنےٰ تغیر برابر باندھتے چلے جاتے ہیں۔ بیان کے اسلوب اور تشبیہات اور معشوق کے سراپا اور قصہ کے آغاز و انجام وغیرہ میں زیادہ تر اُنھیں کی تقلید کیجاتی ہے نتیجہ ہمیشہ شُدآمد قدیم کے موافق جدائی کے بعد وصال اور مصیبت کے بعد راحت کا مترتب کیا جاتا ہے۔ طالب و مطلوب کے دل پر جو حالات و واردات ایک دوسرے کی محبت میں فی الواقع گذرتے ہیں یا گذر سکتے ہیں اُنسے بہت کم تعرض کیا جاتا ہے۔ عشقیہ مضامین سے اخلاقی نتایج نکالنے کا کبھی بھولکر بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ بیان میں اثر مطلق نہیں ہوتا کیونکہ شاعر اس خیال سے کہ قدیم مثنویوں سے اپنی مثنوی میں کچھ جدت پیدا کرے ہمہ تن صنائع لفظی کے سرانجام کرنے میں منہمک ہوتا ہے اسلیئے اُسکو کلام میں اثر پیدا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

بخلاف شایستہ ملکوں کے کہ وہاں اکثر ہر قصہ یا مثنوی میں ایک اچھوتی اور نرالی بات پیدا کیجاتی ہے۔ عقل و عادت کے خلاف باتیں جنپر اکثر ہماری مثنویوں کی

قصوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے اُنمیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اُنکے قصے برائے نام فرضی سمجھے جاتے ہیں ورنہ اُنمیں تمام واقعات اور تمام واردات ایسے بیان ہوتے ہیں جو رات دن لوگوں پر گذرتے ہیں اور پھر اُنسے وہ ایسے اخلاقی۔ سوشل یا پولٹکل نتائج نکالتے ہیں جنسے قوم کے خلاق معاشرت یا تمدن پر نہایت عمدہ اثر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی مثنویوں کی طرح اُنکے مطالعے سے صرف عوام الناس اور بازاری لوگ ہی محظوظ نہیں ہوتے بلکہ فضلا و حکما کی سوسائٹی میں بھی اُنکی قدر کیجاتی ہے۔ اُنکے قصوں کا خاتمہ ہمیشہ کامیابی اور خوشی ہی پر نہیں ہوتا۔ بلکہ عادت الٰہی کے موافق کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی پر۔ کبھی خوشی اور کبھی اندوہ و غم پر ہوتا ہے۔

الغرض جب کہ ہماری موجودہ شاعری کا مدار من کل الوجوہ یعنی نہ صرف الفاظ و عبارات میں بلکہ خیالات و مضامین میں بھی محض قوم کی تقلید پر ہے اور جب کہ ہمارے ہاں یہ بات بالاتفاق تسلیم کی گئی ہے کہ "اَحسَنُ الشِّعرِ اَکذَبُہٗ" تو ہمکو اپنی شاعری کی موجودہ حالت میں **اصلیت** اور **جوش** دونو سے دست بردار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اصلیت اور کذب میں منافات ہے اور جوش بغیر اصلیت کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ رہی **سادگی** سو وہ موجودہ حالت میں اکثر بمجبوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ کیونکہ جو معمولی خیالات اور مضامین زیادہ تر ہمارے شعرا کے زیر مشق رہتے ہیں اُلخوف ما سادگی اور صفائی کے ہر اسلوب اور ہر پیرایہ میں ادا کرچکے ہیں اب تا وقتیکہ طرز بیان میں کسیقدر پیچیدگی یا خیال میں کوئی بھونڈا اضافہ یا تبدیلی پیدا نہ کیجائے۔ اُسوقت تک آسانی سے کسی معمولی مضمون میں جدت نہیں دکھائی جاسکتی۔

اگرچہ ہمارے بعض شعرا ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے سادگی بیان کو سب چیز و نسے

مقدم سمجھا ہے۔ جیسے میر درد۔ اثر اور مصحفی وغیرہ۔ لیکن چونکہ اُنھوں نے قدما کے خیالات و مضامین سے بہت کم تجاوز کیا ہے اسلیئے اُنکے دیوان زیادہ تر بھرتی اور پُرگو اشعار سے بھرے ہوئے ہیں **میر** کی نسبت مولانا **آزردہ** دہلوی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" ان لوگوں کو جو اعلےٰ درجہ کا اُستاد مانا گیا ہے اسکا سبب یہی ہے کہ انکے کلام میں وہی معمولی خیالات جو متعدد صدیوں سے برابر بندھتے چلے آتے تھے باوجود غایت درجہ کی سادگی او صفائی کے اکثر جگہ ایسے نرالے اسلوبوں میں بیان ہوئے ہیں جو فی الواقع بے مثل و عدیم النظیر ہیں **میر** کے دیوان میں ایک غزل ہے **خاک میں۔ چاک میں۔ ہلاک میں** مولانا آزردہ کے مکان پر اُنکے چند احباب جنمیں **مومن** اور **شیفتہ** بھی تھے ایک روز جمع تھے **میر** کی اسی غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سبکو یہ خیال ہوا کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے موافق باندھکر دکھائے۔ سب قلم دوات اور کاغذ لیکر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے اُسیوقت ایک اور دوست وارد ہوئے۔ مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں مولانا نے کہا **قل ہو اللہ** کا جواب لکھ رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریبان یا دامن یا دونو کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جسکو قدیم زمانہ سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں ایسے چھیڑے ہوئے

مضمون کو میر نے باوجود غایت درجہ کی سادگی کے ایک ایسے اچھوتے۔ نرلے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اُس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا۔ اس اسلوب میں بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے نیچرل ہے اور باوجود اسکے بالکل انوکھا ہے۔

یہاں تک اُن تین شرطوں کی شرح جنکو **ملٹن** نے شعر کے لئے ضروری قرار دیا ہے یعنی سادگی۔ اصلیت اور جوش ہمارے نزدیک بقدرِ ضرورت بیان ہوگئی ہے **ملٹن** سے پہلے ہمارے قدما نے بھی عمدہ شعر کی تعریف میں کچھ کچھ کہا ہے **اصمعی** نے اُسکی یہ تعریف کی ہے کہ ”اُسکے معنی لفظوں سے پہلے ذہن میں آجائیں“۔ یعنی سریع الفہم ہو گویا **اصمعی** نے **ملٹن** کی تین شرطوں میں سے صرف ایک شرط یعنی سادگی پر شعر کی عمدگی کا مدار رکھا ہے۔ یہ تعریف جامع تو ہے لیکن مانع نہیں ہے۔ یعنی کوئی عمدہ شعر سادگی سے خالی تو نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ جس شعر میں سادگی ہو وہ اعلیٰ درجہ کا بھی ضرور ہو **خلیل** ابن احمد کے نزدیک عمدہ شعر کا معیار یہ ہے کہ سامع کو اُسکے شروع ہوتے ہی معلوم ہو جائے کہ اسکا فلاں قافیہ ہوگا“ یہ تعریف نہ جامع ہے اور نہ مانع۔ ممکن ہے کہ شعر ادنےٰ درجہ کا ہو اور اُسمیں یہ بات پائی جائے اور ممکن ہے کہ شعر اعلےٰ درجہ کا ہو اور اسمیں یہ بات نہ پائی جائے۔ صاحب **عقد الفرید** لکھتے ہیں کہ اس باب میں سب سے بہتر زہیر ابن ابی سلمیٰ کا قول ہے۔

” وَاِنَّ اَحْسَنَ بَیْتٍ اَنْتَ قَائِلُهٗ بَیْتٌ یُقَالُ اِذَا اَنْشَدْتَهٗ صَدَقَا “

(یعنی سب سے بہتر شعر جو تم کہہ سکتے ہو وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں کہ سچ کہا ہے)

اس قول میں بھی گویا ملٹن کی تین شرطوں میں سے صرف ایک شرط یعنی اصلیت کو ضروری بتایا گیا ہے۔ لیکن صرف یہ ایک شرط کافی نہیں ہے اگرچہ اعلیٰ درجہ کے شعر میں یہ خاصیت ہونی ضرور ہے مگر یہ ضرور نہیں کہ جسمیں یہ خاصیت پائی جائے وہ اعلیٰ ہی درجہ کا شعر ہو اس سے زیادہ اور کونسا شعر سچا ہو سکتا ہے۔

"چشمانِ تو زیرِ ابرو انند دندانِ تو جملہ در دہانند"

حالانکہ اسکو ادنےٰ درجہ کا شعر بھی بمشکل کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس باب میں سب سے عمدہ ابن رشیق کا قول ہے وہ کہتے ہیں

"فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا وَاِذَا اُرِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا"

(یعنی جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں) حق یہ ہے کہ ابن رشیق نے جس لطافت اور خوبی سے عمدہ شعر کی تعریف کی ہے اس سے بہتر تصور میں نہیں آ سکتی گویا جس رتبہ اور پایہ کے شعر کی اُسنے تعریف کی ہے اُسی رتبہ اور پایہ کا شعر اُس کی تعریف میں انشا کیا ہے۔

ابن رشیق اور ملٹن کے بیان میں فرق

ابن رشیق اور ملٹن کے بیان میں جو نازک فرق ہے اُسکو غور سے سمجھنا چاہیئے ابن رشیق کی تعریف سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عمدہ شعر کا سرانجام ہونا زیادہ تر حُسن اتفاق پہ موقوف ہے شاعر کے قصد و ارادہ کو اُسمیں چنداں دخل نہیں ہے۔ وہ شاعر کو عمدہ شعر کہنے کا طریقہ نہیں بتاتا۔ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ شاعر کے کونسے شعر کو عمدہ شعر سمجھنا چاہیئے

بخلاف ملٹن کے کہ اُسکے بیان میں دونو پہلو موجود ہیں۔ اُس سے عمدہ شعر کی پہچان اور عمدہ شعر کہنے کی ارکان دونو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ ضرور نہیں ہو کہ ملٹن کی تینوں شرطیں ملحوظ رکھنے سے ہمیشہ ویسے ہی سہل و ممتنع اشعار سر انجام ہونگے جنکا معیار ابن رشیق نے بتایا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جو شاعر اُسکی شرطوں کو ملحوظ رکھیگا اُسکے کلام میں جا بجا وہ بجلیاں کوندتی نظر آئیں گی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جنکو اُستاد ملنا چاہیئے اُنمیں ایک بھی ایسا نہ نکلیگا جسکا تمام کلام اول سے آخر تک حسن و لطافت کے اعلےٰ درجہ پر واقع ہوا ہو۔ کیونکہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہو سکتی ہے جیساکہ وہ خود فرماتا ہے " وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا "۔ شاعر کی معراج کمال یہ ہے کہ اُسکا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اُسمیں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اُسکے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیساکہ اُسکا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات اُسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ہے جسکا کلام سادہ اور نیچرل ہو۔ اگرچہ مقتضائے مقام یہ ہے کہ اس بحث کو زیادہ بسط کے ساتھ بیان کیا جائے اور جسقدر کہ بیان کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک کافی مقدار سے بہت کم ہے۔ لیکن اسوقت بضرورت صرف اسیقدر بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے اگر وقت نے مساعدت کی تو پھر کسی موقع پر اسی بحث کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا جائیگا

یہانتک شعر و شاعری کی حقیقت اور وہ شرطیں جنپر شعر کی خوبی اور شاعر کا کمال منحصر ہے کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کی گئیں۔ اب ہم اپنے ہموطنوں کو جو زمانہ کی رفتار کے موافق شاعری میں ترقی کرنے کا خیال رکھتے ہیں اپنی سمجھ اور راے کے موافق چند مشورے دیتے ہیں۔

زمانہ کی رفتار کے موافق اردو شاعری میں ترقی کیونکر ہو سکتی ہے

ظاہر ہے کہ جن ذریعوں سے ایشیا کی شاعری ہمیشہ ترقی پاتی رہی ہے وہ اُردو کی شاعری کے لیئے فی زماننا مفقود ہیں اور ہرگز امید نہیں ہے کہ کبھی زمانہ آیندہ میں ایسے ذریعے مہیا ہو سکیں بقول شخصے "وہ منڈھی ہی جاتی رہی جہاں اگیت رہتے تھے" یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ قدرتی سرچشمہ جو ہمیشہ ہر قوم کی ترقی کا منبع رہا ہے یعنی سلف ہلپ اور اپنی ذات پر بھروسا کرنا اُسکی سوتیں بھی ہماری قوم میں مدت سے بند ہیں۔ پس ایسی حالت میں اُردو شاعری کی ترقی کا خیال پکانا گویا زمانہ ناساز گار سے مقابلہ کرنا ہے خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ اُردو سے نہایت اعلےٰ اور اشرف زبانوں کی شاعری بھی معرض زوال میں ہو۔ سائنس اُسکی جڑ کاٹ رہا ہو۔ اور سویلزیشن اُسکا طلسم توڑ رہی ہو۔ اور اُسکے جادو کو حرف غلط کی طرح مٹا رہی ہو۔ لیکن چونکہ یاس اور اُمید دو توں حالتوں میں اخیر وقت تک ہاتھ پانو مارنا انسان کا طبعی اقتضا ہے۔ مذبوح کی حرکت اور مدقوق کی امید دم واپسیں تک باقی رہتی ہے اسلیے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اس سے یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہو گا بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کاش ایسا ہوتا۔

شاعری کے لئے [illegible] شرط [illegible]

سب سے پہلے ہم اس بات کی صلاح دیتے ہیں کہ شاعری کے دیوتا کو

قدم رکھنا چاہیئے جسکی فطرت میں یہ ملکہ ودیعت کیا گیا ہو ورنہ تمام کاوش اور تمام کوشش رائگاں جائے گی یوں تو ہر فن اور ہر پیشہ میں کمال حاصل کرنے کے لیئے مناسبت فطری کی ضرورت ہی لیکن شاعری میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اسکی سب سے زیادہ ضرورت ہے جب تک شاعر کی فکر میں اتنی بھی اُپچ نہو جتنی کہ ایک بئے میں گھونسلا بنانے کی اور مکڑی میں جالا پورنے کی ہوتی ہے اُسکو ہرگز مناسب نہیں کہ اس خیال خام میں اپنا وقت ضائع کرے بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اُسکے دماغ میں یہ خلل نہیں ہے۔

شاعری کی ابتدا بعینہ ایسی ہوتی ہے جیسی شطرنج کی ابتدا ہوتی ہے جسکی طبیعت کو شطرنج سے لگاؤ ہوتا ہے اُسکو دو ہی چار دن میں باریک اور گہری چالیں سوجھنے لگتی ہیں اور شطرنج میں اُسکو ایسا مزا آنے لگتا ہے کہ کھانا پینا اور سونا سب بھول جاتا ہے اور روز بروز اُسکی چال بڑھتی جاتی ہے مگر جن کی طبیعت کو اُس سے لگاؤ نہیں ہوتا اُن کا حال اسکے برعکس ہوتا ہے۔ وہ اگر تمام عمر شطرنج کھیلیں اُنکی چال اُس درجہ سے کبھی آگے نہیں بڑھتی جو ابتدائی چند روزہ مشق سے اُنکو حاصل ہوا تھا۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ جن لوگوں کی فطرت میں اسکا ملکہ ہوتا ہے اُنکی طبیعت ابتدا ہی سے راہ دینے لگتی ہے۔ اگر وہ کسیوجہ سے اُسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو طبیعت کا اقتضا اُنکو جبراً اُسکی طرف کھینچکر لاتا ہی وہ جب اُسکی طرف توجہ کرتے ہیں تو اُنکو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوتی ہے اور اسلیئے اُنکا دل روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اُنکو اپنی قوتِ ممیّزہ پر پورا بھروسا ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کی بُرائی اور بھلائی کا بغیر اسکے کہ کسی سے مشورہ یا اصلاح لیں آپ اندازہ کرسکتے ہیں اُنکی

طبیعت میں ہر حالت اور ہر واقعہ سے خواہ وہ حالت اور واقعہ خود اُنپر گذرے ۔ یا زید و عمر پر یا ایک چیونٹی پر۔ متاثر ہونے کی قابلیت ہوتی ہے اور اس قابلیت سے اگر وہ چاہیں تو بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اُنکو خارج سے اپنی شاعری کا مصالح فراہم کرنے کی صرف اُسیقدر ضرورت ہوتی ہے جسقدر کہ بئے کو اپنے گھونسلے کے لیئے پھونس اور تنکوں کے باہر سے لانے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ سلیقہ جو الفاظ و خیالات کی ترتیب و انتخاب کے لیئے درکار ہے وہ اپنی ذات میں اُسیطرح پاتے ہیں جسطرح کہ بیا گھونسلا بنانے کا ہنر اور سلیقہ اپنی ذات میں پاتا ہے۔ وہ اساتذہ کے کلام سے صرف یہی فائدہ نہیں اُٹھاتے کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا یا باندھا ہے اُس سے مطلع ہو جاتے ہیں بلکہ اُنکے ایک ایک مصرع اور ایک ایک لفظ سے بعض اوقات اُنکو وہ سبق حاصل ہوتا ہے جو ایک ناشاعر مہینوں میں کسی اُستاد سے حاصل نہیں کر سکتا پس ہمارے ملک میں جو شاعری کے لیئے ایک اُستاد قرار دینے کا دستور اور اصلاح کے لیئے ہمیشہ اُسکو اپنا کلام دکھانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اِس سے شاگردوں کے حق میں کوئی معتد بہ فائدہ مترتب ہونے کی امید نہیں ہے۔ اُستاد شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے کہ کوئی گریمر کی غلطی بنادے یا کسی عروضی یا لغزی کی اصلاح کر دے لیکن اس سے نفس شعر میں کچھ ترقی نہیں ہو سکتی۔ رہی یہ بات کہ اُستاد شاگرد کے پست کلام کو بلند کر دے یا شاگرد کو اپنا ہمسر بنادے۔ سو یہ امر خود اُستاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے اگر اُستادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسر بنانے کی طاقت ہوتی تو ملّا **نظامی** صاحبزادہ کو یہ نصیحت نہ کرتے " درشعر مپیچ و در فن او * چون اکذب اوست احسن او " ... کاین ختم شدست بر **نظامی** " اور اگر کمال

شاعری کے لئے کسیکا تلمذ اختیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائی۔ نظامی۔ سعدی۔ خسرو اور حافظ کے ضرور ایسے اُستاد نکلتے جن کی شہرت شاگردوں سے زیادہ نہیں تو اُنکے برابر یا اُنسے کمتر تو ہوتی۔

شاعر بننے کے لئے سب سے اول سبق استعداد۔ اور پھر نیچر کا مطالعہ۔ اور اُسکے بعد کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور اُنکے برگزیدہ کلام کا اتباع کرنا۔ اور اگر میسر آئے تو اُن لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونا جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں (عام اس سے کہ شاعر ہوں یا نہوں) صرف اسیقدر کافی ہے اور بس۔ البتہ اُن لوگوں کو جو مستند زبان پر کافی عبور نہیں رکھتے ممکن ہے کہ محاورات کے استعمال میں شبہات واقع ہوں۔ لیکن ان شبہات کا رفع ہونا کسی مشاق و ماہر اُستاد پر موقوف نہیں ہی بلکہ وہ ہر صاحب زبان سے یہانتک کہ ایک دؔدا۔ ایک ماماں۔ ایک کُنجڑن بلکہ ایک حلال خوری سے بھی رفع ہو سکتے ہیں۔

جھوٹ اور مبالغہ سے بچنا

دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ شعر میں جہانتک ممکن ہو حقیقت اور راستی کا سررشتہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہیئے۔ اگرچہ ہمنے جو **اصلیت** کی شرح اور بیان کی ہے اُسمیں دائرۂ بیان کو زیادہ وسیع کر دیا ہے اور اصلیت کے لئے بہت سے پہلو نکالے ہیں لیکن زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ جھوٹ۔ مبالغہ۔ بہتان۔ افترا۔ صریح خوشامد۔ ادعاے بے معنی تعلی بے جا۔ الزام لایعنی۔ شکوۂ بے محل اور اَور اسی قسم کی باتیں جو صدق و راستی کی منافی ہیں اور جو ہماری شاعری کے قوام میں داخل ہو گئی ہیں۔ اُنسے جہانتک ممکن ہو قاطبتہً احتراز کیا جائے یہ سچ ہے کہ ہماری شاعری میں خلفائے عباسیہ کے زمانہ سے لیکر آج تک جھوٹ اور مبالغہ

برابر ترقی کرتا چلا آیا ہے اور شاعر کے لئے جھوٹ بولنا صرف جائز ہی نہیں رکھا گیا بلکہ اسکی شاعری کا زیور سمجھا گیا ہے لیکن ہمیں بھی شک نہیں کہ جب سے ہماری شاعری میں جھوٹ اور مبالغہ داخل ہوا اُسیوقت سے اُسکا تنزل شروع ہوا عرب عربا اور صدر اول کے شعرا جھوٹ سے نہایت نفرت کرتے تھے اور اُسکو عیوب شاعری میں سے سمجھتے تھے زُہیر ابن ابی سلمی جو صدر اول کا شاعر ہے اُسکا قول ہے کہ " احسن القول ما صدقہ الفعل " یعنی سب سے بہتر کلام وہ ہی جسپر کام گواہی دیں۔ اور اسی شاعر کا یہ مشہور شعر ہے۔

" وَاِنَّ اَشْعَرَ بَیْتٍ اَنْتَ قَائِلُہٗ بَیْتٌ یُقَالُ اِذَا اَنْشَدْتَہٗ صَدَقَا "

اُسی زُہیر کی نسبت حضرت عمر فاروق رض کہا کرتے تھے " اِنَّہٗ اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ لِاَنَّہٗ لَایَمْدَحُ اِلَّا مُسْتَحِقًّا " (یعنی وہ افضل ترین شعراء ہے کیونکہ وہ اُسی کی مدح کرتا ہے جو مستحق مدح ہو) ایکبار بنی تمیم نے سلامۃ بن جندل سے جو ایک جاہلی شاعر ہے درخوست کی کہ " مَجِّدْنَا بِشِعْرِکَ " (یعنی تو اپنے مدحیہ اشعار سے ہماری عزت بڑھا) اُسنے کہا " اِفْعَلُوْا حَتّٰی اَقُوْلَ " (یعنی تم کچھ کرکے دکھاؤ تاکہ میں اُسکو بیان کروں)

صاحب عقد الفرید لکھتے ہیں کہ " شعراے عرب اپنی مدح سے ممدوحوں کی عزت بڑھا دیتے تھے اور ہجو سے لوگوں کو ذلیل و رُسوا کر دیتے تھے " اسکا سبب اسکے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ اُنکی واقعی خوبیاں یا واقعی بُرائیاں بیان کرتے تھے ورنہ جھوٹی مدح اور جھوٹی ہجو سے کوئی شخص عزیز یا ذلیل نہیں ہو سکتا۔

معاویہ بن ابی سفیان کہتے ہیں کہ " شعر وہ چیز ہے جسکے پڑھنے سے بخیل

فیاض۔ نامرد و بہادر۔ اور نااہل بیٹا اہل اور فرمانبردار ہو جاتا ہے،، ظاہر ہے کہ اس تعریف کا مصداق اگر کوئی شعر ہو سکتا ہے تو وہی ہو سکتا ہے جو جھوٹ اور مبالغہ سے پاک ہو ابو نواس نے خلیفہ کی مدح میں یہ شعر کہدیا تھا ،، وَاَخَفْتَ اَهْلَ الشِّرْكِ حَتّٰى اِنَّهٗ + لَتَخَافُكَ النُّطَفُ الَّتِیْ لَمْ تُخْلَقِ،،
(یعنی تو نے اہل شرک کو ایسا ڈرایا ہے کہ جو نطفے ہنوز قرار نہیں پائے وہ صلب پدر ہی میں تجھ سے خوف کھاتے ہیں) اس پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ جو نطفے ہنوز قرار نہیں پائے وہ کیونکر خوف کھا سکتے ہیں اور ابو نواس کی طرف سے سوا اسکے کہ بعضوں نے تاویل سے اُسکو صحیح قرار دیا اور کوئی کچھ جواب نہ دے سکا۔

سچا شعر کہنے کی صلاح کچھ اسلیے نہیں دیجاتی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ نہیں بلکہ اسلیے دیجاتی ہے کہ تاثیر جو شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی۔ اِسکے سوا علوم و معارف کی ترقی جو آج کل دنیا میں ہو رہی ہے وہ جھوٹی شاعری کی برباد کرنے والی ہے۔ جن ڈھکوسلوں پر پرانے مذاق کے لوگ ابھی تک سر دُھنتے ہیں کوئی دن جاتا ہے کہ وہ دیوانوں کی بڑ سمجھے جائینگے۔

نیچرل شاعری

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو نیچرل شاعری کا لفظ اکثر لوگوں کی زبان پر جاری ہے اُسکی کسیقدر شرح کیجائے۔ بعض حضرات تو **نیچرل شاعری** اُس شاعری کو سمجھتے ہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو یا جسمیں نیچریوں کے مذہبی خیالات کا بیان ہو۔ بعضے یہ خیال کرتے ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جسمیں خاص مسلمانوں کی یا مطلقاً کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا ذکر کیا جائے۔ مگر نیچرل شاعری سے یہ دونو معنی کچھ علاقہ نہیں رکھتے **نیچرل شاعری** سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونو حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو

لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور اُنکی ترکیب و بندش تا بقدور اُس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جسمیں وہ شعر کہا گیا ہے کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اُس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں پس شعر کا بیان جسقدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اُسیقدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنیً نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کیجائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اسکے خلاف ہوگا وہ اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ مثلاً

" کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی ہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی "

" رہی کوئی اُنگلی کو دانتوں میں داب کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب "

ان دونو شعروں کو نیچرل کہا جائے گا کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے وہاں ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ یا مثلاً

" رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ جسطرح آشنا سے کرے آشنا صلاح "

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے اسیطرح مشورہ کیا کرتا ہے یا مثلاً

ترے رخسار و گیسو سے بتا تشبیہ دوں کیونکر نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہی سنبل میں بو ایسی

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بو معشوق کے رنگ و بو سے بہتر یا اُسکے برابر نہیں معلوم ہوتی یا مثلاً

مومن

" تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا "

یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا کیونکہ جس سے تعلقِ خاطر بڑھجاتا ہے اُسکا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً

داغ

" طبیعت کوئی دن میں بھر جائیگی چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی "

" رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں یہ نیّت کوئی آج بھر جائے گی "

ن دونو شعروں کا مضمون گو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتا ہے۔ مگر دونو اپنی اپنی جگہ نیچر کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا و ہوس کا بھوت بڑے زور و شور کے ساتھ سر پر چڑھتا ہے مگر بہت جلد اُتر جاتا ہے اور فی الواقع دنیا کی خواہشوں سے کبھی نیّت سیر نہیں ہوتی۔ یا مثلاً

غالب

" رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹجاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہو گئیں "

شعر بھی نیچرل ہے۔ وفطرتِ انسانی کی کسقدر گہری اور پوشیدہ خاصیّت کا پتا دیتا ہے جسکے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اُس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے ایسے ہیں جنکو لفظاً اور معنیً دونو حیثیتوں سے نیچرل ماننا چاہیئے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں جنکو لفظاً یا معنیً یا دونو حیثیتوں سے نیچرل نہیں کہا جا سکتا مثلاً۔

ناسخ

" کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی ہے یادِ مژہ دلکو کبھی ہیں خار پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں "

اس شعر کو صرف لفظاً نیچرل کہا جا سکتا ہے لیکن معنیً نہیں کہا جا سکتا۔ معشوق کے تصور سے بیشُبہہ عاشق کو فرحت بھی ہو سکتی ہے اور رنج بھی۔ لیکن جب فرحت ہو تو عارض اور مژگان

دونوں کے تصور سے فرحت ہونی چاہیئے۔ اور جب رنج ہو تو دونو کے تصور سے رنج ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پلکیں جو خار سے مشابہ ہیں اُنکے تصور سے پہلو میں خار رہوں اور عارض جو گل سے مشابہ ہے اُسکے تصور سے پہلو میں گلزار ہو۔ یا مثلاً

غالب

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

جوہر اندیشہ میں کیسی ہی گرمی ہو یہ کسیطرح ممکن نہیں کہ اُسمیں صحرا نوردی کا خیال آنے سے خود صحرا جل اُٹھے۔ یا مثلاً

امیر

کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گل سے کوئی پھول　　آتشِ گل سے پڑے چھالے تمھارے ہاتھ میں

نزاکت کسی درجہ کی کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ آتشِ گل یعنی خود گل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں۔ یا مثلاً

ذوق

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سردمہری کا تری　　بیشتر ہوتا ہے پیدا وھاں شجر کافور کا

سردمہری میں اتنی ہی ٹھنڈک ہو سکتی ہے جتنی کہ لفظ **سرد** میں۔ پھر اُسکے کشتہ کی خاک میں اتنا اثر ہونا کہ اُس سے شجرِ کافور پیدا ہو۔ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں جنمیں معنی کا بالکل نام و نشاں نہیں۔

ہر زبان میں **نیچرل شاعری** ہمیشہ قدما کے حصہ میں رہی ہے۔ مگر قدما کے اول طبقہ میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اُنھیں کا دوسرا طبقہ اُسکو سڈول بناتا ہے اور سانچے میں ڈھالکر اُسکو خوشنما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے مگر اُسکی نیچرل حالت کو اس خوشنمائی اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ انکے بعد متاخرین

کا دورہ شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں رکھتے اور خیالات کے
اُسی دائرہ میں محدود رہتے ہیں جو قدما نے ظاہر کیئے تھے اور نیچر کے اُس منظر سے جو قدما
کے پیش نظر تھا آنکھ اُٹھاکر دوسری طرف نہیں دیکھتے تو اُنکی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل حالت
سے تنزل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہ راست سے بہت دور جا پڑتے ہیں اسکی مثال
ایسی سمجھنی چاہیئے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم۔ کچے اور الونے ماش یا مونگ
پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ اُنھیں پانی میں اُبالکر اور نمک ڈالکر لوگوں کو کھلایا۔ اُنھوں
نے اپنی معمولی غذا سے اسکو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلواکر اور
دال کو دھوکر اور مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال
ہی کے پکانے میں اپنی اُستادی ظاہر کرنی چاہتا ہے اسکے سوا اور کوئی موقع تنوع پیدا کرنے
کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈالکر لوگوں کو اپنی چٹ
پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے۔

اِسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دلنشین کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو
کہ فارسی زبان میں جس پر اُردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اول غزل لکھی ہوگی
ضرور ہے کہ اُنھوں نے عشق و محبت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادے طور
پر معشوق کی صورت۔ حسن و جمال نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا۔ اُنکے بعد لوگوں نے
انھیں باتوں کو مجاز اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان کیا۔ مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ و ناز و ادا کو
مجازاً تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا اور اِس جدت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و بامزہ ہوگیا

متاخرین جب اسی مضمون پر پل پڑے اور اُنکو قدما کے استعارہ سے بہتر کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا اور جدت پیدا کرنے کا خیال دامنگیر ہوا اُنھوں نے تیغ و شمشیر کے مجازی معنوں سے قطع نظر کی اور اُس سے خاص سروہی یا اصیل تلوار مراد لینے لگے جو قبضہ۔ باڑ۔ پیپلا۔ آب اور تاب اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے۔ میان میں رہتی ہے۔ گلے میں حمائل کیجاتی ہے۔ زخمی کرتی ہے۔ ٹکڑے اڑاتی ہے۔ سر اتارتی ہے۔ خون بہاتی ہے۔ جو رنگ کاٹتی ہے اُسکی دھار تیز بھی ہو سکتی ہے اور کُند بھی۔ قاتل کا ہاتھ اُسکے مارنے سے تھک سکتا ہے وہ قاتل کے ہاتھ سے چھوٹکر گر سکتی ہے اُسکے مقتول کا مقدمہ عدالت میں دائر ہو سکتا ہے اُسکا قصاص لیا جا سکتا ہے اُسکے وارثوں کو خون بہا دیا جا سکتا ہے۔ غرضکہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں ہو سکتے ہیں وہ سب اُسکے لیئے ثابت کرنے لگے۔

یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہو جانے کو مجازاً دل دادن یا دل باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا رفتہ رفتہ متاخرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ سے چھینا جا سکتا ہے۔ واپس لیا جا سکتا ہے۔ کھویا اور پایا جا سکتا ہے۔ کبھی اُسکی قیمت پر تکرار ہوتی ہے۔ سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے۔ ورنہ نہیں دیا جاتا کبھی اُسکو معشوق عاشق سے لیکر کسی طاق میں ڈالکر بھول جاتا ہے۔ اتفاقاً وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہ آنکھ بچاکر وہاں سے اڑا لاتا ہے پھر معشوق کے ہاں اُسکی ڈھنڈیا پڑتی ہے اور عاشق اُسکی رسید نہیں دیتا۔ کبھی وہ یاروں کے جلسہ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ سارا گھر چھان مارتے ہیں کہیں پتا نہیں لگتا۔ اتفاقاً معشوق جو

بالوں میں کنگھی کرتا ہے تو وہ جوں کیطرح جھڑ پڑتا ہے۔ کبھی وہ ایسا تلپٹ ہو جاتا ہے کہ زلفِ یار کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اُسکی تلاش کیجاتی ہے۔ مگر کہیں کچھ سراغ نہیں ملتا کبھی وہ مبیع بالخیار کے قاعدے سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے کہ پسند آئے تو رکھنا ورنہ پھیر دینا۔ اور کبھی اُسکا نیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے وہی لیجائے۔

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اسلیئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے مجازاً صیاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اُسپر تمام احکام حقیقی صیاد کے مترتب کر دیئے۔ اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے۔ کہیں اُسکو تیر مار کر گراتا ہے۔ کہیں اُنکو زندہ پنجرے میں بند کرتا ہے کہیں اُنکے پر نوچتا ہے کہیں اُنکو ذبح کر کے زمین پر تڑپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر کمان لگا کر جنگل کیطرف جا نکلتا ہے۔ تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اُس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سیکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا۔ بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں اور لوؤں اور بٹیروں کے اُس کے دروازہ پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے چڑی مار اُسکے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشق الٰہی یا محبت روحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ مجازاً شراب کے نشہ سے تعبیر کیا تھا اور اس مناسبت سے جام و صراحی۔ خُم و پیمانہ اور ساقی و میفروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کیئے تھے یا بعض شعرائے متصوفین نے شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اس دار الغرور کے تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ البال کرنے والی ہے بطور تفاول کے موصل الی المطلوب قرار دیا تھا رفتہ رفتہ وہ اور اُسکے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشاعرہ

بلا مبالغہ کلاں کی دکان بنگئی۔ ایک کہتا ہے لا۔ دوسرا کہتا ہے اور لا۔ تیسرا کہتا ہے پیالہ نہیں تو اوک ہی سے پلا۔ کچھ بہکتے ہیں اور کچھ بکار رہے ہیں کوئی واعظ پر پھبتی کہتا ہے کوئی زاہد کی ڈاڑھی پر ہاتھ لپکاتا ہے۔ کوئی شیخ کی پگڑی اچھالتا ہے۔ جوان اور بوڑھے جاہل اور عالم، رند اور پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جو ہے سو نشہ کے خمار میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جدھر دیکھو العطش العطش کی پکار ہے۔

یا مثلاً قدما نے لاغری بدن کو اندوہ عشق یا صدمۂ جدائی کا ایک لازمی نتیجہ سمجھکر اُسکو کسی موثر طریقہ سے بیان کیا تھا۔ متاخرین نے رفتہ رفتہ اُسکی نوبت یہانتک پہنچادی کہ فراش جھاڑو دیتا ہے تو خس و خاشاک کے ساتھ عاشق زار کو بھی سمیٹ لیجاتا ہے۔ معشوق جب صبح کو اُٹھتا ہے تو عاشق کو لاغری کے سبب بستر پر نہیں پاتا۔ لاچار بچھونا جھاڑ کر دیکھتا ہے تاکہ زمین پر کچھ گرتا ہوا معلوم ہو۔ عاشق کو موت ڈھونڈھتی پھرتی ہے مگر لاغری کے سبب وہ اُسکو کہیں نظر نہیں آتا۔ میدانِ قیامت میں فرشتے چاروں طرف ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور قاضی یوم الحساب منتظر بیٹھا ہے مگر عاشق کا لاغری کے سبب کہیں پتا نہیں ملتا۔

اسیطرح متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندھ گئے تھے نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچادیا۔ معشوق کے دہانہ کو تنگ کرتے کرتے صفحۂ روزگار سے یکقلم مٹادیا۔ کمر کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کردیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمرِ خضر سے بھی بڑھادیا۔ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بدگمان بنگئے۔ جدائی کی رات کو

طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا۔ الغرض جب پچھلے اُنھیں مضامین کو جو اگلے باندھ گئے ہیں اوڑھنا اور بچھونا بنا لیتے ہیں تو اُنکو مجبور نیچرل شاعری سے دست بردار ہونا اور سہل کا سہل بنانا پڑتا ہے۔

اس بات کے زیادہ ذہن نشین کرنیکے لیئے (کہ شاعری کا آغاز کس حالت میں ہوتا ہے اور پھر قدما کا دوسرا طبقہ اُسکو کسطرح اُسی نیچرل حالت میں درست کرتا ہے اور اُنکے بعد متاخرین اُسکو کیا چیز بنا دیتے ہیں) اُردو شعرا کے ہر ہر طبقہ کے کلام میں سے کچھ کچھ مثالیں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی مثال ۔ شاہ آبرو جو اُردو شعرا کے سب سے پہلے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں وہ اُس کیفیت کو جو معشوق کے دیکھنے سے عاشق کے دلمیں پیدا ہوتی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

نَین سیں نَین جب ملائے گیا　　دل کے اندر مرے سمائے گیا
نگہِ گرم سیں مرے دل میں　　خوش نَین آگ سی لگائے گیا

مرزا رفیع **سودا** جنکو دوسرے طبقہ میں شمار کرنا چاہیئے وہ اسی کیفیت کو اسطرح بیان کرتے ہیں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ　　کیا جانئے تونے اُسے کس آن میں دیکھا

میر تقی جو مرزا رفیع کے معاصر ہیں وہ اسی کیفیت کو یوں ادا کرتے ہیں۔

نہیں ہی چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر　　کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آوے

خواجہ حیدر علی **آتش** جنکو چوتھے یا پانچویں طبقہ میں سمجھا گیا ہے وہ اسی کیفیت کو یوں

بیان فرماتے ہیں۔

تختہ نردِ عشق دل کھیلا جو حسنِ یار سے چھُٹ گئے ایسے مرے چھکے کہ ششدر ہوگیا

دوسری مثال۔ شاہ آبرو اُس طول مدت کو جو مفارقت کے زمانہ میں عاشق کو محسوس ہوتا ہے اسطرح بیان کرتے ہیں۔

جدائی کے زمانہ کی سجن کیا زیادتی کہیئے کہ اس ظالم کی جو ہمپر گھڑی گذری سو جُگ بیتا

اسی مضمون کو میر نے یوں ادا کیا ہے

ہر آن ہمکو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ

ناسخ جو پانچویں طبقہ میں ہیں وہ اس مضمون کو یوں باندھتے ہیں۔

جاے کافورِ سحر چاہیئے کافورِ حنوط یہ شبِ ہجر ہے یاروشبِ یجور نہیں

یعنی شبِ ہجر جب تک ہماری جان نہ لیگی ٹلنے والی نہیں ہے۔ پس کافورِ سحر کی توقع رکھنی عبث ہی بلکہ اسکی جگہ کافورِ حنوط غسلِ میت کے لیئے درکار ہے۔ اگرچہ مضمون کے لحاظ سے تینوں شعروں کو نیچرل کہا جاسکتا ہے کیونکہ شوق و انتظار کیحالت میں ممکن ہے کہ عاشق کو ایک ایک گھڑی جُگ اور ایک ایک آن برس کے برابر معلوم ہو اور ممکن ہے کہ عاشق طولِ شبِ فراق سے تنگ آکر جینے سے مایوس ہو جائے۔ مگر ناسخ کی طرزِ بیان اردو کی معمولی بول چال سے اسقدر بعید ہی کہ اُسکو کسیطرح نیچرل بیان نہیں کہا جاسکتا۔

تیسری مثال شاہ حاتم جو پہلے طبقہ میں شمار کیئے گئے ہیں وہ دوست کے ملنے کی آرزو اور اُسکے دیکھنے کے شوق کو اسطرح بیان کرتے ہیں۔

زندگی درد سر ہوئی حاتم کب ملے گا مجھے پیا میرا

اسی مضمون کو میر نے یوں باندھا ہے۔

وصل اُس کا خدا نصیب کرے میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

سودا یوں کہتے ہیں۔

دل کو یہ آرزو ہے صبا کوے یار میں ہمراہ تیرے پہنچئے مل کر غبار میں

منشی امیر احمد صاحب امیر جو موجودہ طبقہ کے مشہور شاعر ہیں وہ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

واکردہ چشم دل صفتِ نقش پا ہوں میں ہر رہ گذر میں راہ تری دیکھتا ہوں میں

اس مثال میں بھی تینوں شعروں کو اگرچہ خیال کے لحاظ سے نیچرل کہا جا سکتا ہے مگر اخیر شعر کے بیان میں بمقابلہ حاتم اور میر و مرزا کے صاف تصنع اور ساختگی پائی جاتی ہے اور بیان نیچرل نہیں رہا۔ اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو اس سے بہت زیادہ صریح اور صاف مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔

اوپر کے بیان سے یہ ہرگز سمجھنا نہیں چاہئیے کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ اَن نیچرل ہوتی ہے نہیں بلکہ ممکن ہے کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو قدما کی جولانگاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں۔ یا اُسی جولانگاہ کو کسیقدر وسعت دیں۔ یا زبان میں بہ نسبت متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت اور صفائی پیدا کر سکیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی ہے اور نواب مرزا

شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔ اسیطرح **دلی** میں **ذوق۔ ظفر** اور خاصکر **داغ** نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے جیسا کہ ہم آگے چلکر کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔

زبان اُردو کو درستی اور صفائی سے استعمال کرنا

تیسری بات زبان اُردو کو درستی اور صفائی کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔ اگرچہ اُردو کم وبیش تمام اطراف ہندوستان میں متداول ہو لیکن ممکن ہے کہ بعض ممالک کے باشندے اپنی خاص زبان میں بہ نسبت اُردو زبان کے زیادہ آسانی سے شعر سرانجام کرسکیں۔

پس اگر ہمارے ہموطنوں میں کوئی شخص اپنی خاص زبان میں شعر کہنا چاہے تو اِس سے بہتر کوئی بات نہیں ہو۔ کیونکہ مادری زبان سے بہتر اور سہلتر کوئی آلہ اظہار خیالات کا نہیں ہوسکتا۔ **لارڈ مکالے** کا قول ہے کہ "کوئی عمدہ کلام جو خیالات کا مجموعہ ہو کبھی کسی شخص نے سرانجام نہیں کیا مگر ایسی زبان میں جسکی نسبت اُسکو مطلق یاد نہ ہو کہ کب سیکھی اور کیونکر سیکھی اور جسکی گریمر جاننے سے پہلے وہ ایک مدت تک اُسمیں گفت گو کرتا رہا" وہ لکھتے ہیں کہ "روما کے بڑے بڑے لایق آدمیوں نے فرانسیسی زبان میں اشعار لکھے مگر اُنمیں سے کوئی شعر صفحۂ روزگار پر یادگار نہ رہا۔ انگلستان کے بہت سے خوش فکر اور طباع آدمیوں نے لاطینی میں دیوان مرتب کیئے مگر اُنمیں سے ایک دیوان بھی یہانتک کہ ملٹن کا دیوان بھی شاعری کے لحاظ سے اول درجہ کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ دوسرے درجہ میں بھی کچھ امتیاز نہیں رکھتا" پس جبکہ بلکہ شاعری ایک فطری اور جبلی چیز ہے۔ اسیطرح اُسکو کام میں لانے کے لیئے ایسے آلہ کا استعمال

زیادہ مناسب ہوگا جو بمنزلہ فطری اور جبلی چیز و نکے ہو اور وہ مادری زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔

لیکن چونکہ اُردو زبان ہندوستان کی اور تمام زندہ زبانوں کی نسبت بالاتفاق زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لایق ہے۔ تمام اطراف ہندوستان میں عموماً بولی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اُسی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے اور جہانتک ممکن ہو اُسیکو ترقی دیجائے۔ نیز اُسکا حاصل کرنا اور اُسمیں کافی مہارت بہم پہنچانی ہندوستان کے باشندوں کو اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ اور غیر مادری زبانوں میں دشوار ہوتی ہے۔

اسکے سوا ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں بالفعل کوئی زبان ایسی نہیں معلوم ہوتی جسمیں اُردو کے برابر شعر کا ذخیرہ موجود ہو۔ اسلیئے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہموطنوں میں جو شخص شعر کہنا اختیار کرے وہ اُردو ہی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ قرار دے۔

ہندوستان میں جیسا کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہانکی اُردو معتبر سمجھی جاتی ہے **دلّی** اور **لکھنؤ**۔ **دلّی** کی زبان اسلیئے ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے کہ اُردو کا حدوث اور نشو و نما اسی خطہ میں ہوا ہے۔ **لکھنؤ** کی زبان کو اسواسطے مستند مانا جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتدا سے شرفاے دہلی کے بے شمار خاندان ایک مدت دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیئے وہیں رہ پڑے۔ پس ہندوستان کے کسی

شہر کو اہل دہلی سے اسقدر میل جول کا موقع نہیں ملا جسقدر کہ لکھنؤ کو ملا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں شہروں کی زبان میں ایک خاص مماثلت پیدا ہو گئی ہے۔ اور خاص خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونوں جگہ کی بول چال اور لب و لہجہ میں کوئی معتد بہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

کوئی زبان تمام ملک میں یکساں طور پر اُسوقت تک شائع نہیں ہو سکتی جبتک کہ مندرجہ ذیل ذریعے ملک میں مہیا نہ ہوں۔ ۱۔ اُس زبان کی معتبر اور جامع ڈکشنری کا تیار ہونا ۲۔ اُسکی جامع گرمر کا مرتب ہونا ۳۔ اُسمیں کثرت سے نظم و نثر کی کتابوں کا تصنیف و تالیف ہو کر شائع ہونا۔ ۴۔ اُس زبان کے اخبارات و رسائل کا تمام اطراف و جوانب ملک میں اشاعت پانا ظاہر ہے کہ نہ آجتک اُردو کی کوئی جامع اور مستند ڈکشنری تیار ہوئی ہے اور نہ اُسکی کوئی ایسی گرمر لکھی گئی ہے جس سے زبان کے سیکھنے میں کافی مدد ملنے کی امید ہو۔ اُردو میں تصنیف و تالیف کا رواج اور اخبارات وغیرہ کی اشاعت زیادہ تر بیس پچیس برس سے ہوئی ہے اور اسقدر قلیل مدت زبان کی ترویج کے لیئے کافی نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اُردو لٹریچر کی جسقدر اشاعت ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے اُسیقدر اردو زبان کی تحریر اور نظم و نثر لکھنے کا سلیقہ اطراف ہندوستان میں عموماً بڑھتا جاتا ہے لیکن شاعرانہ خیالات اور خاصکر نیچرل شاعری کے فرائض ٹکسالی زبان میں ادا کرنے کے لیئے ایسے محدود ذریعے شاید کافی نہ ہوں اگرچہ ایک جامع اور مستند ڈکشنری بھی اگر کوئی ہو اس مقصد کے پورا کرنے میں بہت کچھ مدد پہنچا سکتی ہے۔ مگر اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور اُنکی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ اُنکے الفاظ

ومحاورات بقدر معتدبہ نامعلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں۔ لیکن چونکہ ایسا موقع ہر شخص کو ملنا دشوار ہے اسلیئے ضرور ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جسقدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے نہ اس ارادہ سے کہ خیالات اور مضامین میں اُنکی تقلید کیجائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کسطرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔

ابن خلدون کہتے ہیں کہ "ایک عجمی فصحاے عرب کے کلام کی ممارست سے اہل زبان میں شمار کرنیکے لایق ہو سکتا ہے" پس ہندوستان کے باشندے اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اہل زبان کے کلام کی مزاولت سے مثل اہل زبان کے سمجھے جائیں۔ اگرچہ دلّی کے بہت سے عمدہ شاعروں کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ جیسے خواجہ میر اثر شاہ نصیر۔ میر ممنون معروف۔ عارف وغیرہ۔ حالانکہ ان بزرگواروں کے مبسوط اور ضخیم دیوان موجود ہیں۔ لکھنؤ میں بھی کچھ عجب نہیں کہ وہاں کے بعض مستند لوگوں کا کلام شائع نہوا ہو۔ لیکن جن لوگوں کے دیوان اور کلیات شائع ہو چکے ہیں اُنکی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے اور اُنمیں سے خاصکر میر۔ سودا۔ درد۔ جرأت۔ انشا۔ مصحفی۔ میر حسن۔ ناسخ۔ آتش وزیر۔ غالب۔ ذوق۔ ظفر۔ شیفتہ۔ داغ۔ سالک۔ شوق[۵]۔ رند۔ اسیر۔ برق۔ امیر وغیرہم کا ہر قسم کا کلام خواہ غزل ہو خواہ مثنوی خواہ قصیدہ خواہ قطعہ و رباعی خواہ واسوخت سب دیکھنا چاہیئے۔ اور سب سے زیادہ اہم اور ضروری خلیق۔ ضمیر۔ انیس۔ دبیر اور

[۵] شوق سے مراد نواب مرزا لکھنوی ہے۔ جس کی بہار عشق و زہر عشق وغیرہ مثنویاں مشہور ہیں ۱۲

مونس وغیرہم کے مرثیوں کا مطالعہ ہی۔ اگرچہ بعضے دیوان اور مثنویاں جنکا اوپر ذکر کیا گیا سراسر لغو خیالات اور بیہودہ مضامین سے بھری ہوئی ہیں لیکن جو لوگ محض زبان سے غرض رکھتے ہیں اُنکو خیالات کی لغویت اور مضامین کی بیہودگی سے چشم پوشی اور اغماض کرنا چاہیئے اور نہایت صبر وتحمل کے ساتھ الفاظ ومحاورات اور طرز ادا اور انداز بیان پر ہمت مقصور رکھنی اور خُذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کرنا چاہیئے۔ نظم کے علاوہ اُردو لٹریچر میں جسقدر علمی۔ تاریخی۔ مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مستند اہل زبان نے کتابیں لکھی ہیں اُنسے بھی فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

جو لوگ اپنے تئیں اُردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ اُنکو اس بات پر فخر کرنا نہیں چاہیئے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں۔ اور ہمارے روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے اُنکو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لینگے۔ اُسکے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائینگے۔ اُسکے الفاظ ومحاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کرینگے اور اُسکی نظم ونثر کو زمانہ کے مذاق کے موافق ترقی نہ دینگے تو اُنکی زبان کا وہ حصہ جسپر اُنکو فخر ہے اور جو اُنکی اور تمام ہندوستان کی اُردو میں مابہ الامتیاز ہے وہ حرف غلط کی طرح صفحہ روزگار سے محو ہوجائے گا۔ اور یہی بُری بھلی اُردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعے سے ملک میں پھیل رہی ہے اور جسکو وہ ابتک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں یہی۔ ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پاجائے گی۔ کیا اُنکو معلوم نہیں ہی کہ عرب میں جب سے شعر وانشا کی سرد بازاری ہوئی اور عربی نظم ونثر کے مالک غیر

ملکوں کے باشندے ہوگئے رفتہ رفتہ وہ کلیسکل عربی جسپر عربوں کو ناز تھا لٹریری دنیا سے رخصت ہوگئی اور وہی بیجھڑی زبان جسکو عرب عربا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تمام عربی لٹریچر پر چھا گئی اور شام و روم و مصر و بربر و سودان وغیرہ میں عموماً پھیل گئی یہاں تک کہ آج وہی زبان ٹکسالی اور فصیح عربی سمجھی جاتی ہے۔ ایسا ہی انجام **دلی** اور **لکھنؤ** کی زبان کا اگر اُسکی جلد خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔ دلی جسکو اُردوے معلی کا مسقط الراس اور جنم بھوم کہنا چاہیئے وہاں مصنف اور ناظم و ناثر پیدا ہونے موقوف ہوگئے ہیں۔ پرانے لوگوں میں سے چند نفوس جنکو چراغ سحری سمجھنا چاہیئے باقی رہ گئے ہیں اُنکے بعد بالکل سناٹا نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری کا چرچا دلی سے بہت زیادہ سننے میں آتا ہے۔ وہاں سے نوول اور ڈراما برابر ملک میں شائع ہوتے رہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ انکا قدم زمانہ کی رفتار کے متوازی نہیں اُٹھتا۔ وہ جسقدر آگے بڑھتے جاتے ہیں اُسیقدر ترقی کے رستے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیئے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اُردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اُسکے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اُردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہی قائم ہوئی ہے۔ نیز اُردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق

نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔

زبان کے متعلق ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے۔ نیچرل شاعری کے لیئے جیسا کہ ظاہر ہے ہماری موجودہ زبان کافی نہیں ہے اسلیئے ضرور ہو کہ اُسمیں وسعت پیدا کیجائے۔ پس اہل لکھنؤ جو زبان کے دائرہ کو روز بروز زیادہ تنگ کرتے جاتے ہیں یہ امر مقتضاے وقت کے بالکل خلاف ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب نے ۱۸۶۹ء میں ایک رسالہ شعر و سخن کے متعلق لکھا ہے اُسمیں کچھ اوپر پچاس لفظ ایسے لکھے ہیں جنکو خود صاحب رسالہ یا اور اہل لکھنؤ واجب الترک خیال کرتے ہیں بعضے اُنمیں سے خاص لکھنؤ کے ساتھ مختص ہیں۔ اہل دہلی کبھی اُسطرح نہیں بولتے جیسے **اندھیارا۔ اندھیرے** کی جگہ **اُجیالا اُجالے** کی جگہ **کیونکرے۔ کیونکر** کی جگہ۔ ایسے الفاظ کا ترک کرنا ہم بھی نہایت مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے لکھنؤ اور دلی کی زبان میں مطابقت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اہل لکھنؤ ایسے الفاظ ترک کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم اور بہت سے الفاظ حاضر کر سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ ترک کرنے سے زبان کی وسعت میں بھی کچھ ایسا فرق نہیں آتا۔

اسی رسالہ میں بعضے ایسے الفاظ کو واجب الترک قرار دیا ہے جو اصل زبان کی گرامر یا قیاس لغوی کے خلاف برتے اور بولے جاتے ہیں جیسے **موسم** بفتح سین۔ **یا متیت**

بفتح یا۔ یا نشا بروزنِ وفاکہ عربی گرامر یا لغت کے موافق موسم بروزن مسجد۔ اور میت
بکسرہ یا اور نشاۃ بروزن وجاہت ہی۔ لیکن فی الحقیقۃ یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے
عربی دانوں کو **علم لسان** کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے۔ انکو یہ معلوم نہیں ہے،
کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہوکر کبھی اپنی اصلی صورت پر قائم نہیں
رہ سکتے۔ الا ماشاءاللہ۔ دور کیوں جاؤ۔ ہماری اُردو ہی میں ہزاروں لفظ سنسکرت۔ پراکرت
اور بھاشا کے داخل ہیں۔ باوجود اسکے شاذ و نادر ہی ایسے الفاظ نکلینگے جو اپنی اصلی صورت پر قائم
ہیں مثلاً گھر۔ گھڑا۔ اُجلا۔ آدھا۔ اندھیرا۔ آسرا۔ آنکھ۔ آگے۔ اُنگلی۔ یہ تمام الفاظ
سنسکرت کے مفصلۂ ذیل الفاظ سے بگڑے ہوئے ہیں یعنی۔ گرہ۔ گھٹ۔ اُجل۔ اَردھ
اندھکار۔ آشرے۔ اکھشی۔ اگر۔ اگرو۔ اسیطرح پراکرت اور بھاشا کے صدہا لفظ اپنی اصل
کے خلاف ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ مگر چونکہ اُن کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں اس لیئے
اُنکو صحیح سمجھکر بے تکلف بولتے اور برتتے ہیں۔ لیکن عربی یا فارسی جس سے کہ اُنکو فی الجملہ واقفیت
ہی جہاں اُسکا کوئی لفظ اصل زبان کے خلاف کسی کی اُردو نظم یا نثر میں دیکھا اور فوراً ناک
چڑھائی۔ حالانکہ خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں مثلاً۔
غش بجائے غَشی۔ **مسلمان** بجائے مُسلم۔ **محافہ** بجائے محفّہ۔ **غلطی** بجائے غلط
زیادتی بجائے زیادت۔ **سلامتی** بجائے سلامت۔ **ہدیہ** بجائے ہدیّہ۔ **مغیلاں**
بجائے اُمّ غیلاں۔ **محابا** و مدارا وغیرہ بجائے محابات و مدارات وغیرہ۔ علیٰ ہذا القیاس
فارسی کے الفاظ بھی اکثر اُردو میں غلط بولے جاتے ہیں۔ اہل ایران عربی کے صدہا لفظ

غلط تلفظ کے ساتھ یا غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً صُم و بُکم بجائے اصم و ابکم حُور بجائے حَورا ۔ اَبدال بجائے بدیل ۔ فضولی بجائے فضول حضوری بجائے حضور ۔ قُرآن بجائے قرآن ۔ مَشاطہ بجائے مشّاطہ ۔ مواسا و مفاجا وغیرہ بجائے مواسات و مفاجات وغیرہ

انگریزی میں تمام دنیا کی زبانوں سے الفاظ لیئے گئے ہیں ۔ مگر کسی لفظ کو اسکی اصلی صورت پر قائم نہیں رکھا ۔ مثلاً خلیفہ[1] ۔ ترجمان[2] ۔ مخزن[3] ۔ نوّاب[4] ۔ تعریف[5] قطن[6] امیرالبحر[7] ۔ عثمان[8] فردوس[9] منارہ[10] ۔ سپاہی[11] ۔ شغال[12] ۔ کاروان[13] ۔ شکر[14] ۔ قرمزی[15] ۔ کی جگہ جو کہ عربی و فارسی زبان کے الفاظ ہیں ۔ کیلف[1] ۔ ڈریگومین[2] میگزین[3] ۔ نیباب[4] ۔ ٹیرف[5] ۔ کاٹن[6] ۔ ایڈمرل[7] ۔ اوٹومن[8] ۔ پیرے ڈائز[9] منرٹ[10] ۔ سپوے[11] جیکول[12] ۔ کیرون[13] ۔ شگر[14] ۔ کرمسن[15] ۔ بولتے اور استعمال کرتے ہیں ۔

اسیطرح جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جاکر اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے ۔ پس جبکہ مَوسَم یا ہَیَت یا نَشَا وغیرہ الفاظ ہمارے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہیں تو اردو نظم و نثر میں انکو کیوں نہ استعمال کیا جائے ۔ بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی سے اردو میں لیئے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہوتے ہیں یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں ۔ نہیں بلکہ انکو اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیئے ۔ جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں ۔ ایسے لفظوں کو غلط سمجھکر ترک کرنا اور اُن کو اصل کے موافق استعمال کرنے پر مجبور کرنا بعینہ ایسی بات ہے کہ لالٹین کے بولنے سے لوگوں کو منع کیا جائے ۔ اور لینٹرن بولنے پر مجبور کیا جائے ۔ یا گھڑا بولنے سے روکا جائے اور گھٹ بولنے

کی تاکید کیجائے۔

عام غلطی اور عوام کی غلطی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو غلط الفاظ خاص و عام دونوں کی زبان پر جاری ہو جائیں وہ عام غلطی میں داخل ہیں ایسے الفاظ کا بولنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ صحیح بولنے سے بہتر ہے۔ ہاں جو غلط الفاظ صرف عوام اور جُہلا کی زبان پر جاری ہوں نہ کہ خواص اور پڑھے لکھوں کی زبان پر۔ البتہ ایسے الفاظ کو ترک کرنا واجب ہے جیسے مزاج کو مجاز کہنا۔ مُنکر کو مُنکر۔ خالص کو نخالص۔ ناحق کو بے ناحق۔ دروازہ کو دروزہ۔ نسخہ کو نُخسہ وغیرہ وغیرہ۔

انکے سوا بہت سے ایسے الفاظ واجب الترک بتائے ہیں جو شعرائے متقدمین نے عموماً استعمال کئے ہیں اور دہلی کے بعض شعرا اب بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر روزمرہ کی بول چال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آجتک دلی کے خاص و عام برابر بولتے رہے ہیں۔ جیسے تئیں۔ کبھو کسو۔ آنکے۔ آخرش۔ پہنانا (پنھانے کی جگہ) تبلانا۔ دکھلانا وغیرہ۔ سدا (بمعنی ہمیشہ) تلک۔ سیتی۔ مت بجائے حرف نفی۔ بِن (بمعنی بے یا بغیر) پہ (پر کی جگہ) کیجے۔ دیجے لیجے۔ بجائے کیجئے دیجئے لیجئے۔ مرا ترا۔ میرا اور تیرا کی جگہ۔ پر بمعنی مگر۔ اک بجائے ایک۔ زور بمعنی عجیب یا نہایت۔

یہ الفاظ شاید لکھنؤ میں ترک ہو گئے ہوں۔ یا ہو جائیں لیکن دہلی اور مضافات دہلی میں وہ کم و بیش برابر بولے جاتے ہیں۔ اور زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بولے جائینگے اور اگر بولے نہ جائینگے تو تحریروں میں ضرور مستعمل رہینگے۔ شاید نثر میں بعض الفاظ کی ضرورت نہ پڑے لیکن شعر میں انکی ضرورت ہمیشہ رہیگی (اگرچہ ہمیں کلام ہے کہ شعر کی بھی ضرورت رہیگی یا نہیں)۔

جو صاحب ایسے الفاظ ترک کرنے کی عام ہدایت کرتے ہیں اُنکی مثال اُن لوگوں کیسی ہی جو آپ تو ملتان میں مقیم ہیں اور کشمیر جانے والونکو اجازت نہیں دیتے کہ جڑاول کا بوجھ اپنے ساتھ باندھکر لے جائیں۔

اس مضمون کے متعلق زیادہ بحث کرنی فضول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جس ضرورت کے لحاظ سے ہم زبان کے دائرہ کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر فی الواقع وہ ضرورت پیش آنے والی ہے تو یہ قیدیں خود بخود اُٹھتی چلی جائینگے اور لوگوں کو بجاے اسکے کہ اپنی زبان کو تنگ اور محدود کریں مجبوراً دوسری زبانوں سے دریوزہ گری کرنی پڑے گی۔ اور اگر اردو لٹریچر کی ترقی کا خیال ایسا ہی دور از کار خیال ہے جیسا مسلمانوں کی علمی۔ تمدنی۔ اور اخلاقی ترقیات کا۔ تو یہ بحث پیش از وقت نہیں بلکہ نا وقت ہوگی۔

فکر شعر کیطرف کس حالت میں متوجہ ہونا چاہئے

چوتھی بات یہ ہے کہ فکر شعر کیطرف کسحالت میں متوجہ ہونا چاہیئے۔ بعضوں کی یہ راے ہی کہ رات کو سونیسے پہلے اور دن کو طعام چاشت سے پہلے شعر میں طبیعت زیادہ راہ دیتی ہے۔ کسی حکیم کا قول ہی کہ " وحشی مضامین کی رام کرنیوالی کوئی چیز ایسی نہیں ہی۔ جیسا آب رواں اور تنہائی اور بلند نشیمن " لیکن ہمارے نزدیک فکر شعر کے لیے کوئی موقع اور محل اس سے بہتر نہیں کہ کسی مضمون کا جوش شاعر کے دل میں خود بخود پیدا ہو۔ پھر اُسکے لئے باغ اور جنگل۔ بستی آبادی اور ویرانی۔ سبزہ زار اور چٹیل میدان۔ آب رواں اور چٹپر زمین سب برابر ہے **ابو نواس** جب تک کہ پھولوں کے گلدستہ اُسکے سامنے نہ رکھے جاتے تھے۔ شعر کی فکر نہیں کرتا تھا۔ **ابو العتاہیہ** نے ایک روز اُس سے پوچھا کہ کیا آپ کو بغیر اسکے مضمون نہیں سوجھتا

میں تو بیت الخلا میں شعر کہا کرتا ہوں **ابو نواس** نے کہا اسی لیے تو اُسمیں سے بدبو آتی ہے "۔ لیکن ہمارے نزدیک فکر شعر کے لیے نہ گلدستوں کی ضرورت ہے اور نہ بیت الخلا میں بیٹھنے کی۔ بلکہ صرف جوش اور ولولہ کی ضرورت ہے جو کسی قید اور شرط کا محتاج نہیں ہے **کثیر**[8] سے لوگوں نے پوچھا کہ تو نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا۔ کہا "جوانی جس سے اُمنگ دل میں پیدا ہوتی تھی گذر گئی **عزّہ** جو دل کو گرماتی تھی مرگئی۔ اور **عبدالعزیز** جس سے صلہ کی توقع تھی وہ بھی نہ رہا۔ اب کونسی چیز باقی ہے جو شعر کہلوائے"۔ گویا اُسنے اس بات کا اشارہ کیا ہے۔ کہ جب تک دلمیں کسی قسم کا جوش اور ولولہ نہو اُسوقت تک شعر سرانجام نہیں ہو سکتا **فرزدق** کہا کرتا تھا کہ " میں یاس و نومیدی کیحالت میں اَشْعَرُ النَّاس ہوں لیکن بعض اوقات میرا یہ حال ہوتا ہے کہ داڑھ کو مسوڑے سے اکھیڑنا مجھکو زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت شعر کہنے کے "۔ یعنی بغیر اقتضائے طبیعی اور دلی جوش کے شعر سرانجام نہیں ہو سکتا **خرمی** شاعر سے پوچھا گیا کہ کیا سبب ہے تیرے مدحیہ قصیدے جو **محمد بن منصور** کی شان میں اُسکی زندگی میں تو نے لکھے تھے بہ نسبت مرثیوں کے جو اَب تو اُسکی نسبت لکھتا ہے زیادہ عمدہ ہیں؟ اُسنے تسلیم کیا اور نہایت ایمانداری سے جواب دیا کہ " ہماری امیدیں اور خواہشیں زیادہ قوی اور پُرزور ہیں بہ نسبت ہماری وفاداری اور حق گذاری کے قصیدے ہمسے اُمید لکھواتی تھی اور مرثیے وفاداری لکھواتی ہے۔ اسلیئے دونو میں فرق بیّن نظر آتا ہے "۔ غرضکہ جب تک دلمیں کسی بات کی چیٹک نہو قوت متخیلہ مضامین کے القا کرنے میں فیاضی نہیں کرتی۔ مگر جوش شاعر

[8] کُثیر ایک مشہور عرب کا شاعر ہے۔ جسکی معشوقہ کا نام عزّہ تھا۔ اور عبدالعزیز بن مروان اُسکا ممدوح تھا۔ جہاں کُثیر عزّہ لکھتے ہیں وہاں اسی سے مراد ہوتی ہے ۱۲

کے کلام میں جبھی تک باقی رہ سکتا ہے کہ کوئی شے اُسکی آزادی کی مزاحم نہو یا اُسکی آزاد طبیعت کسی خوف اور روک ٹوک کی کچھ پروا نکرے۔ ورنہ ممکن ہی کہ جس مضمون کا جوش فی الواقع اُسکی طبیعت میں موجود ہے اُسکو وہ عمدگی اور خوبی کے ساتھ ادا نہ کر سکے۔

آزادی کی مزاحمت کئی طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی شاعر کو کسیکا خوف اپنے خیالات آزادانہ ظاہر کرنیسے مانع ہوتا ہے۔ چنانچہ **کُثَیّر عزّہ** اور **کُمَیت** بن زید جو نہایت پکے شیعی تھے اُنکی نسبت کہا گیا ہے کہ جو کچھ اُنھوں نے بنی ہاشم کی مدح میں کہا ہے وہ شاعری کے لحاظ سے اُس درجہ کا نہیں ہی جیسے بنی اُمیّہ کی مدح کے قصیدے۔ لیکن ایسی مزاحمت آزاد طبع شاعر کے جوش کو بعض اوقات اور زیادہ اُبھار دیتی ہے **جعفر** برمکی کے مرثیے لکھنے پر لوگ قتل تک کئے گئے۔ باایں‌ہمہ بعضوں نے اُسکے مرثیے ایسے جوش و خروش کے ساتھ لکھے ہیں کہ آج تک یادگار ہیں۔

کبھی سوسائٹی کا دباؤ۔ یا لالچ اور طمع یا اور کوئی ترغیب اُسکی طبیعت کے بہاؤ کا رُخ سیدھے رستے سے دوسری طرف پھیر دیتی ہے۔ یہ افتاد ہمارے اکثر شاعروں پر پڑی ہے اور اسنے بہت سے ہونہار اور روشن طبع شاعروں کو ہزال و فحاش و مسخرہ تک بنا دیا ہے۔

کبھی شاعر کے پیچھے ایک کر ایسی لگ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُسکو مجبور کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً ہر تقریب یا تہوار پر تہنیت کا قصیدہ لکھنا۔ یا ہر ہفتہ یا عشرہ میں مشاعرہ کیطرح پر غزل سر انجام کرنی۔ گو بظاہر اسمیں آزادی کی کچھ مزاحمت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن انسان کی نیچر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ایسی کریں اُسکی چلتی گاڑی میں

روڑا اٹکا دیتی ہیں۔ وہ جسطرح ممنوعات پر بالطبع حریص ہے اسیطرح تکلیفات[8] سے بالطبع ابا کرنے والا ہے۔ **انشاء اللہ خاں** جب تک مطلق العنان رہے **سعادت علی خاں** کے دربار میں نت نئے شگوفے اور چٹکلے چھوڑتے اور بات بات پر لطیفے انشا کرتے تھے۔ لیکن جب سعادت علی خاں نے یہ کڑ لگادی کہ ہر روز دو ایسی نئی باتیں بیان کر دیا کرو جو کبھی نہ سُنی ہوں پھر وہی انشاء اللہ خاں تھے کہ پاگلوں کیطرح گلی کوچوں میں لڑکوں سے پوچھتے پھرا کرتے تھے کہ بھئے کوئی نئی بات بتاؤ۔ آخر اسی جستجو میں قطعی پاگل ہو گئے۔ یوروپ کے ایک زبردست شاعر کا حال سُنا ہے کہ جب اُس نے اپنی آیندہ تصنیفات کا کاپی رائٹ کسی پبلشر کے ہاتھ فروخت کر دیا تو وہ کہا کرتا تھا کہ اس معاہدہ سے میری طبیعت بند ہوئی جاتی ہے۔ جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں ساتھ ہی یہ خیال گذرتا ہے کہ اب ہم جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل کی اپج سے نہیں بلکہ اپنا معاہدہ پورا کرنے کو لکھتے ہیں۔ اس خیال سے طبیعت خود بخود بیٹھی جاتی ہے۔

بہرحال جہاں تک ممکن ہو کسی مضمون کے لکھنے پر اُسوقت تک قلم اُٹھانی نہیں چاہیئے۔ جب تک اُسکی چیٹک دلکو نہ لگی ہو۔ کسی کی ریس سے۔ کسی کی فرمایش سے۔ کسی کے دباؤ سے۔ یا کسی اور مجبوری کے سبب۔ بغیر اقتضائے طبیعی اور ولولہ باطنی کے جو شعر کہا جائیگا۔ یا جو نظم سرانجام کی جائے گی۔ اُسمیں اثر اور زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے۔

[illegible] ١٦

پانچویں اصناف سخن میں سے تین ضروری صنفیں جنکا ہماری شاعری میں زیادہ رواج ہے یعنی غزل قصیدہ اور مثنوی اُنکے متعلق چند مشورے دیئے جاتے ہیں۔ سب سے اول ہم **غزل** کا ذکر کرتے ہیں اور ایک خاص مناسبت کی وجہ سے **رُباعی** اور **قطعہ** کو

[8] تکلیف گز لگانے کو کہتے ہیں ...

غزل کی ذیل میں داخل کرتے ہیں۔

غزل غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الا ماشاء اللہ۔ بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل[٭] سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لیے ہوئی تھی مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زماننا نہایت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود لو دوراز کار صنف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں ملسکتا اور اُسکی قوت متخیلہ بیکار بھی نہیں رہ سکتی۔ اسلیے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقت شاعر کے ذہن میں فی الواقع گذرتے ہیں۔ یا تازہ کیفیات جنسے اُسکا دل روزمرہ کسی واقعہ کو سنکر یا کسی حالت کو دیکھکر سچ مچ متکیف ہوتا ہے۔ اُنکے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعے سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل۔ یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے اُنکو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اور چند بسیط خیالات جو ایک

٭ غزل کے معنی لغت میں عشقبازی کرنے اور عورتوں سے مخاطب ہونے کے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں زَیدٌ اَغزَلُ مِن عَمروٍ۔ یعنی زید عشق کے مضامین عمرو سے بہتر باندھتا ہے۔ یا زید عمرو سے زیادہ عشقباز ہے ۱۲

دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے وہ غزل کے سلسلہ میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسیقدر ہلکی کردیجائیں منسلک ہوسکتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کرینگے۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اسکا چٹخارا رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں۔ وجد و سماع کی مجلسوں میں۔ لہو و لعب کی صحبتوں میں تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اُسکے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہوسکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہوسکتا کیونکہ اُسمیں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلہ بیان منقطع ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اسقدر دائر و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو اُسکا اثر قومی مذاق اور قومی خلاق پر جسقدر ہو تھوڑا ہے۔ اسی لیئے ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ لیکن غزل کی اصلاح جسقدر ضروری ہے اُسیقدر دشوار بھی ہے غزل میں جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اُسکا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان ٹپے ٹھمری سے مانوس ہوجاتے ہیں وہ دُھرپت اور خیال سے لذت نہیں اُٹھاسکتے۔ داستان سُننے والوں کی پیاس

تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بُجھ سکتی۔ بوالہوسی اور کامجوئی کی باتوں میں جو مزا ہے وہ خالص عشق ومحبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ اوباش والواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارا ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہوسکتا ہے۔ جن مذاقوں پر ہزل ومطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے اُنپر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سرمہ کاجل کنگھی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حُسن ذاتی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ باواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہوگی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص وعام بنایا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے سعدی۔ رومی۔ خسرو۔ حافظ۔ عراقی۔ مغربی۔ احمد جام۔ اور جامی وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کیطرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا۔ ہمنے **حیات سعدی** میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ انکی غزل کا موضوع جیساکہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ اُنکے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق ومحبت کے رنگ میں شور بور تھے۔ انکے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جسکو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اُنکی غزل سنکر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ وہ خال وخط کا ذکر اسطرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیا دار مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی وبدنامی ورسوائی کو صوفیوں کی دلق ملمع اور

زاہدوں کی زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے۔ کوئی حماقت غرورِ مال و جاہ سے کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے اور کوئی دھوکا دُنیا سے بڑھکر نہیں بتاتے۔ اُنکا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اُنکے دل سے نکلا ہے۔

اِن لوگوں کی غزل گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اُسحالت کے بالکل مناسب تھی جب کہ قوم نے دنیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا اُنکے اشعار اُن لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے۔ جو حُبِّ دنیا اور حُبِّ جاہ میں منہمک۔ خدا سے غافل۔ اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے۔ اُنسے ظالم۔ طمّاع۔ حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریاکار زاہدوں۔ واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو عیار فقیروں کے دامِ تزویر سے بچاتے تھے۔ وہ اہل اللہ اور اربابِ صدق و صفا کو نفس امارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبّہ کرتے تھے۔

اُردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ لیکن عاشقانہ خیالات۔ نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اُردو غزل گویوں کے طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔ ہم بجائے اسکے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقہ پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اُسکی اصلاح کے متعلق اہلِ وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

۱۔ غزل کے لیئے یہ ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اُسکی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے

اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دیجائے تو حالتِ موجودہ میں اُسکا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں۔ سرکہ بنجانے کے بعد سرور قائم رہنا لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہی۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشق میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں اُنمیں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بنکر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دلمیں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اُس کیفیت کا بیان ضرور مؤثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگذشت بیان کرے گا ضرور اُسکے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جسکی حالت خود اُسکی تکذیب کرتی ہے تو اُس سے سوا اسکے کہ لوگونکو ہنسی آئے۔ اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ پس ایک پارسا نوجوان جسکو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی۔ یا ایک ستر برس کا پیر مرد جسمیں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی اُنکو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھکر بیجا اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کام جوئی پر موقوف نہیں ہی۔ بندہ کو خدا کے ساتھ اولاد کو ماں باپ کے ساتھ۔ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ۔ بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ۔ خاوند کو بی بی کے ساتھ۔ بی بی کو خاوند کے ساتھ۔ نوکر کو آقا کے ساتھ۔ رعیت کو بادشاہ کے ساتھ۔ دوستوں کو دوستوں کے ساتھ۔ آدمی کو جانور کے ساتھ۔ مکیں کو مکاں کے ساتھ۔ وطن کسیکا

ملک کے ساتھ۔ قوم کے ساتھ۔ خاندان کے ساتھ۔ غرضکہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دلبستگی ہوسکتی ہے۔ پس جبکہ عشق و محبت میں اسقدر احاطہ اور جامعیت ہی۔ اور جبکہ عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا پتا بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کردیا جائے اور ایسے سرِ مکتوم کو فاش کرکے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کیجائے۔

اسی لیئے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں۔ اور جہانتک ہوسکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ مثلاً کلاہ چیرہ۔ دستار۔ جامہ۔ قبا۔ سبزہ خط مَسیں بھیگنا۔ زرگر پسر مطرب پسر۔ مغبچہ۔ ترسابچہ وغیرہ وغیرہ یا محرم۔ کرتی۔ مہندی چوڑیاں۔ چوٹی۔ موباف۔ آرسی۔ جھومر۔ وغیرہ۔

اگرچہ (جیساکہ حیات سعدی کے خاتمہ میں ہمنے مفصل بیان کیا ہے) مرد کا مطلوب مرد کو قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہی محض ایک غلط فہمی اور قومی حمیت کے خیال پر مبنی ہے نہ کہ حقایق و واقعات پر۔ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قبیح اور نالایق دستور ہی جو قومی اخلاق کو داغ لگاتا ہے۔ لہذا اسکو جہانتک جلد ممکن ہو ترک کرنا چاہیئے۔ اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیئے۔ کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرائے نامور اسی طریقہ پر غزل کہتے چلے آئے ہیں۔ ہر زمانہ کا اقتضا الگ ہوتا ہے۔ جو فحش اور بے حیائی کی

باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے پُراتموں کے کلام میں موجود ہیں۔ اگر ہم آج ویسی باتوں میں اُنکی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھیرتے ہیں۔ پس جہاں ہمنے اُنکی بہت سی خُرافات مواخذۂ عدالت کے خوف سے چھوڑی ہیں اُنکی ایک آدہ خرافت محض عقل اور اخلاق کے حکم سے بھی چھوڑنی چاہیئے۔

اسیطرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اُسقوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہو۔ کیونکہ اگر معشوقہ کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اُسکے حُسن و جمال کی تعریف کرنی اور اُسکے کرشمہ و ناز و انداز کی تصویر کھینچنی گویا اپنے ننگ و ناموس کو اپنوں اور پرایوں سے انٹروڈیوس کرانا ہے اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی نالائقی یا بدنیتی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ اسی بنا پر ایران میں جتنے ممتاز اور برگزیدہ اور اعلےٰ درجہ کے غزل گو گزرے ہیں۔ اُن کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اسقدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں۔ اور اتنی بات ابتک ہندوستان میں بھی موجود ہی کہ گو غزل میں مطلوب کبھی مرد کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے ہیں۔ اور کبھی مرد کی اور کبھی عورت کی خصوصیات بھی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن کبھی مطلوب کے لیئے افعال یا صفات مؤنث نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ مذکر لاتے ہیں۔ مثلاً یوں کبھی نہیں کہتے کہ وہ روزن دیوار سے جھانکتی تھی۔ یا وہ پری ہمارا دل لے گئی۔ یا وہ آرسی میں مونہ دیکھتی تھی۔ یا وہ بالے پہن رہی تھی۔ یا وہ اپنی صورت کی متوالی ہے۔ یا وہ عاشق کا دل جلانے والی ہے بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال و صفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں۔ حالانکہ مقام تانیث

کا مقتضی ہوتا ہے۔ مثلاً **ذوق** کہتے ہیں

"جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو اُسی روزن میں گھر زنبور کا"

یا **امانت** لکھنوی کہتے ہیں۔

"شاعروں میں وہ پری زلف کو وا کیا کرتا
موشگافوں کو گرفتارِ بلا کیا کرتا"

غرضکہ کسی اُردو غزل گو یوں نے معشوق کے لیئے جہاں تک کہ ہمکو معلوم ہے فعل یا صفت مذکر استعمال نہیں کی۔

اگر معشوق کو اطلاق کیحالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت رجال یا نسا کی غزل میں ذکر نہ کیجائے تو اُسصورت میں افعال وصفات کا مذکر لانا بالکل قاعدہ کے موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوع انسان میں ذکور واناث دونو داخل ہیں۔ مگر اُس حکم کا موضوع ہمیشہ فردِ کامل یعنی مذکر قرار دیا جاتا ہے نہ مؤنث۔ مذہب میں۔ فلسفہ میں طب میں۔ اخلاق میں اور تمام علوم و قوانین میں یہی قاعدہ عموماً جاری ہے۔ لیکن معشوق کو کبھی چہرہ یا قبا یا سبزہ خط کے ساتھ اور کبھی چوٹی موباف آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اسکے افعال وصفات کو ہمیشہ مذکر لانا اسکے یہ معنی ہوں گے۔ کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت۔ بلکہ زنانہ ہے یا ہیجڑا۔

ایسے اشعار جنمیں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر

حاوی ہوں یا محض عشق روحانی یا عشق آلٰہی پر محمول ہوسکیں اور جنسے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جائے۔ کیا فارسی اور کیا اُردو دونو زبانوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں خصوصاً شعرائے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں پس غزل میں ہمیشہ کے لیئے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہی جسکو تکلیف مالایطاق سمجھا جائے

۲- جسطرح عشقیہ مضامین غزل کے خمیر میں داخل ہیں اسیطرح خمریات یعنی شراب اور اُسکے لوازمات کا ذکر اور نیز فُقہا و زُہاد اور تمام اہل ظاہر پر طعن و تعریض کرنی اپنی میخواری و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقوٰی کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں۔ یہ مضامین بھی غزل کے اجزاے غیر منفک قرار پاگئے ہیں سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحب باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدی و رومی و حافظ و خسرو وغیرہم چونکہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حُسن قبول پایا اور خاصکر خواجہ حافظ کی غزل جسمیں ان مضامین کی بہتات سب سے بڑھکر ہے حد سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ اسلیئے متاخرین نے بھی اُنکی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کر لیا مگر ہمکو دیکھنا چاہیئے کہ اُن بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھنے میں اسقدر غلو کیا ہے۔ اس کا منشا کیا تھا۔

فقہا اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہل باطن کے

دوسرے اہل رائے کے۔ فقہا کے فتووں سے ان دونو گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں قتل کیئے گئے ہیں۔ دار پر چڑھائے گئے ہیں مشکیں بندھی ہیں۔ کوڑے کھائے ہیں۔ قیدیں بھگتی ہیں جلاوطن کیئے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں اور اَور کیا کیا کچھ ہولا ہے۔ جبکہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے۔ بقول شخصے "کسیکا ہاتھ چلے کسیکی زبان" فقہا و واعظین انکے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے۔ انھوں نے انکے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع کلام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا شراب خوری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دلمیں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھکر کوئی گناہ نہیں وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق آلہی ادا نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اسکے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام و صراحی اور انکے لوازمات اور خلاف شرع الفاظ مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں یہ لوگ (یا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہو۔ یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسن ظن

جو رہزن طریقت ہیں اُس سے محفوظ رہیں۔ یا اسلئے کہ عشق و محبت کی بھڑاس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مؤدب گفتگو کے خوب نکلتی ہے۔ اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں۔ اور اُن کی زجر و ملامت جو بے گناہ ملزموں کو تحسین و آفرین سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے مزے لے لے کر سُنیں) روحانی کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ سب سے اخیر درجہ کا ثبوت مولٰنا روم کی اس رباعی سے ہوتا ہے۔

وی بر سر کوی زنہ غارت کردم مرپاکاں راجاذب زیارت کردم
شکرانہ آنکہ روزہ خوردم رمضاں درعید نماز بے طہارت کردم

شاہ **ولی اللہ** صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رمضان میں روزے کھانے کے یہ معنی ہیں کہ جب مجاہدہ سے مشاہدہ تک نوبت پہنچگئی تو ریاضت ترک کردی گئی۔ اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید میسر آگئی اور جدائی کا الم جاتا رہا۔ اب حضوری بے کیف جو کہ حقیقتِ صلوۃ ہے ہر وقت رہنے لگی۔ یہانتک کہ ظاہری طہارت اور عدم طہارت اور جاگتے اور سوتے غرضکہ ہر حالت میں دولتِ حضوری میسر ہے۔ خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرع میں **خطاپوش** کے لفظ سے قلم صنع کی خطاپوشی کا خیال ذہن میں گذرتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے

کیونکہ قلم صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اُسنے لکھدیا ہے وہ اٹل ہے اور اس سے انسان کا مجبور ہونا اور اسلیئے اُسکا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جنسے اہل ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے۔ اسی لیئے مولٰنا روم فرماتے ہیں

"خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

ان بزرگوں کے سوا بعضے شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور نشہ یا خمار کیحالت میں جو کیفیت اُنکے دلپر گزرتی تھی یا جو اثر اُنکی طبیعت یا اخلاق پر ہوتا تھا اُسکو شعر میں بیان کرتے تھے۔ چونکہ شاعری کا جزو اعظم (جیساکہ اوپر بیان ہوچکا ہے) یہ ہے کہ اُسمیں جو خیال باندھا جائے اُسکی بُنیاد اصلیت پر ہونی چاہیئے اسلیئے اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف اُن لوگوں کا حق ہونا چاہیئے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کرسکتے ہوں، نہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائینگے جیسا بندر انسان کا ہوتا ہے۔ نیز واعظ و زاہد وغیرہ کو تاڑنا اور اُنپر نکتہ چینی کرنی اُنھیں لوگوں کو زیبا ہے۔ جنکو فی الواقع اُن کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ ہاں باوجود نہونے کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جاسکتے ہیں یعنی نکتہ چینی ایسے طریقہ سے کیجائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی بُرائی بیان کرنی مقصود ہے نہ کہ زُہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا۔ کیونکہ رذائل کی

برائی اور فضائل کی خوبی بغیر اسکے دلنشین نہیں کیجاسکتی کہ کسی شخص یا گروہ کو انکا موضوع فرض کر لیا جائے اور معقولات کو محسوسات کے پیرایہ میں ظاہر کیا جائے ظلم اور عدل کا بیان واضح طور پر اسیطرح ہو سکتا ہے کہ ظالم یا منصف بادشاہ کی مذمت یا تعریف کیجائے۔ اور نامردی یا بہادری کی تصویر یونہیں دکھائی جاسکتی ہے کہ انکو کسی بزدل یا بہادر کے قالب میں ڈھالا جائے۔ لیکن اسصورت میں ضرور ہے کہ واعظ و زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کیطرف جو عقلاً یا شرعاً قابل الزام ہو کچھ اشارہ کیا جائے ورنہ کہا جائیگا کہ نیکوں پر نہ اسلیئے کہ وہ قابل الزام ہیں۔ بلکہ اسلیئے کہ وہ نیک ہیں حملہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بطور مثال کے ہم شیخ ابراہیم **ذوق** کے دو شعر لکھتے ہیں۔

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسیقدر اُس خصلت کیطرف اشارہ پایا جاتا ہے جو اکثر زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہوکر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں۔ لہذا اس طرز بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر دوسری جگہ وہ اسطرح فرماتے ہیں۔

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر — وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے

اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اسکے کہ شیخ شیخ ہے نہیں جتلایا گیا اور شعر میں اسکے سوا اور کوئی خوبی نہیں رکھی گئی کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہکر بھنگڑوں اور شرابیوں کی ضیافت طبع کیجائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کو

اگر ہم اپنے شعرا کا حد سے زیادہ ادب کریں تو سعدی اور سوزنی کی
ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

۳۔ مذکورۂ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دلمیں اُٹھے۔ خواہ اُسکا منشا خوشی ہو یا غم۔ یا حسرت۔ یا ندامت۔ یا شکر۔ یا شکایت۔ یا صبر۔ یا رضا۔ یا قناعت یا توکل۔ یا رغبت۔ یا نفرت۔ یا رحم۔ یا انصاف۔ یا غصہ۔ یا تعجب۔ یا امید۔ یا ناامیدی یا شوق۔ یا انتظار۔ یا حُبِّ وطن۔ یا قومی ہمدردی۔ یا رجوع الی اللہ۔ یا حمایت دین و مذہب یا دنیا کی بے ثباتی۔ اور موت کا خیال۔ یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے۔ اُسکو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اُسکو ہر مضمون کے لیئے عام کر دیا ہے۔ اور اب اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں۔ وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیئے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور اُنھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہمکو چاہیئے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا ارگن بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لیئے ہاتھ پانو مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول تبلایا ہو۔ لیکن ہمارے دلمیں اس خیال کی حقارت ہو۔ یا اُنھوں نے اسکے برعکس ہاتھ پانو توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو۔ لیکن ہم میں سے کسی کے دل

اسکے برخلاف حالت طاری ہو۔ دونو صورتوں ہیں ہمارے مونہ سے وہی صدا نکلنی چاہئے جو ہمارے دلسے اُٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گذرے کہ مثلاً کوشش وتدبیر ہمکو محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو۔ اور دوسرے وقت ہمارے ہی دلمیں ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں۔ ہمکو دونو حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم وکاست کھینچدینی چاہیئے۔ اِس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق وغوامض اور جو انقلاب کہ اُسکی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں وہی منکشف ہونگے۔ بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ اثر ہوگا کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور بُرا دونو پہلو نہ دکھائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً **صائب** ایک جگہ کہتے ہیں۔

قناعت کن بہ نانے خشک تا بے آرزو گردی   کہ خواہش ہاے الوان ست نعمت ہاے الوان را

دوسری جگہ یہی **صائب** کہتے ہیں۔

صرف بیکاری مگردان روزگار خویش را   پردہ روی توکل ساز کار خویش را

ظاہر ہے کہ جبتک دونو مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو تن آسانی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسیکو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرایہ میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اور بلاشُبہہ غزل جسمیں سوز وگداز نہو اور کچھ جو چُلبلا

اور چونچال نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی لیکن ہمارے معاصرین کے لیئے سوز و گداز کا اسقدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک نبڑ نہیں سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آجکل دنیا کا حال صاف اُس درخت کا سا نظر آتا ہے جسمیں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پُرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو اُنکے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پُرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں اُنکی جگہ لیتی جاتی ہیں۔ اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کر کے رہجائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے۔ جس سے تمام کرہ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اُسکی جزئیات کے بیان کرنیکے لیئے کافی نہیں ہو سکتی کسی واقعہ کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا!۔ کسی کو دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا۔ اور کبھی یاس دلپر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ مٹیریل غزل کے لیئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبالمندی کے زمانہ میں زیبا تھیں اب وہ وقت گیا عیش و عشرت کی رات گذر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔

اسکے سوا بڑے بڑے اُستادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جنمیں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک

ایک ہی۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو اُنمیں کسیقدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت۔ صبح اور شام کا سماں۔ چاندنی رات کا لطف۔ جنگل یا باغ کی بہار۔ میلے تماشوں کی چہل پہل۔ قبرستان کا سناٹا۔ سفر کی روئداد۔ وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزلیں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہانتک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے انسان کو اگر ہمیشہ طرح بطرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہی۔ لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلوّن اور تنوّع نہ ہو اُنسے جی اکتا جاتا ہے جو گویا صبح شام رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے اُسکا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسیطرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے۔

" مکرر گرچہ سحر آمیز باشد طبیعت را ملال انگیز باشد "

اگرچہ اسمیں شک نہیں کہ جسطرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے۔ اسیطرح ایک ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے۔ لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ ایک ہی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ تو اُسمیں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں۔ جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اُس مضمون میں تنوّع کی گنجایش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اُسیکو چھیڑے چلے جائینگے تو بجائے تنوّع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگیگا۔ بہروپیا

دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہہ میں ڈال سکتے ہے۔ مگر پھر اُسکی قلعی کھلجاتی ہے ہر کوئی اُسکو دور ہی سے دیکھکر پہچان لیتا ہے کہ بہروپیا ہے۔ ہم لوگ جب غزل لکھکر مشاعرہ میں جاتے ہیں تو اپنے دلمیں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اور اچھوتے مضمون باندھکر لے چلے ہیں۔ مگر غزل کو دیکھیے تو وہی انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد سانچے تیار ہیں کوئی مدور ہے۔ کوئی مستطیل۔ کوئی مثلث کوئی مربع۔ کوئی مسدس اور کوئی مثمن۔ اب ہر ایک سانچے میں موم کو پگھلا کر ڈالو ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم نئی شکل پر ڈھلکر نکلیگا۔ بعینہ ایسا ہی حال غزل کا ہے مضمون وہی معمولی ہیں۔ مگر بحر اور ردیف و قافیہ کے اختلاف سے مختلف شکلیں پیدا کر لیتے ہیں۔

ایک مشہور شاعر کا دیوان غزلیات اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اُس میں **چاک گریباں** کا مضمون مفصلہ ذیل صورتوں میں بندھا ہوا ہے۔

۱۔ اے جنوں گریبان تو چاک کر چکے۔ اب کیا کریں کوئی اور شغل بتا۔

۲۔ لوگ پھر جامہ دری کرنے لگے۔ اور ہمارا ہاتھ پھر گریبان تک جانے لگا۔

۳۔ بہار کے دن قریب آ گئے جو گریبان خود بخود پھٹا جاتا ہے۔

۴۔ اگر بہار میں میری پوشاک نہ چھین لیجاتی تو بدن پر نہ دامن نظر آتا نہ گریبان۔

۵۔ اگر عقل کی پابندی نہوتی تو ہم دامن اور گریبان سب پھاڑ ڈالتے۔

۶۔ وہ ہاتھ چھوڑا کر چلا گیا میں بھی اب گریبان کو پھاڑ کر چھوڑونگا۔

۷۔ اے جنوں ہم جدائی میں گریبان پھاڑتے ہیں تو ساری رات اُس کے تار گنتا رہ۔

۸- اُسکی تحریر سے میں ایسا دیوانہ ہوا کہ پیراہن چاک کرڈالا۔

۹- اُسکی چست قبا کا دامن دیکھکر گریبان پھٹتے ہیں۔

۱۰- اے جنوں دامن کیطرح گریبان کے بھی لتّے لے۔

۱۱- دیکھیے ہم کب تک کپڑے پھاڑتے ہیں اور کب تک ہمکو جنوں سوزن کیطرح عُریاں رکھتا ہے۔

۱۲- اے جنوں اب جامہ دری مت کر ہم دامن کو پھاڑکر کب تک گریبان میں رفو کرتے رہیں۔

۱۳- بہار میں ہاتھ کیسے بیکار ہیں آؤ گریبان ہی چاک کریں۔

۱۴- اے جنوں گریبان مجھکو پھانسی سے بھی زیادہ تنگ کرتا ہے۔ اُسکی دھجیاں اُڑادے۔

۱۵- اے جنوں اب کے سال بہار میں گریبان کو ایسا چاک کرکہ کسی سے رفو نہو سکے۔

۱۶- تم تو ہاتھ سے دامن چُھڑا کے نکلگئے ہم اپنا گریبان چاک کرکے نکلگئے۔

۱۷- جنوں جو حد سے بڑھا تو گریبان چاک ہو کے دامن سے نکل گئے۔

۱۸- مجھے چاک گریبانوں پر حسرت آتی ہے کہ کیسے دامن صحرا کی طرف دوڑے جاتے ہیں

۱۹- ہمارے ہاتھ جنون کی بدولت زوروں پر ہیں کہ نئے نئے گریبان چاک ہوتے ہیں۔

۲۰- اے جنوں تیرے ہاتھوں سے کتنا تنگ ہوں روز نئے گریبان کہاں سے لاؤں۔

۲۱- اُسکے عاشق ہمیشہ گریبان چاک رکھتے ہیں۔ گل کے گریبان میں کہیں بھی رفو ہے؟

۲۲- بہار آئی اور جنوں پھر کپڑے پھاڑنے لگا کتنے ہی گریبان چیتھڑے ہو ہو کر اُڑ گئے

۲۳۔ اے جنوں تجھکو سودائے زلف کی قسم ہے جو گریبان کا ایک تار بھی بیکار جانے دے

جس دیوان سے ہمنے یہ ایک مضمون کے ۲۳ اسلوب بیان نقل کیے ہیں یہ کچھ اوپر دو سو صفحہ کا دیوان ہے۔ جب ایک مختصر دیوان کا یہ حال ہے تو اُردو کے تمام دیوانوں میں دیکھنا چاہیئے کہ یہی ایک مضمون کتنی شکلوں میں باندھا گیا ہوگا۔ اور اگر فارسی کے دواوین کو بھی اُنمیں شامل کر لیا جائے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اسی ایک مضمون کے اشعار سے کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ مضمون ایسا تنگ ہے کہ اُسمیں ایک دو اسلوب سے زیادہ گنجایش نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ غزل کے وہ معمولی مضامین جنمیں اس مضمون کی نسبت زیادہ پہلو نکل سکتے ہیں۔ اُنکی کہاں تک نوبت پہنچی ہوگی۔ جیسے جفائے یار۔ رشکِ اغیار۔ شوقِ وصل۔ رنجِ فراق۔ زلفِ پریشان۔ چشمِ فتّان۔ بُت پرستی۔ توبہ شکنی رندی و بادہ خواری وغیرہ وغیرہ۔ اسمیں بالکل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ اگر تمام فارسی و اُردو کی غزلیات کا خلاصہ کیا جائے اور مکررات کو چھوڑ کر محض اصلی مضامین چھانٹے جائیں تو سو سوا سو صفحہ سے زیادہ کل مضامین کی مقدار نہ نکلے گی۔ اور اگر یہ التزام کیا جائے کہ ہر ایک مضمون جتنے عمدہ پہلوؤں سے باندھا گیا ہو اُن سب کو انتخاب کر لیا جائے تو بیشک اس سے کسیقدر مقدار بڑھجائے گی۔ مگر اکثر عمدہ پہلو قدما کے کلام میں نکلیں گے۔ اور اُنکے فضلات متاخرین کے کلام میں۔ یہی چاک گریباں کا مضمون جو متاخرین میں سے ایک نے ۲۳ طرح پر باندھا ہے میر تقی کے ہاں اسطرح بندھا ہوا ہے۔

"اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اَور گریباں کے چاک میں"

مجھکو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر **چاک گریباں** کا مضمون باندھا ہو۔

مذکورۂ بالا تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ متاخرین قدما کے کلام سے کوئی بات اخذ نکریں اور جو مضمون وہ باندھ گئے ہیں اب اُسکو کسی پہلو سے نہ باندھیں۔ یا اپنے باندھے ہوئے مضامین کا پھر اعادہ نکریں کیونکہ بغیر اسکے نہ صرف شعر میں بلکہ ہر فن اور ہر صناعت میں کسیطرح کام نہیں چل سکتا **کعب** ابن زہیر جو ایک مُخضرمی شاعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مداح ہے وہ کہتا ہے۔

"مَا اَرَانَا نَقُوْلُ اِلَّا مُعَادًا ۔ اَوْمُعَادًا مِنْ قَوْلِنَا مَکْرُوْرًا"

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اوروں کے کلام سے مستعار لیکر کہتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو بار بار دوہراتے ہیں) پس جب کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے شعرا کا ایسا خیال تھا تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی خوشہ چینی سے ہمکو استغنا حاصل ہے یا ہمکو یہ قدرت ہی کہ کوئی مضمون ایک دفعہ باندھکر پھر اُسکا اعادہ نکریں۔

عربی میں دو متناقض مثلیں مشہور ہیں ایک یہ ہے کہ "کَمْ تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ" (یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیئے چھوڑ گئے ہیں) اور دوسری یہ مثل ہی کہ "مَا تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ شَیْئًا" (یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لیئے کچھ نہیں چھوڑا) ان دونو مثلوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ اگلے بہت سی ادھوری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے اُنکو پورا کریں لیکن اُنھوں نے پچھلوں کے لیئے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جسکا نمونہ موجود نہو

اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کرکے اُسمیں کوئی ایسا لطیف اضافہ یا تبدیلی کردے جس سے اُسکی خوبی یا متانت یا وضاحت زیادہ ہو جائے وہ درحقیقت اُس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے مثلاً **سعدی** شیرازی کہتے ہیں۔

"از ورطۂ ما خبر ندارد   آسودہ کہ بر کنارِ دریاست"

اسی مضمون کو **خواجہ حافظ** نے اسطرح ادا کیا ہے۔

"شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں ہائل   کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا"

ظاہر ہے کہ **حافظ** نے اس مضمون میں گویا اُس کمی کو پورا کردیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نے شیخ سے یہ مضمون چھین لیا۔ اسی مطلب کو **نظیری** نے یوں تعبیر کیا ہے۔

"بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را   نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر"

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جسکے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ حافظ سے مضمون چھین لیا۔ لیکن اُسنے مضمون کو ایسے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک روز خواجہ حافظ کا یہی شعر ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے تھے یہ شعر سُنکر بولے۔ "کاش دوسرے مصرع میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور اسباب کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ بیدردوں کو

ہمارے حال کی کیا خبر ہے۔ تاکہ اپنے حال میں مبتلا ہونے اور غیر کے تصور سے دہول ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا" میں نے **غالب** مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست"

وہ یہ شعر سُنکر پھڑک گئے اور کہا کہ ہاں بس میرا یہی مطلب تھا۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہجاتی ہے جسکو پچھلے پورا کردیتے ہیں۔ کبھی قدما ایک مضمون کو کسی خاص اسلوب میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ متاخرین اُسکے لیئے ایک نرالا اسلوب پیدا کردیتے ہیں۔ اور کبھی متاخرین قدما کے اسلوب میں سے ایک خوبی کم کرکے ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پس کیونکر ہوسکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تخیل پر بھروسا کرکے قدما کی خوشہ چینی سے دست بردار ہوجائے۔

شفائی صفاہانی یا متاخرین شعرائے ایران میں سے کوئی اور شخص غزل میں کہتا ہے۔

"مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید"

قائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پسند کے لیئے معشوق کے معمولی بناؤ سنگار کافی نہیں ہیں۔ پس مشاطہ کو چاہیئے کہ اُنمیں کچھ اور اضافہ کرے کیونکہ اب اُسکے دیکھنے کی نوبت ہم تک پہنچی ہے۔ شاعر نے مضمون میں جدت تو پیدا کی۔ مگر پھسپھسی۔ اول تو اُسنے جسکو دوست قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اُسکی محبت کا نقش اُسکے دلمیں نہیں بیٹھا

پھر اُسکو دوست کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے اُسکے بیان سے ظاہر ہوتا ہے
کہ وہ معشوق کے حُسن ذاتی سے کچھ دلبستگی نہیں رکھتا بلکہ عارضی بناؤ سنگار پر فریفتہ ہے
تیسرے عشق جو ہمیشہ بے قصد و بے ارادہ پیدا ہوتا ہے اُسکو قصد اور ارادہ سے پیدا
کرنا چاہتا ہے

مرزا غالب مدح میں کہتے ہیں

زمانہ عہد میں ہے اُسکی محوِ آرایش　　بنینگے اور ستارے اب آسماں کے لیئے

ظاہرا یہ خیال اسی فارسی شعر سے قصداً یا بلا قصد پیدا ہوا ہے مگر مرزا نے اس مضمون کو
اصل خیال کے باندھنے والے سے بالکل چھین لیا ہے جو خلل تغزل کیحالت میں اُسمیں موجود
تھے وہ مدح کیحالت میں بالکل نہیں رہے **مرزا** نے ممدوح کو ایک ایسے کمال کے ساتھ موصوف
کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کاملتر اور افضلتر حالت میں دیکھنا چاہتا
ہے۔ اسلیئے ہر شئے اپنے تئیں کاملتر حالت میں اُسکو دکھانا چاہتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ
نکالا ہے کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کے لیئے اور ستارے پیدا کیے
جائیں اسپر سوا اسکے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جائے اور کسیطرح کی گرفت نہیں ہو سکتی بخلاف
فارسی شعر کے کہ اُسکی بنا خود اصول شاعری اور آداب عشق و محبت کے برخلاف ہے۔

عرفی شیرازی کہتا ہے۔

"ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ　　اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست"

غالب مرحوم نے اسی مضمون کو دوسرے لباس میں اسطرح جلوہ گر کیا ہے۔

"محرم نہیں ہی توہی نوا ہائے راز کا یہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا"

اگرچہ گمان غالب یہ ہی کہ **عرفی** کی رہبری اس خیال کیطرف قرآن مجید کی اس آیت سے ہوئی ہوگی۔ "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ" لیکن ہرحالت میں عرفی کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہی۔ اورجس اسلوب میں کہ یہ خیال اُس سے ادا ہو گیا ہے۔ اب اس سے بہتر اسلوب ہاتھ آنا دشوار ہے۔ باایں ہمہ مرزا کی جدت اور تلاش بھی کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے کہ جس مضمون میں مطلق اضافہ کی گنجایش نہ تھی اُسمیں ایسا لطیف اضافہ کیا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی سکے لطف معنی سے بھی خالی نہیں ہے **عرفی** کا یہ مطلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں وہی درحقیقت اسرار ہیں **مرزا** یہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں مانع کشف راز معلوم ہوتی ہیں وہی درحقیقت کاشف راز ہیں۔

بہر حال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ متاخرین قدما کے کلام سے کرتے رہے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ شعرائے عرب جب کوئی اچھوتا مضمون باندھتے تھے اور لوگ متعجب ہوکر اُنسے پوچھتے تھے کہ کس تقریب سے یہانتک ذہن پہنچا؟ تووہ صاف صاف اپنے خیال کا ماخذ بتادیتے تھے **ابونواس** نے **فضل** بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔ "وَلَیْسَ لِلّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ + اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ" (یعنی خدا سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تمام عالم کو ایک شخص کی ذات میں جمع کردے) اسپر کسی نے اُس سے پوچھا کہ یہ مضمون کیونکر سوجھا؟ **ابونواس** نے صاف کہدیا کہ یہ خیال **جریر** کے اُس شعر سے پیدا ہوا جو اُسنے **بنی تمیم** کی تعریف میں کہا ہے۔

"إِذَا غَضِبَتْ عَلَيْكَ بَنُو تَمِيمٍ حَسِبْتَ النَّاسَ كُلَّهُمُ غِضَابًا"

(یعنی جب بنی تمیم تجھسے ناراض ہوجائیں تو سمجھنا چاہیئے کہ تمام بنی آدم تجھسے ناراض ہیں)

شعر ہی پر کچھ موقوف نہیں بلکہ تمام علوم و فنون میں انسان نے اسیطرح ترقی کی ہے کہ اگلے جو ادھورے نمونے چھوڑتے گئے پچھلے اُنمیں کچھ کچھ تصرف کرتے رہے یہانتک کہ ہر ایک علم اور ہر ایک فن کمال کے درجہ کو پہنچ گیا۔ شعر کی ترقی بھی اسیطرح متصور ہے کہ قدما کے خیالات میں کچھ کچھ معقول تصرفات ہوتے رہیں۔ لیکن اس قسم کے تصرفات کرنیکے لیئے شاعری کی پوری لیاقت ہونی چاہیئے۔ ورنہ جیسے ایجادات ہمارے ملک کے اکثر شعرا کرتے ہیں اُنسے بجائے ترقی کے روز بروز شاعری نہایت ذلیل و پست و حقیر ہوتی جاتی ہے۔

فارسی میں کم اور عربی میں زیادہ اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں نظم سے بھی زیادہ ہر قسم کے بلند۔ لطیف اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے پس ہمارے ہموطنوں میں جو لوگ ایسے دماغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کر کے اُنمیں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مبلغ فکر کے موافق تصرف کر کے۔ اور جنکی قوت متخیلہ اُنسے کم درجہ کی ہے وہ اُنھیں خیالات کو بعینہ اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ترجمہ کر کے اُردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں۔ سنسکرت اور بھاشا میں خیالات کا ایک دوسرا عالم ہے اور اُردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اسلیئے ان زبانوں سے بھی خیالات کے اخذ کرنے میں کمی نہ کریں اور جہانتک کہ اپنی زبان میں اُنکے ادا کرنے کی طاقت ہو اُنکو شعر کے لباس میں ظاہر کریں۔ اور

اسطرح اردو شاعری میں ترقی کی روح پھونکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعرا نے جو کہیں کہیں فارسی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کیا ہے اُنپر لوگوں نے اعتراض کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے ایک زبان کے شعر کا عمدہ ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے ایک [illegible] نے سارا سکندرنامہ بحری اُردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے اور ہمنے سُنا ہے کہ وہ شاہ جی تھے اور مولوی بھی اُنکے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کرے میوہ زیبا جو شاخ کو	کدیور فراش کرے خاک کو
ہوا جبکہ آراستہ باغ خوش	بہر میوۂ شیریں وہم ترش
بہ شادی لبِ پستہ خنداں ہوا	رطب انبہ بھی تیز دنداں ہوا
ہوا چہرۂ نار افروختہ	کہوں تاج پر لعل جوں دوختہ
بہ رغبت بہ ہر شاخ انجیر دار	لٹکنے لگے مرغ انجیر خوار
اُٹھایا لبِ خُم نے جوشِ نغیر	ہم از بوے شیر و ہم از بوے شیر

شاید اس مترجم کی نسبت تو یہ کہا جاسکے کہ وہ مشاق شاعر نہ تھا اسلیے عمدہ ترجمہ نہ کرسکا لیکن ہم مشاق شاعروں سے کہتے ہیں کہ از راہ عنایت زیادہ نہیں تو انھیں چند شعروں کو فصیح اردو نظم میں تو ذرا لکھ دیں جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے گو اس سے اُسکی قوت متخیلہ کا کمال ثابت نہیں ہوتا مگر ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

ہمارے بعض شعرا نے بعضے ایسے خیالات کو جو فارسی اشعار میں تھے اُردو میں ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ من وجہٍ اصل شعر سے بڑھ گئے ہیں **نظیری** کا شعر ہے

"بوی یارِ من ازیں سُست وفا مے آید گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم"

سودا کہتے ہیں

"کیفیتِ چشم اُسکی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

اسمیں شک نہیں کہ **سودا** نے اپنی شعر کی بنیاد **نظیری** کے مضمون پر رکھی ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ تھوڑے ۔ تغیر کے ساتھ اُسکا ترجمہ کردیا ہے۔ لیکن بلاغت کے لحاظ سے **سودا** کا شعر **نظیری** سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی ممکن ہے کہ عاشق ازخود رفتہ ہوجائے لیکن ساغر شراب کو دیکھکر معشوق کی نشیلی آنکھ کے تصور سے بیخود ہوجانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اسکے سوا "از کار شدم" میں وہ تعمیم نہیں ہی جو اسمیں ہے کہ "چلا میں" نہیں معلوم کہ آپے سے چلا یا دین و دنیا سے چلا یا جگہ سے چلا۔ یا کہانسے چلا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "چلا میں" ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مدہوش و بدحواس ہوکر گرنے کو ہوتا ہے اور "از کار شدم" میں یہ بات نہیں ہی۔ معطل ہونے۔ معزول ہونے۔ اپاہج اور نکمے ہونے کو بھی "از کار شدن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

لا اعلم

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منی را افسردہ دل افسردہ کند انجمنی را

خواجہ میر درد

دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو　　نہ کہیں عیش تمھارا ابھی منغص ہو جائے

ممکن ہے کہ خواجہ میر درد نے فارسی شعر سے یہ مضمون اخذ کیا ہو لیکن یقیناً اُنکا شعر فارسی شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اول تو فارسی مطلع کے مضمون کو اپنے مقطع میں لانا جسمیں خود درد کا لفظ ہی شاعر کے دعوے پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ پھر راہ مدہ کی جگہ یاد کرو بولنا جسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ درد کا اپنی محفل میں ذکر نہ کرو دوسرے یاد کرنے کے معنی ہیں اعلے کا ادنے کو اپنے پاس بُلانا۔ اور بڑی خوبی درد کے شعر میں یہ ہے کہ محفل میں نہ بلانے کی وجہ جو فارسی میں یقینی طور پر بیان کی گئی ہے اُسکو میر درد نے احتمال کیصورت میں اسطرح بیان کیا ہے "نہ کہیں عیش تمھارا ابھی منغص ہو جائے" ان دونو اسلوبوں میں ایسا ہی فرق ہے۔ جیسے ایک شخص تو بیمار سے یوں کہے کہ "بد پرہیزی سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے"۔ اور دوسرا یہ کہے "دیکھو کہیں بد پرہیزی میں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو"۔ دوسرے اسلوب میں جیسا کہ ظاہر ہے بہ نسبت پہلے اسلوب کے زیادہ تخویف و تحذیر ہے۔

سعدی شیرازی

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟

میر تقی

پیار کرنے کا جو خوباں ہمپہ رکھتے ہیں گناہ　　اُنسے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے؟

میر کا یہ شعر ظاہرا سعدی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ مگر سعدی کے ہاں **خوب** کا لفظ ہے اور میر کے ہاں **پیارے** کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کہ **خوب** کا محبوب ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے لیکن **پیارے** کا پیارا ہونا ضرور ہے پس **سعدی** کے سوال کا جواب ہو سکتا ہے مگر **میر** کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترجمہ کرنا بشرطیکہ ترجمہ کے فرائض پورے پورے ادا ہو جائیں کوئی عیب کی بات نہیں ہو سکتی۔ سعدی جو فارسی شاعری کا ہومر ہے خود اُسکے کلام میں عربی اقوال و امثال کے ترجمے یا اُنکا ماحصل موجود ہے۔ مثلاً

سعدی	اقوال عربی
۱- سگ بدریاے ہفتگانہ بشوے چونکہ ترشد پلیدتر باشد	ع- الکلبُ نجسٌ مایکونُ اِذا اغتسل
۲- ترا خامشی اے خداوند ہوش وقارست و نااہل را پردہ پوش	الصّمتُ زِینۃ العالم وستر الجاہل
۳- تو بجاے پدر چہ کردی خیر تا ہماں چشم داری از پسرت	دَاعِ اباك یرِاعِ ابنُك
۴- شپرہ گر نورِ آفتاب نخواہد رونق بازارِ آفتاب نکاہد	سناءُ ذُکاءٍ لاین ول من دعاء الخفاش
۵- نیکبخت آنکہ خورد و کشت و بدبخت آنکہ مرد و ہشت	السعید من اکل وزرع والشقی من مات وودع

۶- پادشاہاں بخردمنداں محتاج تراند کہ خردمنداں بہ پادشاہاں۔ — السلطان احوج الی العقلاء من العقلاء الی السلطان۔

اہل یوروپ جو آج لٹریچر میں بھی مثل علوم وفنون وصنائع کے تمام دنیا سے فائق ہیں اسکا سبب اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی مشہور قوم ایسی نہیں جسکی شاعری اور انشا کا لب لباب اُنکی زبانوں میں موجود نہو۔ پس ہمکو بھی چاہیئے کہ جسقوم اور جس زبان کے خیالات ہمکو بہم پہنچیں اُنسے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اُٹھائیں اور صرف اُنھیں چند فرسودہ اور بوسیدہ خیالات پر جو صدیوں سے برابر بندھتے چلے آتے ہیں قناعت کرکے نہ بیٹھ رہیں کیونکہ علم و ہنر میں قناعت ویسی ہی قابل ملامت ہی جیسی مال و دولت میں حرص۔

۴- جسطرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسیطرح اُسکی زبان بھی ایک خاص دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ چند معمولی مضمون جب صدیوں تک برابر رٹے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ اُنکے ساتھ مخصوص ہوجاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سُننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُن الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو اُنھیں کے ہم معنی ہوں استعمال کیئے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

عشقیہ مضامین ہمارے ہاں کچھ غزل ہی کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے۔ بلکہ قصیدے اور مثنوی میں بھی برابر اُنھیں کا عمل دخل رہا ہے۔ فارسی اور اُردو زبانوں میں چند کے سوا کل مثنویاں عشقیہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ اسیطرح قصائد کی تمہیدوں میں بھی زیادہ تر یہی دُکھڑا رویا گیا ہے۔ واسوخت تو عشق کی پسلی ہی سے پیدا ہوا ہے لیکن چونکہ قصیدہ مثنوی اور

واسوخت کا میدان وسیع ہے۔ لہذا اُسمیں غریب اور اجنبی الفاظ کی بہت کچھ کھپت ہوسکتی ہے۔ بخلاف غزل کے کہ یہاں ایک لفظ بھی غیر مانوس ہو تو اوٗلوٗ معلوم ہوتا ہے۔ گلاب کے تختہ میں کانٹے بھی پھولوں کیساتھ نبھ جاتے ہیں۔ مگر گلدستہ میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے اسیواسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے انکو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیئے جاتے تھے اُنھیں الفاظ کو اِن بزرگوں نے مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ و تمثیل میں اپنے اعلیٰ خیالات ظاہر کیئے ہیں۔ پس غزل میں ضرور ہے کہ نسبت اَور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اُردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی ہے وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا ہے۔ اُردو میں **ولی** سے لیکر **انشا** اور **مصحفی** تک عموماً سب کی غزلمیں صفائی۔ سادگی۔ روزمرہ کی پابندی۔ بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے۔ انکے بعد دلّی میں ممنون۔ غالب۔ مومن اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی ترکیبوں نے اُردو غزل میں بلاشک زیادہ دخل پایا۔ مگر یہ لوگ بھی اعلیٰ درجہ کا شعر اُسیکو سمجھتے تھے جسمیں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اُردو کے محاورہ میں ادا ہو جاتا تھا۔ اُن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ "غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک یا دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعرا شتر گربگی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ ایک دو شعر اچھا نکل آیا۔ باقی کم وزن اور پھسپھسے شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا۔ ہم لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے

چُست کر دیتے ہیں تاکہ بادی النظر میں حقیر نہ معلوم ہوں"۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ اُنھیں معمولی خیالات کو جو مدت سے مختلف شکلوں میں بندھتے چلے آتے تھے بہت کم باندھتے تھے بلکہ ہر شعر میں جدّت پیدا کرنی چاہتے تھے۔ اسلئے اُردو روزمرہ کا سررشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا تھا۔ باایں‌ہمہ غزلیت کی شان اُنکے تمام کلام میں پائی جاتی ہے اور صاف و بامحاورہ اور بلند اشعار اُنکے ہاں بھی نسبتاً اُتنے ہی نکل سکتے ہیں جتنے کہ قدما کی غزلیات میں۔ **ذوق** کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں **ظفر** کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے۔ لیکن اُسمیں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ **داغ** کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی۔ روزمرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طرزِ ادا میں ایک شوخی اور تیکھاپن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہے۔ مگر نہایت تعجب ہے کہ **لکھنؤ** میں متاخرین نے سادگی اور صفائی کا غزل میں بہت کم خیال رکھا ہے باوجودیکہ زبان کے لحاظ سے دلّی اور لکھنؤ میں کوئی معتدبہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اِسکے سوا **شجاع الدولہ** کے زمانہ سے **سعادت علی خاں** کے وقت تک اُردو کے تمام نامور شعرا کا جمگھٹا لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر۔ سودا۔ سوز۔ جرأت مصحفی اور انشا وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے۔ مگر متاخرین کی غزل میں اُنکی طرزِ بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلّی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلّی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا

لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی۔ اُسوقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جسطرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہمکو فوقیت حاصل ہے اسیطرح زبان اور لب لہجہ میں بھی ہم دلی سے فایق ہیں۔ لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنیکے لیئے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے۔ چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی خود بخود طبیعتیں اسباب کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُنکی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔ یہانتک کہ سیدھی سادی اُردو اُمرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہوگئی بلکہ جیسا ثقات سے سُنا گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔ نظم میں **جرأت** اور **ناسخ** کے دیوان کا اور نثر میں **باغ و بہار** اور **فسانہ عجائب** کا مقابلہ کرنیسے اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بااینہمہ انصاف یہ ہے کہ مرثیہ اور مثنوی میں خاص خاص شخصوں پر (جیساکہ آگے بیان کیا جائے گا) زمانہ کے اقتضا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ اُنھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اُسکو بزرگوں کا تبرک سمجھکر اس انقلاب کے زمانہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔

بہرحال غزل میں زبان اور بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضرور ہے

۱- ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ اُسکو ہر قسم کے جذبات کا ارگن بنانا چاہیئے۔ یہ بھی ظاہر ہے

کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے اُسکی ایک خاص زبان قرار پاگئی ہے اور وہ اسقدر کانوں میں رچ گئی ہے کہ اگر دفعتہً اسمیں کثرت سے غیر مانوس اور اجنبی ترکیبیں اور اسلوب بیان داخل ہوجائیں تو غزل ایسی ہی گٹھل ہوجائے جیسی کہ بعض شعرا کی غزل عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اختیار کرنیسے ہوگئی ہے۔ حالانکہ غزل کو باعتبار مضامین کے وسعت دینا بظاہر اسباب کا مقتضی ہے کہ زبان اور طریقۂ بیان کو بھی وسعت دیجائے۔ پس ضرور ہی کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طریقۂ بیان میں دفعتہً کوئی بڑی تبدیلی بھی واقع نہو اور باوجود اسکے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہوسکیں

آجکل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعرا نے کبھی نہیں باندھے تھے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ اُس خاص زبان میں جو شعرا کی کثرت استعمال سے کانوں میں رچ گئی ہے ادا نہیں کیے جاتے۔ بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں۔ اُنھیں الفاظ میں ظاہر کردیئے جاتے ہیں اسلیئے وہ مقبول خاص و عام نہیں ہوتے۔ لیکن نئی طرز کی عام شاعری اگر سردست مقبول نہ ہو تو کچھ حرج نہیں جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اُس سے آشنا ہوجائینگے۔ اور سچی باتوں کی لذت اور حلاوت سے واقف ہونگے اُسوقت وہ خود بخود مقبول ہوجائے گی۔ البتہ غزل کو ابتدا ہی سے جہانتک ممکن ہو علم پسند اور مطبوع طبائع بنانا ضرور ہے۔ کیونکہ یہی ایسی صنف ہی۔ جو خاص و عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اسی کے اشعار ہر شخص کو بآسانی یاد رہ سکتے ہیں اور یہی تمام خوشی کے جلسوں اور سماع کی مجلسوں اور یاروں کی صحبتوں میں گائی

اور پڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں نیچرل شاعری پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیئے جائیں۔ اُسکو تمام انسانی جذبات کے ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اسکے اُسکو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہو۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اول اول اُسی زبان اور اُسی روزمرہ میں ادا ہونی چاہئیں جسمیں پُرانے اور پست خیالات ادا کیئے جاتے تھے یہ ہے کہ کلام الٰہی میں تمام روحانی اور اخلاقی باتیں ویسے ہی محاورات و تشبیہات و استعارات و تمثیلات میں بیان کی گئی ہیں جنمیں شعراے جاہلیت عشقیات و خمریات اور تفاخر و مدح و ذم وغیرہ کے مضامین بیان کرتے تھے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتہً ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے مگر زبان میں دفعتہً وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیئے جاتے ہیں اور اُنکو رفتہ رفتہ پبلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے۔ اور قدیم اسلوب جو کانونمیں رچ گئے ہیں اُنکو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شاعرانہ خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہو جائیں۔ تو بھی جن الفاظ کے ذریعہ سے وہ خیالات ظاہر کیئے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیئے جاتے۔ فرض کرو کہ آسمان کا وجود اور اُسکا گردش کرنا۔ زمین کا ساکن ہونا۔ پانی اور ہوا کا بسیط ہونا۔ عناصر کا چار میں منحصر ہونا۔ جام جم کا جہاں نما ہونا ظلمات میں چشمۂ حیواں کا مخفی ہونا۔ سیمرغ اور

دیو و پری کا موجود ہونا اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں علم انسانی کی ترقی سے غلط ثابت ہو جائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بالکل دست بردار ہو جائے۔ بلکہ اُسکا کمال یہ ہے کہ حقائق و وقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو اُنھیں غلط اور بے اصل باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور اُس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے۔ ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اُسنے اپنے منتر میں سے وہی اچھر بھلا دیئے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے

بہرحال جو لوگ اُردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اُسکو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اُنکا فرض ہے کہ اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں اور غیر مانوس الفاظ کم برتے جائیں۔ مگر نامعلوم طور پر رفتہ رفتہ اُنکو بڑھاتے رہیں۔ اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور معمولی الفاظ و محاورات پر رکھیں۔ مگر الفاظ کے حقیقی معنوں ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ اُنکو کبھی حقیقی معنوں میں کبھی مجازی معنوں میں۔ کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرایہ میں استعمال کریں۔ ورنہ ہر قسم کے خیالات ایک ہی تلی زبان میں کیونکر ادا کیے جا سکتے ہیں۔ ہم اسمقام پر **علم بیان** کے اصول جنسے ایک ایک مطلب کو متعدد پیرایوں میں ادا کرنا۔ اور ایک ایک لفظ کو مختلف موقعوں میں برتنا آتا ہے۔ بیان کرنے نہیں چاہتے۔ کیونکہ اُنکی تفصیل عربی۔ فارسی اور نیز اُردو رسالوں میں مل سکتی ہے۔ مگر ہم فارسی اور اُردو غزل کے کسیقدر اشعار بطور مثال کے نقل کرتے ہیں جنمیں اخلاق اور تصوف کے مضامین عشق مجازی اور تغزل کے پیرایہ میں ادا کیے گئے ہیں

اور اجنبی خیالات کے ظاہر کرنے میں ایک محدود اور معمولی زبان سے کام لیا گیا ہے۔

از دیوان خواجہ حافظ

طرزِ بیان	مضمون
روے تو کس ندید و ھزارت رقیب ہست در غنچہ ہنوز و صدت عندلیب ہست	تمام عالم خدا کا نادیدہ مشتاق اور طالب ہے
عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ای خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست	خدا کے طالبِ صادق کبھی محروم نہیں رہتے
صبحدم مرغ چمن باگل نوخاستہ گفت ناز کم کن کہ دریں باغ بسی چون تو شگفت گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولے ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نہ گفت	دوست کو الزام دیکر شرمندہ کرنا شرطِ دوستی کے برخلاف ہے۔
گفتم اے مسندِ جم جامِ جہاں بینت کو گفت افسوس کہ آں دولتِ بیدار بخفت	اقبالمندی کا زمانہ ہمیشہ نہیں رہتا۔
ساقی بیار بادہ کہ ماہِ صیام رفت در دہ قدح کہ موسمِ ناموس و نام رفت وقتِ عزیز رفت۔ بیا تا قضا کنیم عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت	جس طاعت میں ریا کا لگاؤ ہو اُس سے معصیت بہتر ہے۔

مضمون	طرزِ بیان
باوجودیکہ خدا تک کسی کی رسائی نہیں پھر اُسکے بھید دنیا میں کیونکر ظاہر ہوگئے۔	صبا زروی تو باہر گلے حدیثے کرد رقیب چوں رہِ غمّاز داد در حرمت
سب کوششوں میں ناکام ہوکر خدا کی طلب میں کوشش کرنی۔	عشق می ورزم و امید کہ ایں فنِ شریف چوں ہنرہای دگر موجب حرماں نشود

از دیوان خواجہ میر درد

دنیا میں سب سے ملنا مگر سب سے بے تعلق رہنا۔	اے درد یھاں کسو سے نہ دل کو لگائیو لگ چلیو سب سے یوں تو پہ جی مت پھنسائیو
قربِ الٰہی میں بڑے بڑے خطرات ہیں۔	کاش تا شمع نہو تا گذرِ پروانہ تمنے کیا قہر کیا بال و پرِ پروانہ
سالک کی غایت مقصود فنا ہے۔	ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اُس نے رہروو! رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ
سِرِّ باطن کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہیئے۔	ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے کوئی اِس ۞ بات سے نہ ہو آگاہ
بندہ اور خدا کے بیچ میں کسی واسطہ کی گنجائش نہیں۔	قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے اُسکا پیام دل کے سوا کون لا سکے

۞ اس بات کے لفظ میں جو لطف ہو اُسکو اہل زبان سمجھ سکتے ہیں ۱۲

مضمون	طرزِ بیان
کائنات کے تمام جلوے مظہرِ تجلیاتِ الٰہی ہیں	گذر اب ہے صبا کون بتا آج ادھر سے گلشن میں۔ ترے پھولوں کی۔ یہ باس نہیں ہے
کُلَّ یَومٍ هُوَ فِی شَأنٍ	دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
باخدا لوگوں کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے۔	بسا ہے کون ترے دلمیں گلبدن اے درد کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینے سے
عشقِ الٰہی تمام تعلقات سے نجات دیتا ہے	اُسکے خیالِ زلف نے سب سے ہمیں چھڑا دیا گرچہ پھنسے ہیں دام میں دل کو مگر فراغ ہے
جہاں موت کا کھٹکا ہو وہاں ایکدم یادِ خدا سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔	ساقیا یہاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

از دیوان سودا

مضمون	طرزِ بیان
شیخ کو چاہیئے کہ سالک کو تعلیم فنا سے پہلے دنیا کے تعلقات سے متنفر کرے۔	خانہ پرورِ چمن ہیں آخر اے صیاد ہم اتنی رخصت دے کہ ہولیں گل سے ٹک آزاد ہم
دنیا میں فی الحقیقۃ کوئی چیز دلبستگی کے قابل نہیں	خندۂ گل بے نمک فریادِ بلبل بے اثر اس چمن سے کہہ تو۔ جا کر کیا کرینگے یاد ہم
دنیا کی کسی نعمت کو ثبات نہیں۔	اے گل صبا کی طرح پھرے اس چمن میں ہم

مضمون	طرز بیان
	پائی نہ بو وفا کی ترے پیرہن میں ہم
دنیا میں عروج کیساتھ ہی تنزل لگا ہوا ہے	نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبح چمن ہم نے
	گل ادھر لیگئے گلچیں گئی روتی اُدھر شبنم
جو دنیا کو بے ثبات جانتے ہیں وہ بھی اپنی بے ثباتی سے غافل ہیں۔	بھلا گل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر
	بتا روتی ہے کس کی ہستیٔ موہوم پر شبنم
خدا کی۔ بندے کی۔ قوم کی۔ ملک کی۔ کسی کی محبت کیوں نہو اُسپر ملامت ہونی ضرور ہے	دلا اب سر کو اپنے پھیر مت سنگ ملامت سے
	یہی ہوتا ہے ناداں عشق کا انجام دنیا میں
جو کام کرنے ہیں اُنمیں دیر کرنی نہیں چاہیئے۔	ساقی ہے اک تبسم گل فرصت بہار
	ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں
جسقدر دُنیا کی محبت بڑھتی جاتی ہے اُسیقدر مشکلات زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔	اس کشمکش سے دلم کی کیا کام تھا ہمیں
	اے اُلفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

ذوق

مضمون	طرز بیان
اگر دلوں میں دنیا کی محبت باقی نہ رہے تو دنیا کے سب کام بند ہو جائیں۔	بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
	پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
بہت سے جوہر قابل پہلے اس سے کہ اپنے جوہر دکھلائیں خاک میں ملجاتے ہیں۔	کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی۔ صبا! دکھلا گئے
	حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مضمون	طرز بیان
توکل کی شان۔	احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
تعلقات دنیوی کے نتائج۔	اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے لگایا جی کو اپنے روگ جب سے دل لگا بیٹھے

غالب

مضمون	طرز بیان
عُزلت نشینی میں کوئی خطرہ نہیں۔	نَے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
تیز زبان آدمی کی ہر کوئی شکایت کرتا ہے	گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اسقدر کی جس سے بات اُسنے شکایت ضرور کی
رنج اور تکلیف سب خدا کیطرف سے ہے۔	جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس رنگ میں جو آئے
غلبۂ یاس میں مطلب ہاتھ سے جاتا رہتا ہے	سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
خدا تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔	تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

شیفتہ

مضمون	طرز بیان
خدا غریبوں کے جھونپڑے میں ہے۔	فانوس و شیشہ ولگن زر سے کیا حصول وہ ہے وہاں جہاں نہیں روغن چراغ میں
مشائخ کے ہر ایک سلسلہ کی نسبت میں جدا کیفیت ہوتی ہے۔	ہی امتزاج مشک مے لعل فام میں آتی ہے بوئے غیر ہمارے مشام میں
نفس کی رعونت جس طریقہ سے کم ہو سکے بہتر ہے۔	نفس سرکش کی کسی ڈھب سے رعونت کم ہو چاہتا ہوں وہ صنم جس میں محبت کم ہو
خدا کی ذات مکان اور جہت سے پاک ہے۔	وہ آہوے رمیدہ کہ ہم جسکے صید ہیں نہ وادی تتار نہ دشت ختن میں ہے
لہو و لعب سے دفعۃً کنارہ کش ہو کر اطمینان کلی حاصل کرنا۔	ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اگرچہ اس قسم کے اشعار سے فارسی کے خاص خاص دیوان بھرے ہوئے ہیں اور اردو میں بھی تلاش کرنیسے ایسے اشعار اور زیادہ دستیاب ہو سکتے ہیں مگر یہ اسلوب زیادہ تر تصوف کے مضامین سے خصوصیت رکھتے ہیں ہر قسم کے نیچرل خیالات ادا کرنیکے لیے صرف یہی اسلوب کافی نہیں ہو سکتے جب تک کہ شاعر انکو عمدہ طور پر ہر موقع کے مناسب استعمال کرنے کی لیاقت اور انھیں میں ملتے جلتے نئے اسلوب پیدا کرنیکا ملکہ نہ رکھتا ہو ہمارے نزدیک اسکا گر یہ ہی کہ جہانتک ہو سکے استعارہ و کنایہ و تمثیل کے استعمال اور محاورات

برتنے پر قدرت حاصل کرنی چاہیئے۔

استعارہ و کنایہ اور تمثیل کی تعریف اور انکی قسمیں علم بیان کی کتابوں میں دیکھنی چاہیئیں یہاں ہم صرف اسقدر کہنا چاہتے ہیں کہ استعارہ بلاغت کا ایک رکن اعظم ہی اور شاعری کو اُسکے ساتھ وہی نسبت ہی جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ ہی کے قریب قریب ہی۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انھیں کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے۔ اور جہاں اُسکو اپنا منتر کارگر ہوتا نظر نہیں آتا وہاں انھیں کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

بعض مضامین فی نفسہ ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں کہ اُنکو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے۔ مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان اُنکو ادا کرتے وقت رو دیتی ہے اور معمولی اسلوب اُنمیں اثر پیدا کرنیسے قاصر ہوتے ہیں ایسے مقام پر اگر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل وغیرہ سے مدد نہ لیجائے تو شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معمولی بات چیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً داغ کہتے ہیں۔

دلِ بیتاب وہاں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا ۔ گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی

اس شعر میں دیر لگانے کو موت آنے اور مر رہنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ دونو لفظ نہ ہوں بلکہ اسطرح بیان کیا جائے کہ قاصد نے تو بہت دیر لگائی اے دل کہیں تو بھی دیر نہ لگائیو تو شعر میں کچھ جان باقی نہیں رہتی۔

یا مثلاً مرزا **غالب** کہتے ہیں۔

کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے مصرع میں طنزاً بطور استعارہ کے " دیر پشیماں " کی جگہ " زود پشیماں " کہا گیا ہی جس سے شعر میں جان پڑ گئی ہی۔ یہ ویسا ہی استعارہ ہی۔ جیسا قرآن مجید میں اَنۡذِرۡهُمۡ کی جگہ بَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ فرمایا ہے۔

اسیطرح **میر تقی** کہتے ہیں۔

کہتے ہو اتحاد ہے ہمکو ہاں کہو اعتماد ہے ہمکو

یہاں بھی " اعتماد نہیں ہے " کی جگہ طنزاً " اعتماد ہے " کہا گیا ہے۔

مرزا **غالب** کہتے ہیں۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہی مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دوسرے مصرع کا اصل مدعا یہ تھا کہ وفاداری ایسی عمدہ صفت ہی کہ اگر برہمن وفاداری کیساتھ ساری عمر بتخانہ میں نباہ دے تو اُسکے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہیئے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے مُسلمان کے ساتھ کرنا زیبا ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اگر وہ بتخانہ میں مَرے تو اُسکو کعبہ میں دفن کرنا چاہیے۔ جو خوبی اس عنوانِ بیان میں ہی وہ ظاہر ہے۔

دوسری جگہ مرزا **غالب** کہتے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھکے گھر یاد آیا

دوسرے مصرع میں بطور کنایہ کے " خوف معلوم ہوا " کی جگہ " گھر یاد آیا " کہا گیا ہے کیونکہ

جنگل میں خوف معلوم ہونے کو گھر یاد آنا لازم ہے اور چونکہ اسمیں صنعتِ ایہام بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اسلیئے شعر میں اور زیادہ لطف پیدا ہوگیا ہے۔ یعنی اسمیں یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اسقدر ویران ہے کہ دشت کو دیکھکر گھر یاد آتا ہے۔

مرزا **غالب** کا فارسی شعر ہے۔

هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز گسسته لنگر کشتی و ناخدا خفتست

اس شعر میں اپنی مشکلات اور سختیوں کو بطور تمثیل کے بیان کیا ہے جس حالت کو شاعر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے وہ کچھ ہی کیوں نہو اگر اُسکو صاف اور سیدھے طور پر جیسی کہ وہ ہے بیان کیا جائے تو وہ ہرگز دو مصرعوں میں نہیں سما سکتی۔ اور باوجود اسکے جس ہیبت ناک صورت میں اُسکو یہ تمثیل کا پیرایہ ظاہر کرتا ہے یہ بات ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔

مرزا **غالب** کا اُردو شعر ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے اڑنے نپائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر میں بھی اسبات کو کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقات دنیوی میں پھنسا بطور تمثیل کے بیان کیا ہے۔ اور اس عنوان بیان کی خوبی ظاہر ہے۔

بہر حال شاعر کا یہ ضروری فرض ہے کہ مجاز و استعارہ و کنایہ و تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے تاکہ ہر روکھے پھیکے مضمون کو آب و تاب کے ساتھ بیان کر سکے۔ لیکن استعارہ وغیرہ میں اسبات کا خیال رکھنا ضرور ہے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں ورنہ شعر چیستان اور معما بنجائیگا۔ مثلاً **شاہ نصیر** کہتے ہیں۔

چرائی چادرِ مہتاب شب میکش نے جیحوں پر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

چادرِ مہتاب چرانے سے۔ چاندنی کا لطف اُٹھانا اور اُس سے متمتع ہونا مراد رکھا ہے جو نہایت بعید الفہم ہے۔ جن لوگوں نے استعارہ وغیرہ کے استعمال میں مذکورۂ بالا اصول کو ملحوظ نہیں رکھا اُنکا کلام ہمیشہ نامقبول اور متروک رہا ہے۔ جیسے بدر چاچی کے قصائد جنمیں نہایت بعید الفہم استعارے استعمال کیئے گئے ہیں۔ کہیں آہوے مادہ سے آفتاب مرادلی ہے۔ کہیں اشکِ زلیخا سے کواکب۔ کہیں اعمیٰ سے برجِ عقرب۔ کہیں برگِ بنفشہ سے حروف۔ کہیں آبِ خشک سے پیالہ۔ کہیں پنج دریا سے پانچ انگلیاں۔ اور اسیطرح کہیں زمین سے آسمان اور کہیں آسمان سے زمین۔

اُردو میں شعرا نے استعارہ کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے۔ کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کرکے دیکھا جائے تو استعارہ پر ہوتی ہے مثلاً جی اچٹنا اسمیں جی کو اُن چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اُچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر۔ پتھر۔ گیند وغیرہ۔ یا مثلاً جی بٹنا۔ اسمیں جی کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہی جو منقسم اور متفرق ہوسکے۔ آنکھ کھلنا۔ دل کملانا۔ غصہ بھڑکنا۔ کام چلنا۔ اور اسیطرح ہزارہا محاورے استعارہ پر مبنی ہیں۔ اور یہ وہ استعارے ہیں جنہیں شعرا کی کارستانی کو کچھ دخل نہیں ہی بلکہ نیچرل طور پر بغیر فکر اور تصنع کے اہلِ زبان کے مونہ سے وقتاً فوقتاً نکلکر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوا ہے۔ مگر اردو شعرا نے تمثیل کو بہت کم برتا ہے۔ البتہ نئی طرز کی شاعری میں اُسکا کچھ کچھ رواج ہوتا چلا ہے اور

ضرورت نے لوگوں کو اسکے برتنے پر مجبور کیا ہے چونکہ اس موقع پر استعارہ کی تقریب سے محاورہ کا ذکر آگیا ہے اسلیئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محاورہ کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کیجائیں۔

ب **محاورہ** لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں خواہ وہ بات چیت اہلِ زبان کے روزمرہ کے موافق ہو خواہ مخالف۔ لیکن اصطلاح میں خاص اہل زبان کے روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ **محاورہ** تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لُغت کے کہ اُسکا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بمنزلہ مفرد کے[8] ہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں جنپر الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ دونو کو ملا کر جب پانسات بولینگے۔ تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے قیاسی نہو۔ بلکہ معلوم ہو کہ اہل زبان اسکو اسیطرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانسات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اُسکو محاورہ نہیں کہنے کے۔ کیونکہ اہل زبان کبھی اسطرح نہیں بولتے۔ یا مثلاً بلا ناغہ پر قیاس کر کے اُسکی جگہ بے ناغہ۔ ہر روز کی جگہ ہر دن۔ روز روز کی جگہ دن دن۔ یا آئے دن کی جگہ آئے روز بولنا۔ ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ الفاظ

---

8 جیسے تیس اور اکتیس۔ تیس مفرد ہے۔ اور اکتیس مرکب بمنزلہ مفرد ۱۲

اسطرح اہل زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا اطلاق خاصکر اُن افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کیساتھ ملکر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اُتارنا۔ اسکے حقیقی معنی کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو اتارنا کھونٹی سے کپڑا اتارنا۔ کوٹھے پر سے پلنگ اُتارنا۔ لیکن ان میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقشہ اُتارنا۔ نقل اُتارنا۔ دل سے اُتارنا۔ دل میں اُتارنا۔ ہاتھ اُتارنا۔ پہنچا اُتارنا۔ یہ سب محاورے کہلائینگے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنے کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے۔ یا مثلاً کھانا۔ اسکے حقیقی معنی کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اُتار نیکے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا۔ دوا کھانا افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسیکو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا۔ قسم کھانا۔ دھوکا کھانا۔ پچھاڑیں کھانا۔ ٹھوکر کھانا یہ سب محاورے کہلائینگے۔

محاورہ کے جو معنی ہمنے اول بیان کیئے ہیں وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں لیکن دوسرے معنی پہلے معنی سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اُسکو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اُسکو دوسرے معنوں

کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا ٹنٹا کرنا)۔ اسکو دونو معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ترکیب اہل زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے۔ اور نیز اسمیں "تین پانچ" کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ لیکن روٹی کھانا۔ یا میوہ کھانا۔ یا پانسات یا دس بارہ وغیرہ صرف پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پا سکتے ہیں۔ نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے۔ کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہل زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں۔ مگر انمیں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا۔ آیندہ ہم ان دونو معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورہ پر **روزمرہ** کا اور دوسری قسم پر **محاورہ** کا اطلاق کرینگے۔

روزمرہ اور **محاورہ** میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے۔ روزمرہ کی پابندی جہانتک ممکن ہو تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ یہانتک کہ کلام میں جسقدر کہ روزمرہ کی پابندی کم ہوگی اُسیقدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائیگا۔ مثلاً "کلکتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا"۔ یہ جملہ روزمرہ کے موافق نہیں ہے۔ بلکہ اسکی جگہ یوں ہونا چاہیئے "کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا"۔ یا مثلاً "آج تک اُنسے ملنے کا موقع نہ ملا"۔ یہاں **نہ ملا** کی جگہ **نہیں ملا** چاہیئے۔ یا "وہ خاوند کے مرنیسے درگور ہوئی"۔ یہاں **زندہ درگور ہوگئی** چاہیئے۔ یا "سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہوگئیں"۔ یہاں **ہوگئیں** کیجگہ

کی جگہ **ہوئیں** چاہیے۔ یا "دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا،، یہاں کیا ہو **گیا** چاہیئے۔

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں **روزمرہ** کی پابندی جہانتک ممکن ہو نہایت ضروری ہے۔ مگر **محاورہ** کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کردیتا ہے۔ لیکن ہر شعر میں محاورہ کا باندھنا ضرور نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجے کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھدیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے۔

"گوہر اشک سے لبریز ہے سارا دامن آج کل دامن دولت ہے ہمارا دامن"

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا۔ باوجود اسکے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے۔

"اسکا خط دیکھتے ہیں جب صیاد طوطے ہاتھوں کے اُڑا کرتے ہیں"

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے صرف ایک محاورہ بندھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی روزمرہ کے خلاف یعنی **اُڑجاتے ہیں** کی جگہ **اُڑا کرتے ہیں** باندھا ہے۔ محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیئے۔ جیسے کوئی خوبصورت عضو۔ بدنِ انسان میں۔ اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیئے جیسے تناسب اعضا بدنِ انسان میں۔ جسطرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسنِ بشری کامل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسیطرح بغیر روزمرہ

کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بے جا رکھدینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونو کر سکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہلِ زبان کا حصہ ہے۔ اہل زبان عموماً اُس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جسمیں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ اُنکو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے۔ مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہی۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو سُنکر سر دُھننے لگتے ہیں۔ اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی تبذل یا رکیک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ جب اُنھیں اسلوبوں میں وزن کی کھچاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں۔ اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو اُنکو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کیساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لیئے صرف روزمرہ کا وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہی۔ اُن کے نزدیک محض تُک بندی اور معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہی ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہے۔ تو بلا شبہہ اُنکو بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ فن شعر میں اور خاصکر اُردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روزمرہ میں پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روزمرہ کی پابندی کو سب

چیزوں سے مقدم سمجھا ہے اُنکے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فروگذاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روزمرہ اور محاورہ میں بھی پورا اُتر جائے تو لامحالہ اُس سے ہر صاحبِ ذوق کو تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً **میر انشاء اللہ خاں** اس بات کو کہ افسردگی کے عالم میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گذرتی ہے اسطرح بیان کرتے ہیں۔

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں یہاں بیزار بیٹھے ہیں"

یا مثلاً **مرزا غالب** اتنے بڑے مضمون کو کہ (میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھکر کچھ نہ کہا۔ جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اُسنے جانا کہ اسکا مطلب کچھ اور ہے۔ اُسنے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے) دو مصرعوں میں اسطرح بیان کرتے ہیں۔

"گدا سمجھکے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کے لئے"

یا مثلاً **مرزا غالب** کہتے ہیں۔

رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے   دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے اُسکو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ

رہتا ہے۔ لیکن جب راز فاش ہو جاتا ہے تو پھر اُسکو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے **دھویا جانا** بے حیا اور بے لحاظ ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اور **پاک** آزاد اور شہدے کو کہتے ہیں۔ رونے کے لیئے دھویا جانا اور دھوئے جانے کے لیئے پاک ہونا۔ باوجود اتنی لفظی مناسبتوں اور محاورہ کی نشست اور روزمرہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہو گیا ہے۔ اور کوئی بات اَن نیچرل نہیں ہے یا مثلاً **مومن خاں** کہتے ہیں۔

"کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چُرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے"

آنکھیں چُرانا۔ اغماض و بے توجہی کرنا ہے۔ **کھویا جانا** شرمندہ اور کھسیانا ہونا **پا جانا**۔ سمجھ جانا۔ یا تاڑ جانا۔ معنی ظاہر ہیں۔ اس شعر کا مضمون بھی بالکل نیچرل ہے اور محاورات کی نشست اور روزمرہ کی صفائی قابل تعریف ہے۔ اگرچہ اسکا ماخذ مرزا **غالب** کا یہ شعر ہے۔

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مگر **مومن** کے ہاں زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔ اسی قبیل کے یہ اشعار ہیں۔

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے یقیں یہاں رہ گیا وھاں رہ گیا

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد — ہمیں آکے اُس کے قدم دیکھتے ہیں

شاید اسیکا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

یوں وفا اُٹھ گئی زمانے سے — کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

الغرض روزمرہ کی پابندی تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہانتک ہوسکے نہایت ضروری چیز ہے۔ اور محاورہ بھی بشرطیکہ سلیقہ سے باندھا جائے شعر کا زیور ہے۔ چونکہ یہ بحث بہت طولانی ہے۔ اسلیئے ہم اسکو یہیں ختم کر دیتے ہیں اگر موقع ملا تو پھر کبھی اس مضمون پر علیحدہ اپنے خیالات ظاہر کرینگے۔

ج صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سررشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ مخاطب کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہی ہے بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے۔ پس صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ صنعتیں جیسا کہ علم بلاغت میں مفصل مذکور ہے دو قسم کی قرار دی گئی ہیں۔ ایک معنوی۔ جیسے طباق۔ مشاکلہ۔ عکس۔ توریہ حسن تعلیل۔ تجاہلِ عارفانہ۔ تعجب وغیرہ۔ دوسری لفظی۔ جیسے تجنیس۔ ردّ العجز علی الصدر منقوط۔ غیر منقوط۔ رقطا۔ خیفا۔ مقطع۔ موصل۔ ترصیع وغیرہ۔ پہلی قسم کی کُل صنعتیں اور دوسری قسم کی خاص خاص صنائع عربی اور فارسی کے تمام نامور شعرا نے برتی ہیں مگر کبھی اُنکا التزام نہیں کیا۔ اور کلام کی بُنیاد اُنپر نہیں رکھی۔ ہاں اگر حسن اتفاق سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ سوجھ گیا جس سے معنی مقصود میں کچھ خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حُسن پیدا ہو جائے ایسے موقع کو بلاشبہ ہاتھ سے جانے نہیں

دیا۔ جیسے **خواجہ حافظ** کہتے ہیں۔

بزیرِ دلق ملمع کمندہا دارند درازدستی این کوتہ آستیناں بیں

اس شعر میں **دراز** اور **کوتہ** کے لحاظ سے صنعت طباق اور دست و آستین کے اعتبار سے مراعاۃ النظیر ہی۔ مگر دونو صنعتیں ایسی بے تکلف اور مناسب طور پر واقع ہوئی ہیں کہ معنیٔ مقصود میں بجائے اسکے کہ مُخل ہوں اَور زیادہ قوت پیدا کردی ہی اور شعر کا حسن دوبالا کردیا ہے یا جیسے **میر تقی** کہتے ہیں

یہ جو چشم پُر آب ہیں دونو ایک خانہ خراب ہیں دونو

اسمیں **ایک** کا لفظ ایسا بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے اُسکا قصد ہی نہیں کیا۔ یہاں **ایک** کے معنی ہیں نہایت۔ بے مثل۔ لاجواب چھٹا ہوا۔ جیسے کہتے ہیں وہ ایک بدذات ہی یا وہ لوگ ایک شورہ پشت ہیں **دونو** کے مقابلہ میں **ایک** کے لفظ نے اگر شعر کو نہایت بلند کردیا ہی۔ ورنہ نفس مضمون کے لحاظ سے اُسکی کچھ بھی حقیقت نہ تھی۔ یہاں فی الحقیقۃ محض صنعتِ مراعاۃ النظیر نے اس شعر میں اعلےٰ درجہ کی بلاغت پیدا نہیں کی۔ بلکہ اسبات نے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر لفظ **ایک** کا اطلاق ایسی خوبی اور بے تکلفی سے ہوا ہے کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتا۔ ورنہ ایک شعر یا ایک مصرع میں **ایک** اور **دو** کا جمع کردینا کہ اسیکا نام مراعاۃ النظیر ہے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

حسن مطلع

دیدہ و دل عذاب ہیں دونو   ایک سب آگ ایک سب پانی ۱

اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے۔ پس اگر اس قسم کی مناسبتِ لفظی اتفاق سے شعر میں پیدا ہوجائے تو یہ شاعری کا زیور ہے۔ مگر قصداً ایسی رعایتوں کی جستجو کرنے سے آخر کار شاعری شاعری نہیں رہتی۔ بلکہ مسخراپن ہوجاتا ہی ایک مشہور شاعر فرماتے ہیں۔

"مرغ دلکو توڑے گی بلی تیرے دروازہ کی   رختِ تن کو کتریگا چوہا تمھاری ناک کا"

چونکہ **بلی** کے لیئے **چوہا** لانا واجبات سے تھا۔ اسلیئے جب اصلی چوہا نہ ملا ناچار ناک ہی کے چوہے پر قناعت کی۔

کھانے کی اصل خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو۔ مفید ہو۔ جزوِ بدن بننے کے لائق ہو۔ بوباس اور رنگ روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصل خوبی یہ ہی کہ نیچرل ہو موثر ہو۔ لفظاً اور معنیً سانچہ میں ڈھلا ہو۔ اگر اسکے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اُسمیں پائی جائے تو اور بہتر ہے۔ ورنہ اُسکی کچھ ضرورت نہیں۔

ہر زبان میں صنعتِ الفاظ (اگر ہمارا قیاس غلط نہیں ہی) متقدمین کی نسبت متاخرین کے کلام میں زیادہ پاؤگے۔ کیونکہ اکثر متاخرین اُنھیں مضامین کو دُہراتے ہیں جو اُنکے پہلے قدما باندھ گئے ہیں۔ پس تاوقتیکہ وہ صنعتِ الفاظ کو کام میں نہ لائیں اُنھیں معمولی باتوں میں کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔

متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جنمیں باوجود حسنِ معنی کے اتفاق سے کوئی لفظی مناسبت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ وہ اشعار عموماً پسند کیئے جاتے ہیں بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرلیتے ہیں کہ انکی مقبولیت کا سبب وہی لفظی مناسبت ہی اور بس۔ اب وہ بتکلف اُنھیں صنعتوں کو اپنے کلام میں جا و بے جا استعمال کرنا شروع کرتے ہیں اور جو اصل خوبی قدما کے کلام میں ہوتی ہے اُسکا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اسکی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ ایک جامہ زیب اور حسین آدمی جسپر کوئی لباس بدنما نہیں معلوم ہوتا۔ اتفاق سے بنت کی ٹوپی یا کارچوبی انگرکھا پہنکر نکلے اور لوگ اُسکی ریس سے ویسے ہی کپڑے پہننے لگیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اُسکی زیبائش کا اصل سبب حُسن و جمال ہے نہ بنت کی ٹوپی اور کارچوبی انگرکھا۔

صنعتِ الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے تمام لٹریچر کو بے انتہا صدمہ پہنچایا ہی جسکی تفصیل کے لیئے ایک جدا کتاب لکھنے کی ضرورت ہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جسطرح عجائب قدرت کی تعظیم ہوتے ہوتے آخر کار دنیا میں عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا۔ اسیطرح ہمارے لٹریچر میں صنائع لفظی کی لَے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا۔ صنائع و بدائع کی پابندی دلی کے شعرا میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے اسکا سخت پابندی کے ساتھ التزام کیا ہے۔ اور بمقابلہ اہل دہلی کے لکھنؤ کے عام شعرا بھی رعایت لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی فارسی کے مقابلہ میں اُردو شاعری ایں

آفت سے بہت محفوظ ہے۔ جہانتک ہمکو معلوم ہے وہ بیہودہ لفظی صنعتیں جنمیں معنی سے بالکل قطع نظر کر لیجاتی ہے۔ اور محض ایک لفظوں کا گورکھ دھندا بنایا جاتا ہے جیسے منقوط غیر منقوط۔ رقطا۔ خیفا۔ ذوقافیتین۔ ذوبحرین وغیرہ وغیرہ۔ اُردو شاعری میں کمیاب ہیں مگر بجائے صنائع لفظی کے اُردو غزل میں ایک اور رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ جو صنائع سے بھی زیادہ معنی کا خون کرنے والا ہے۔

د سنگلاخ زمینوں میں لکھنؤ اور دلّی کے شعرائے متاخرین نے ہزارہا غزل لکھی ہے میر۔ سودا۔ جراٗت۔ درد۔ اور اثر۔ کے ہاں ایسی زمینوں میں بہت کم غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اسکی ابتدا **مصحفی** اور **انشا** کے وقت سے ہوئی ہے۔ اور شاہ نصیر نے سب سے زیادہ اسمیں طبع آزمائی کی ہے۔ ذوق کو بھی ابتدائے شاعری میں اسکا بہت لپکا رہا ہی ظفر کے کلام میں بھی ایسی زمینیں بہت ہیں۔ البتہ غالب۔ مومن۔ ممنون۔ شیفتہ داغ۔ وغیرہ نے ایسی زمینیں بہت کم اختیار کی ہیں لکھنؤ کے شعرا نے بھی سخت زمینوں میں بے انتہا غزلیں لکھی ہیں۔

جو لوگ شاعری کے فرائض پورے پورے ادا کرنے چاہتے ہیں وہ اسبات کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ شعر کے سرانجام کرنے میں کوئی چیز ایسی مشکل نہیں جیسا مضمون شعر کے مناسب قافیہ بہم پہنچانا۔ اسی لیئے جب کسیکو سخت دقت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اُسکا قافیہ تنگ ہوگیا اسی قافیہ کی مشکلات سے بچنے کے لیئے یورپ کے شعرا نے آخرکار ایک **بلینک ورس** یعنی نظم غیر مقفّٰی نکال لی ہے۔ اور اب زیادہ تو وہاں اسیطرح کی نظم پر شاعری کا دارومدار ہے

ہمارے ہاں اسپر طرہ یہ ہی کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دُم چھلا اَور لگا لیا گیا ہے اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غزل میں اور خاصکر اُردو غزل میں تو اُسکو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اُردو دیوانوں میں غیر مردف غزلیں تلاش کیجائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جب کہ ردیف اور قافیہ کی گھاٹی خود دشوار گذار ہے تو اُسکو اَور زیادہ کٹھن اور ناقابلِ گذر بنانا اُنھیں لوگونکا کام ہوسکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ اور شاعری کا آل محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس۔

جہانتک سنگلاخ زمینوں کا استقرا کیا جاتا ہے اُن میں **یا** تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جنمیں باہمدگر کچھ مناسبت نہ ہو۔ مثلاً۔ تقریر پشتِ آئینہ تخچیر پشتِ آئینہ۔ تدبیر پشتِ آئینہ۔ اور جبل کی مکھی۔ محل کی مکھی۔ دُول کی مکھی۔ اور عَسَس کی تیلیاں مگس کی تیلیاں۔ نفس کی تیلیاں۔ یا ردیف ایسی لمبی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آسکتی۔ جیسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں۔ سر پہ طرہ ہار گلے میں۔ گاہ خدنگ گاہ کماں۔ غرضکہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جسمیں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو اور بامعنی شعر نکالنا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے سوا عام شعرا کے لئے قریب ناممکن کے ہو ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بہ ظاہر جاتی رہے۔ گویا تیل اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں لوامیر خسرو کی اَنمل میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے کھیر چرخہ ڈھول اور کُتا ان چار چیزوں کا اسطرح پیوند ملایا ہے۔

"کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا — آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا"

ایک شاعر گلگیر اور پشت آئینہ کو اسطرح پیوند دیتا ہے۔

"آرسی پہنے ہوئے وہ گل جو لیوے شمع کا — ہم انگوٹھے کو کہیں گلگیر پشت آئینہ"

ایک اور شاعر نے گل اور مکھی کو اسطرح گانٹھا ہے۔

"صنعتِ لعبتِ چیں دیکھ دلا جا کر تو — دیکھنی گر تجھے منظور ہو گُل کی مکھی"

اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے کہ کُل سنگلاخ زمینوں میں اسکے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ دو بے میل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے۔ پس شاعر کو چاہیئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو۔ اور ردیف و قافیہ دونو ملکر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردّف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہیئیں۔ اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیئے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیئے۔ جسکے لیئے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے الفاظ موجود ہوں۔ ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا قافیے مضمون کے تابع نہونگے۔ جتنے نامور شعرا گذرے ہیں اُنہوں نے یہی اصول ملحوظ رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جنمیں ہر قسم کے مضمون کی گنجایش ہو۔

(قصیدہ)

قصیدہ بھی اگر اُسکے معنی مطلق مدح و ذم کے لیئے جائیں۔ اور اُسکی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جسکے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور اپنے بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات کسی چیز کو

دیکھکر یا کسی واقعہ کو سُنکر بے اختیار ہمارے دلمیں مدح و ستایش یا نفرین و ملامت کا جوش اُٹھتا ہے۔ کبھی کسیکے عدل و انصاف یا عالی ہمتی۔ یا حُبِ وطن یا قومی ہمدردی یا اور کسی خوبی کو معلوم کر کے اُسکی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی کسی نیک صفات اور ستودہ خصائل آدمی کی موت پر افسوس کرنے اور اُسکی خوبیاں یاد کرنیکا ولولہ دلمیں پیدا ہوتا ہے کبھی ہمکو اپنے گذشتہ دوستوں کی صحبتیں یاد آتی ہیں اور اُنکی بے ریا دوستی اور خالص محبت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جو اُنکا ذکر خیر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کبھی کسی خوش فضا مقام پر ہمارا گذر ہوتا ہے۔ اور جو لطف وہاں حاصل ہوتا ہے اُسکے بیان کرنیکا جوش ہمارے دلمیں اُٹھتا ہے۔ اسیطرح جب کوئی واقعہ ہمارے دل کو ناگوار معلوم ہوتا ہے یا کسی سے کوئی حرکت یا کام قابل نفرین ظہور میں آتا ہے تو اُسکی بُرائی ظاہر کرنیکا ارادہ ہمارے نفس میں متحرک ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ جو ملکہ اُسکی طبیعت میں خدا نے ودیعت کیا ہے اُسکو معطل اور بیکار نہ چھوڑے اور اُس سے جیسا کہ اُسکی فطرت کا مقتضیٰ ہی کچھ کام لے۔ جسطرح ایک محقق حکیم کا یہ فرض ہے کہ موجوداتِ عالم کے جسقدر خواص اور احوال اُسپر منکشف ہوں اُنسے دنیا کو آگاہ کرے یا ایک طبیب کا فرض ہے کہ عقاقیر کے مضار و منافع سے بنی نوع کو تا بمقدور بے خبر نہ رہنے دے۔ یا ایک سیاح کا فرض ہے کہ انکشافات جدیدہ سے اہل وطن کو مطلع کرے۔ اسیطرح شاعر کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ اچھوں کی خوبیوں کو چمکائے۔ اُنکے ہنر اور فضائل عالم میں روشن کرے۔ اور اُنکے اخلاق کی خوشبو سے موجودہ اور آیندہ دونو نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا سامان مہیا کر جائے۔ اور نیز برائیوں

اور عیبوں پر جہانتک ممکن ہو گرفت کرے۔ تاکہ حال اور استقبال دونو زمانوں کے لوگ برائی کی سزا اور اُسکے نتائج سے ہوشیار اور چوکنے رہیں۔ یہ وتیرہ بالکل سنت الٰہی کے مطابق ہوگا کیونکہ کلام الٰہی میں بھی ہمیشہ بُروں کو بُرائی کے ساتھ اور بھلوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ متوکل باللہ نے ایک شاعر سے پوچھا کہ تم کس حد تک لوگوں کی ہجو کے درپے رہتے ہو اور کب تک اُنکی مدح و ستایش کرتے ہو؟ اُسنے کہا " مَا اَسَاؤُا وَ اَحْسَنُوْا "۔ یعنی جبتک کہ اُنسے بدی اور نیکی سرزد ہوتی ہے۔ پھر کہا۔ " نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ نَّکُوْنَ کَالْعَقْرَبِ الَّتِیْ تَلْسِبُ النَّبِیَّ وَالذِّمِّیَّ "۔ یعنی خدا نکرے کہ ہمارا حال بچھو کا سا ہو جو کہ نبی اور ذمی دونو کے ڈنک مارتا ہے۔

جب کسی ایسے شخص کی جو مدح کا مستحق ہوتا ہے تعریف کیجاتی ہے تو اُسکو مدح کا زیادہ استحقاق حاصل کرنے یا کم سے کم اپنا پہلا استحقاق قائم رکھنے کا اور دوسروں کو اُسکی ریس کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسیطرح جو لوگ نفرین کے مستحق ہیں جب اُنکے عیب کنایۃً بیان کیئے جائینگے تو امید ہی کہ وہ اس اندیشہ سے کہ مبادا آیندہ زیادہ رسوائی ہو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ یا کم سے کم اپنی بُرائی سے نادم یا متنبہ ہونگے اور دوسرے اُن عیبوں کو مذموم و قابل نفرین سمجھینگے۔ اسی لیئے مدح ایسے اسلوب سے کرنی چاہیئے کہ وہ منجر بہ خوشامد نہ ہو جائے۔ اور مذمت ایسے عنوان سے ہونی چاہیئے کہ دلسوزی کا پہلو طعن و تشنیع کی نسبت غالب تر ہو۔

مرثیہ پر بھی اس لحاظ سے کہ اُسمیں زیادہ تر شخص متوفّٰی کے محامد و فضائل بیان ہوتے ہیں

مدح کا اطلاق ہوسکتا ہی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مردوں کی تعریف کو جسمیں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں۔ عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیئے ایسے سچے اور صحیح حالات و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُنسے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد بزرگوار عبدالمطلب کے مرثیئے جتنے لکھے گئے ہیں سب میں تھوڑے تفاوت سے اُنکی عشیرہ پروری۔ قومی ہمدردی اور قوم کی مشکلات اور مصائب میں سینہ سپر ہونے کی تعریف کی گئی ہے۔ ہر مرثیہ میں اُنکی خوبصورتی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں ممتاز۔ سربرآوردہ۔ فیاض۔ قحط سالیوں میں اہل وطن کیساتھ سلوک کرنے والے عالی خاندان۔ عہد و پیمان کے سخت پابند۔ اولوالعزم۔ نرم خو۔ صاحب رُعب و داب۔ صلۂ رحم کرنے والے۔ باحیا۔ مہالک و مخاطر میں بے دھڑک گھُسنے والے اور آبرو کی حفاظت کرنے والے تھے۔ بعض مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قُصَیَّ ابن کلاب کے زمانہ سے خانۂ کعبہ کی تولیت اور سقایۂ حُجاج اور عمارت مسجد حرام عبدالمطلب کے خاندان میں چلی آتی تھی اور دیگر بنی کنانہ جو **قصی** کی نسل سے نہ تھے اسبات پر **بنی قصی** سے جلتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی قصی نے مکہ اور حوالی مکہ میں اہل وطن اور حاجیوں کے آرام کے لیئے کوئیں کھُدوائے تھے ورنہ پہلے چھُقر اور گڑھے گڑھولوں میں جو بارش کا پانی جمع ہو جاتا تھا۔ فقط اُسپر مدار زندگی تھا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ **ابولہب** بن عبدالمطلب کی ماں کا نام **لُبنیٰ** تھا اور وہ **بنی خزاعہ** میں سے تھی اور اُسنے جو کہ بیس برس قوم کی حمایت میں لشکر کا سردار

رہا تھا اور ابو شمر اور عمرو بن مالک اور ذوجدن اور ابوالجبر یہ سب یمنی کے رشتہ دار تھے حذیفہ ابن غانم نے جو لوئی بن غالب ہی کی نسل سے تھا عبدالمطلب کے مرثیہ میں اس احسان کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب وہ خود چار ہزار درم قرضہ کی بابت مکہ میں پکڑا گیا تو ابولہب بن عبدالمطلب نے اُسکو جا کر قرضخواہوں کے پنجے سے چھٹایا تھا۔ اسیطرح عرب کے اکثر قصائد اور مراثی حقایق و وقعات پر مشتمل پائے جاتے ہیں۔

ہمارے قصائد کیحالت تو ناگفتہ بہ ہے البتہ ہمارے شعرا نے مرثیہ میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے۔ مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاصکر جناب سیدالشہدا کے مرثیہ پر ہوتا ہے۔ یہاں مرثیہ کی ابتدا اول اُسی اصول پر ہوئی تھی جو کہ قدرت نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر تعلیم کیا ہے۔ یعنی میت کو یاد کر کے حزن و غم کا اظہار کرنا اور اپنے بیان سے دوسروں کو محزون و مغموم کرنا۔ چنانچہ جو مرثیے اول اول لکھے گئے وہ کم و بیش بیس تیس بند یا بیس تیس بیت سے زیادہ نہوتے تھے۔ اور اُنمیں مرثیت یا بین کے سوا اور کوئی مضمون نہوتا تھا۔ مگر چونکہ مرثیہ ایک خاص مضمون کے دائرہ میں محدود تھا اور اُسکی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ لہذا متاخرین کو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدت پیدا کریں اور اسکے مضامین میں کچھ اضافہ کریں۔ رفتہ رفتہ مرثیہ کی ترقی بہت بڑھ گئی۔ یہانتک کہ خواجہ حیدر علی آتش نے مرزا دبیر کا ایک مرثیہ مجلس میں سنکر تعجب سے یہ کہا کہ یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان تھی؟ اگرچہ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا۔ کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہیئے تھی اُسمیں بین اور

مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح۔ فخر و مباہات۔ رزم اور بزم بھی نہایت شد و مد کیساتھ شامل ہو گئی۔ مگر حق یہ ہے کہ اس نئی طرز کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ اس طرز میں سب سے پہلے جہانتک ہمکو معلوم ہے میر ضمیر نے مرثیے لکھے ہیں گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں۔ مگر میر انیس نے کہ باوجود خداداد مناسبت کے چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُنکے خاندان میں چلی آتی تھی اسپر اُردو زبان کے مالک تھے اور لکھنؤ بنا ہوا تھا۔ اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ اور اُردو شاعری میں جو کہ مار رالکد کیطرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا اگرچہ سوسائٹی کے دباؤ اور کم عیار حریفوں کے مقابلہ نے میر انیس کو ہر جگہ جادۂ استقامت پر قائم رہنے نہیں دیا بلکہ اُس دُھرپتیے کیطرح جسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لیے کبھی کبھی بارہ ماسا اور چوبولے بھی الاپنے پڑتے ہیں اکثر مبالغہ و اغراق کی آندھیوں کے طوفان اُٹھانے پڑے۔ مگر اس قسم کی بے اعتدالیاں اُن فوائد کے مقابلہ میں جو اُن کی شاعری سے اُردو زبان کو پہنچے نہایت بے حقیقت اور کم وزن ہیں۔ انھوں نے بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کر دیئے۔ ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا۔ اور زبان کا ایک معتد بہ حصہ جسکو ہمارے شاعروں کی قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا اُسکو شعرائے روشناس کرا دیا۔ انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا اسبات کا اشارہ کیا ہے اور بالکل بجا کیا ہے کہ اُنکے ہمعصر مرثیہ گو اُنکی زبان اور طرز بیان کے خوشہ چیں تھے ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہریں رواں ہیں فیض شہ مشرقین کی ۔۔۔ پیاسو پیو۔ سبیل ہے نذر حسینؑ کی

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

آج کل یوروپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اسبات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اُسنے اور شعرا سے کسقدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شایستگی سے استعمال کیئے ہیں۔ اگر ہم بھی اسیکو معیارِ کمال قرار دیں تو بھی **میر انیس** کو اردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑیگا۔ اگرچہ **نظیر** اکبر آبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ مگر اُسکی زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں بخلاف میر انیس کے کہ اُسکے ہر لفظ اور ہر محاورہ کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہی میر انیس کا کلام جیساکہ اوپر بیان کیا گیا بلا شبہہ مبالغہ اور اغراق سے خالی نہیں مگر اسکے ساتھ ہی جہاں کہیں وہ واقعات کا نقشہ اتارتے ہیں یا نیچرل کیفیات کی تصویر کھینچتے ہیں یا بیان میں تاثیر کا رنگ بھرتے ہیں وہاں اسبات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ مقتضائے وقت کے موافق جہاں تک کہ امکان تھا **میر انیس** نے اردو شاعری کو اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا تھا۔

شعرا کے جرگے میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خوان مگر میر انیس نے اس قول کو بالکل باطل کر دیا۔ اُنکو جس نظر سے ہم دیکھتے ہیں اُس نظر سے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ اکثر ذاکر امام حسین علیہ السلام سمجھکر اُنکا ادب کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اُنکو صدق دل سے یا محض اپنے فریق کی پاسداری اور دوسرے فریق کی ضد سے صرف مرثیہ گویوں میں سب سے فایق اور افضل سمجھتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں جو مطلق شاعری میں اُنکو فی الواقع بے مثل سمجھتے ہوں۔

اس خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اُردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانیکا مستحق صرف انھیں لوگوں کا کلام ٹھیر سکتا ہے۔ بلکہ جس اعلےٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیئے ہیں اُنکی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی بمشکل سے ملیگی۔

فضائل اخلاق کا نمونہ اس سے اعلیٰ اور اشرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے نبیؐ کا نواسہ جسکے آگے ہر مسلمان کا سر جھکنا چاہیئے تھا۔ اور جسکو اُنسے بے انتہا اُمیدیں ہونی چاہیئیں تھیں وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔ ریگستانِ عرب کی لُو اور گرمی ہے۔ عورتیں صغیر سن بچے اور سارا کُنبا ہمراہ ہے۔ مدینے سے کوفہ تک مہینوں کی راہ طے کرنی ہے۔ جو اعوان و انصار بنکر ساتھ چلے تھے اُنمیں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ چھوڑ کر چل دیئے ہیں۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیجکر اور خدا اور رسول کو درمیان دیکر نصرت و یاری کے وعدوں پر بُلایا تھا۔ وہ اُنکو آکر یکقلم منحرف و برگشتہ پاتا ہے۔ اور تمام اُمیدیں مبدل بہ یاس ہو گئی ہیں۔ باانیہمہ وہ راضی برضا ہے۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔ جس شخص کے تسلط کو وہ ملک اور قوم اور دین کے حق میں ایک مرض مُہلک سمجھکر اُسکی بیعت سے انکار کر چکا ہے۔ باوجود ان تمام شدائد کے اپنے انکار پر اُسیطرح قایم ہے۔

دشمنوں نے کھانا اور پانی سب بند کر رکھا ہے اور دریاے فرات آنکھوں کے سامنے بہ رہا ہے۔ دشمنوں کے گھوڑے گدھے اور اونٹ تک اُس سے سیراب ہوتے ہیں مگر اُسکا

سارا کنبا تین روز سے پیاسا ہے۔ اُسکے ننھے ننھے بچے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں اور یہ سب کچھ اسلیئے ہے کہ وہ ایک نالایق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ باانیہمہ وہ اپنے ارادہ پر اُسیطرح ثابت قدم ہے۔ کسی سختی اور کسی مصیبت سے اُسکے استقلال میں فرق نہیں آتا۔

اُسکے یار و مددگار کل ستر اور دو بہتر آدمی ہیں۔ اور ایک ٹڈی دل سے مقابلہ ہے لڑائی میں اپنا اور سب عزیزوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ خیمہ اور اسباب کا لٹنا۔ باقیماندوں کا اسیر ہونا۔ عورتوں کی بے ردائی اور بادیہ پیمائی۔ یہ سب آفتیں گویا آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں مگر وہ ان سب کو گوارا کرتا ہے اور بہتر سمجھتا ہے بہ نسبت اسکے کہ ایک نالایق آدمی کے ہاتھ پر بیعت کرے اور اُسکی حکومت کو تسلیم کرے۔

وہ اپنے بھائی بیٹے بھتیجے اور بھانجوں کو نہایت اطمینان کے ساتھ مسلح اور آراستہ کرکے ایک ایک کو ہزاروں کیساتھ لڑنے کے لیئے بھیج رہا ہے اُنکے بازو تلواروں سے کٹتے اُنکے کلیجے برچھیوں سے چھدتے اور اُنکی چھاتیاں تیروں سے چھنتے دیکھتا ہے۔ ایک ایک کی لاش کاندھے پر رکھکر لاتا ہے اور اپنے ہاتھ سے زمین میں دفن کرتا ہے۔ خیمہ میں عورتوں کے کہرام سے ہر وقت ایک قیامت برپا ہے۔ بی بی۔ بیٹی اور بہنوں کی دلخراش صدائیں دلمیں ناسور ڈال رہی ہیں۔ چھ مہینے کا شیر خوار بچہ ایک ظالم کا تیر کھاکر گود میں مرغ بسمل کیطرح تڑپ رہا ہے۔ اُسکے حلق سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آچکے ہیں اور بچہ بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب سبکے بعد اپنی باری نظر آتی ہے۔ اور پھر اہلِ بیت کے جہاز کا خدا کے سوا کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ ان سب بلاؤں کا سامنا ہے اور مصائب و آفات کی گھنگھور گھٹا چاروں طرف

چھائی ہوئی ہے۔ مگر انمیں سے کوئی چیز اُسکے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی وہ کوہ راسخ کیطرح اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔ اور اپنے قول سے نہیں ہٹتا۔

وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے۔ اور نواسے کے خون کی پیاسی ہے جو چند نفوس کے مقابلہ کے لیئے ایک ٹڈی دل کو ساتھ لیکر آئے ہیں اور اپنی تمام طاقت اس بات میں صرف کر رہے ہیں کہ جو ایذائیں اور تکلیفیں آدم سے تا اینہدم کسی ذی روح نے کسی ذی روح کو نہیں دیں وہ سب اپنے نبیؐ کے دلبندوں اور جگر کے ٹکڑوں پر ختم کیجائیں۔ جو حرص و طمع کے نشے میں دین۔ ایمان۔ رحم۔ انصاف۔ آدمیت۔ ہمدردی اور تمام فضائل انسانی سے دست بردار ہو کر خدا کا گھر ڈھانے یعنی خاندان نبوت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تیار اور کمر بستہ ہیں۔ نہ وہ اُنکو بد دعا دیتا ہے۔ نہ اُنکی شکایت کرتا ہے۔ نہ اُنپر غصے ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جنکے ماننے کا وہ دعوے کرتے ہیں اُنکو جتاتا ہے۔ اور اُنکے فرائض جو خاندان نبوت کیا تھ اُنکو بجالانے چاہئیں اُنھیں یاد دلاتا ہے۔

چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دلمیں یہ اُمنگ ہے کہ سب سے پہلے میں اپنی جان خاندان پر نثار کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے کہ تلواروں کی آنچ میں بھائی بھتیجے اور بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دوں۔ بھائی۔ بھائی اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو تیار اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں کی یہ تمنا ہے کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں۔ بھتیجے کی یہ آرزو ہے کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے میں بنوں۔ بہن کو یہ ارمان ہے کہ اپنے بچوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کر دے۔ بھائی اس فکر میں گھلا جاتا ہے کہ اگر بھانجے میری رفاقت میں مارے گئے تو

بہن کو کیا مونہ دکھاؤنگا ۔ چچا کو خود بھی تین دن کی پیاس سے بیقرار ہے مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن پیاسی بھتیجی کی بے قراری کسیطرح نہیں دیکھ سکتا ۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتیلی پر رکھ دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا دریا میں گھوڑا جا ڈالتا ہے ۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے ۔ اور پیاس کے مارے آنکھوں میں دم ہے ۔ دل قابو سے باہر ہوا جاتا ہے ۔ دو چلو پانی میں پیاس بجھتی ہی مگر غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ ننھے ننھے بچوں کی پیاس بجھنے سے پہلے اپنی پیاس بجھالے ۔ وہ مشکیزہ بھر کر اُسیطرح پیاسا دریا سے پھرتا ہے تاکہ جلدی جا کر بچوں کے خشک حلق میں پانی چوائے ۔ لیکن دشمنوں نے گھیر کر دونو بازو کاٹ ڈالے ہیں ۔ اسپر بھی اُسکو اپنے بازوؤں کا کچھ خیال نہیں ۔ اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہی کہ مبادا پانی ضائع ہو جائے اور بچے پیاسے رہجائیں وہ سب حربے اپنے اوپر لیتا ہی مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا ۔ جب تک کہ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا ۔

بی بیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو زخمی اور قتل ہوتے دیکھتی ہیں مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی اور مونہ سے سانس تک نہیں نکالتی صرف اس خیال سے کہ جس مربی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں اُسکے دل پر میل نہ آئے اور وہ اپنے دل میں ہمسے محجوب نہ ہو ۔ سب اُسکی اور اُسکی اولاد کی خیر مناتی ہیں اپنے بچھڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی ۔

دو صغیر سن بھائی ہیں جو صرف اس قصور پر کہ نبیؐ کے نواسے کے رشتہ دار ہیں حاکم کے حکم سے واجب القتل ٹھہرے ہیں ۔ جلاد دونو کے سر پر تلوار تولے کھڑا ہے ۔ بڑا بھائی منتیں کرتا ہے کہ پہلے میرا سر اُتار ۔ اور چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ پہلے مجھپر وار کر ۔

ایک خدا کا بندہ جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبیؐ کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اُسکو ہر طرح دولت وجاہ و منصب کی توقع ہے اور انکا ساتھ چھوڑنے میں جان و مال ورخاندان کی تباہی کا یقینِ واثق ہے۔ جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے وہاں کوئی ترغیب یا تقریب ایسی نہیں جو اُسکا دل ظلم و بے دردی و بے دینی اور حبّ جاہ و ثروت سے ہٹاکر رحم و ہمدردی و دینداری کیطرف مائل کر سکے۔ اُسکو ہر طرف سے یہی آواز آتی ہے کہ جلد اس قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مردوں کے سر اُتاریئے۔ عورتوں اور بچوں کو اسیر کرکے لیچلیے اور حاکم سے چلکر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔ دوسری طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا جسکے لالچ میں وہ ان تمام فائدوں سے قطع نظر کرکے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑدے بلکہ بخلاف اسکے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے۔ باانہمہ وہ تمام دنیوی منفعتوں اور امیدوں پر خاک ڈالکر اُن ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق کی نصرت میں اپنی جان دینے کو فوزِ عظیم جانتا ہے اور سب سے پہلے خاندانِ نبوت پر اپنی جان فدا کرتا ہے۔

چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزندِ نبیؐ کے ہمراہ ہیں اور جو ایک ٹڈی دَل کے مقابلہ میں اسقدر قلیل ہیں کہ اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں۔ خود اُسکے ساتھیوں اور رفیقوں کو اثنائے راہ میں اُسکا ساتھ چھوڑ چھوڑکر اور آنکھیں چُرا چُرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں۔ اپنے لیئے اُسکا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اُسکی رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آرہی ہے۔ نہ کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے جو اُس کی

رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو۔ مگر وفاداری کا طوق اُنکی گردن میں اور دوستی و اخلاص کی زنجیر اُنکے پاؤں میں پڑی ہے۔ کوئی خوف اور کوئی طمع اُنکے اس تعلق کو قطع نہیں کرسکتی۔ ہر وقت یہ آرزو ہے کہ کب اذنِ جنگ ملے اور کب خاندان نبوت پر اپنی جانیں قربان کریں۔ اور کب اس فرض سے سبکدوش ہوں۔

یہ چند باتیں مرثیوں کے عام بیانات سے جو کبھی کبھی کے سُنے سُنائے ہمارے ذہن میں محفوظ تھے محض سرسری طور پر استنباط کرلی گئی ہیں۔ اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو ایسی اور بہت سی باتیں اخذ کیجاسکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک نہ صرف اُردو بلکہ فارسی و عربی شاعری میں بھی ایسی نظمیں مشکل سے ملینگی جنمیں ایسے اعلیٰ درجہ کے اخلاق بیان کیئے گئے ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ جو اثر ایسی اخلاقی نظموں سے انسان کے دل پر ہونا چاہیئے وہ نہ ان مرثیوں کے سامعین کے دل پر ہوتا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اول تو یہ خیال کہ مرثیہ کا اصل مقصد صرف رونا اور رولانا ہے۔ سامعین کو دوسری طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا۔ دوسرے یہ اعتقاد کہ (جو کچھ صبر و استقلال و شجاعت و ہمدردی و وفاداری و غیرت و حمیت و عزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمام اور اُنکے عزیزوں اور دوستوں سے معرکہ کربلا میں ظاہر ہوئے وہ مافوق طاقتِ بشری اور خوارقِ عادات سے تھے) کبھی اُنکی پیروی اور اقتداکرنیکا تصور بھی دل میں آنے نہیں دیتا۔

بہرحال ہم میر انیس کے مرثیہ کی اور نئی طرز کی مرثیہ گوئی کی دل سے داد دیتے ہیں لیکن نئی دُھن کے شاعروں کو ہرگز یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں اُنکا یا اور مرثیہ گویوں کا اتباع کریں

اول تو یہ امید نہیں کہ اس خاص طرز میں اب کوئی شخص اُنکا سا کمال حاصل کر سکے۔ دوسرے مرثیہ میں رزم و بزم اور فخر و خودستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا۔ لمبی لمبی تمہیدیں اور توطیے باندھنے۔ گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں اور بعینہ ایسی بات ہو کہ کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے مرنے پر اظہار حُزن و ملال کے لئے سوچ سوچکر رنگیں اور مسجع فقرے انشا کرے۔ اور بجائے حُزن و ملال کے اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار کرے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرثیہ کی ترتیب میں مطلق فکر و غور کرنا اور صنعت شاعری سے بالکل کام لینا نہیں چاہیئے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جہانتک ممکن ہو شاعری کا سارا کمال زبان کی صفائی، مضمون کی سادگی و بے تکلفی۔ کلام کے مؤثر بنانے اور آورد کو آمد کر دکھانے میں صرف کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ اشعار جو بے انتہا فکر و غور اور کاٹ چھانٹ کے بعد مرتب ہوئے ہیں۔ ایسے معلوم ہوں کہ گویا بیساختہ شاعر کی قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ تیسرے مرثیہ کو صرف واقعہ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کو دُہراتے رہنا اگر محض بہ نیت حصولِ ثواب ہو تو کچھ مضایقہ نہیں لیکن شاعری کے فرائض اس سے زیادہ وسیع ہونے چاہیئیں۔ **مرثیہ** کے معنی ہیں کسیکی موت پر جی کُڑھانا۔ اور اُسکے محامد و محاسن بیان کر کے اُسکا نام دنیا میں زندہ کرنا۔ پس شاعر جو کہ قوم کی زبان ہوتا ہے اُسکا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ جب کسی کی موت سے اُسکے یا اُسکی قوم یا خاندان کے دل کو فی الواقع صدمہ پہنچے۔ اُس کیفیت یا حالت کو جہاں تک ممکن ہو درد اور سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے۔ کیونکہ خالص محبت

جو ایک کو دوسرے کیساتھ ہوتی ہے۔ اور بے ریا تعظیم جو ایک۔ دوسرے کی نسبت کرتا ہے
اُسکے اظہار کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ممدوح خواب عدم میں بیخبر سوتا ہو اور اُس سے
کسی نفع کی امید یا ضرر کا خوف باقی نہ رہا ہو۔ اب اگر شاعر کا دل فی الحقیقۃ علایق دنیوی سے
ایسا پاک ہی کہ مقربان درگاہ آلہی کے سوا کسی کی موت سے متاثر اور متغیر نہیں ہوتا اُسکو
آحاد ناس کے مرثیئے لکھنے کی تکلیف دینی بلاشبہہ تکلیف مالایُطاق ہوگی۔ لیکن اگر اُسکے
پہلو میں ایسا پاک دل نہیں ہو بلکہ وہ عام انسانوں کیساتھ ہمدردی رکھتا ہے اور دنیاداروں کی
موت پر بھی اُسکا دل پسیجتا ہے تو اُسکو اپنی فطرت کا مقتضیٰ ضرور پورا کرنا چاہیئے۔

یہ سچ ہے کہ جناب سید الشہداء اور اُنکے عزیزوں اور ساتھیوں کے آلام و مصائب
کا بیان بشرطیکہ اُسمیں بناوٹ اور تصنع اور صنعت شاعری کا اظہار نہو ایک مسلمان کے
ایمان کو تازہ کرتا ہے۔ اور اُس سے خاندان نبوت کیساتھ رشتۂ محبت و خلاص جو کہ اسلام
کی جڑ ہے مضبوط ہوتا ہے۔ اور اُنکے بے نظیر صبر و استقلال کی پیروی کرنیکا سبق حاصل ہوتا ہے
لیکن جسطرح ان تمام باتوں کی ضرورت ہی اسیطرح قوم میں قومیت کی روح پھونکنے کی بھی ضرورت
ہی اور وہ اسیطرح پھونکی جاتی ہے کہ قوم کے افراد مثل ایک خاندان کے ممبروں کے ایک دوسرے
کیساتھ ہمدردی کریں۔ اُنکی مساعی جمیلہ کی قدر کریں۔ اُنکے نیک کاموں میں معین و مددگار ہوں
زندگی میں اُنکی نیکیوں کو چمکائیں۔ اُنکے کمالات کو شہرت دیں۔ اور مرنے کے بعد اُن کی
ایسی یادگاریں قایم کریں جو صفحۂ ہستی سے کبھی مٹنے والی نہوں۔ مدحیہ قصیدے جو ممدوح کی
زندگی میں لکھے جاتے ہیں اُنمیں اُسکی خوبیوں کا ایسا ثبوت نہیں ہوتا جیسا کہ اُسکے مرنے کے بعد

سب لاگ مرثیوں اور نوحوں میں ہوتا ہے۔ اسیواسطے ہمارے قدیم شعراجنکا خمیر عرب کی خاک پاک سے تھا جب کوئی برگزیدہ آدمی قوم میں سے اُٹھ جاتا تھا اُسکے مرثئے ویسے ہی شوق اور جوش وخروش کیساتھ لکھتے تھے جیسے کہ اُسکی زندگی میں مدحیہ قصیدے انشا کرتے تھے۔ بڑا مکہ کے مرثیوں پر شعرا برابر قتل کیئے جاتے تھے۔ مگر لوگ اُنکے مرثئے لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ معن بن زائدہ کا مرثیہ لکھنے پر خلیفۂ وقت نے ایک شاعر کو کمال بیحرمتی کیساتھ دربار سے نکلوادیا۔ اسپر بھی اُسکے بیشمار مرثئے لکھے گئے۔ ابواسحاق صابی کا مرثیہ علم الہدیٰ شریف مرتضیٰ نے باوجود اختلافِ مذہب کے ایسے سوز و گداز کے ساتھ لکھا ہے جیسے کوئی اپنے عزیز و یگانے کی موت پر افسوس کرتا ہے اور اُسکے علم و فضل کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ اسیطرح ہزارہا مرثیہ اہل علم، اہل کمال بہادروں۔ فیاضوں۔ نیکدل بادشاہوں۔ لائق وزیروں اور دیگر ممتاز لوگوں کی وفات پر لکھا گیا ہے۔

لیکن جو شخص **مرثیہ** لکھنے میں کمال حاصل کرنا چاہے۔ اُسکے لیئے اس نئی طرز کے مرثیہ سے بہتر کوئی رہنما اُردو شاعری میں نہیں ملسکتا۔ جو باتیں ان بزرگوں کے کلام میں مرثیّت کی شان کے برخلاف ہیں اگر اُنسے قطع نظر کیجائے تو طالبِ فن کو اُس سے نہایت عمدہ سبق ملسکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ **قصیدہ** اول تو اردو میں بمقابلہ فارسی اور عربی کے اسقدر کم لکھا گیا ہے کہ گویا بالکل نہیں لکھا گیا۔ دوسرے اُسکا کوئی نمونہ اُردو میں ایسا نشان نہیں دیا جاسکتا جسکے قدم بہ قدم چلنا چاہیئے۔ اول سودا اور آخر ذوق صرف یہ دو شخص ہیں جنھوں نے ایران کے قصیدہ گویوں کی روش پر کم و بیش قصیدے

لکھتے ہیں۔ اور جو چال قدیم سے چلی آتی تھی اُسکو بہت خوبی سے نباہا ہے۔ مگر جیسے قصیدے کی اب ضرورت ہے یا آیندہ ہونے والی ہے یا ہونی چاہیے اُسکا نمونہ ہماری زبان میں معدوم ہے شاید بہت تلاش سے عربی میں کسیقدر زیادہ اور فارسی میں خال خال ایسے نمونے ملیں جنکا اتباع کیا جاسکے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایشیاٹک پوئیٹری میں ایسے نمونے تلاش کرنے جنپر آجکل کے خیالات کے موافق مدح یا ہجا کی بنیاد قائم کیجائے بعینہ ایسی بات ہی جیسے ایک ڈسپاٹک گورمنٹ کی رعایا میں آزادی راے کی جستجو کرنی۔ جن ملکوں میں ابتداے آفرینش سے بادشاہوں اور اُنکے ارکان سلطنت کی برابر پرستش ہوتی رہی ہو۔ جہاں رعیت کی سلامتی بلکہ زندگی خوشامد اور فرمانبرداری اور رضا و تسلیم پر موقوف ہو۔ جہاں رعیت اور غلام دو مترادف لفظ سمجھے جاتے ہوں۔ اور جہاں آزادی ایک ایسا لفظ ہو جسکے مفہوم سے کوئی واقف تک نہو ایسے ملکوں میں ممکن نہیں کہ مدح و ذم کے اصول راستی و عقل و انصاف پر مبنی ہوں۔ پس اسکے سوا کچھ چارہ نہیں کہ مدح و ذم کا طریقہ یوروپ کی موجودہ شاعری سے اخذ کیا جائے۔ اور آیندہ قصائد کی بنیاد اسی طریقہ پر رکھی جائے۔

مثنوی

مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہی کیونکہ **غزل** یا **قصیدہ** میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے سلسل مضامین کی گنجایش نہیں ہوسکتی۔ **مسدس** میں یہ دقت ہی کہ ہر بند میں چار قافیے ایک طرح کے اور دو ایک طرح کے لانے پڑتے ہیں۔ پس اُس میں بھی مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرنے کہ مطالب برابر بے کم و کاست ادا ہوتے چلے جائیں

اور قافیوں کی نشست اور روزمرہ کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جائے ہر شخص کا کام نہیں ہے **ترجیع بند** بھی مسلسل مضامین کی گوں نہیں ہے۔ کیونکہ اُسمیں ہر بند کے آخر وہی ایک ترجیع کا شعر بار بار آتا ہے جو سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیتا ہے **ترکیب بند** کے اگر تمام بندوں میں بیتوں کی تعداد برابر رکھی جائے تو بھی ایسی ہی دقت پیش آتی ہے کیونکہ اُسکے ایک بند میں صرف ایک پوائنٹ عمدگی سے بیان ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی بلکہ کم و بیش ہوتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ بند بھی چھوٹے بڑے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک بند دو تین بیت کا ہو اور دوسرا پندرہ بیس بیت کا۔ اور یہ بات اُس تناسب کے برخلاف ہے جو شعر کا جزو اعظم ہے۔

الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اُردو شاعری میں متداول ہیں۔ اُن میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دیجا سکتی ہے۔ عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں ظاہرا ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جا سکی۔ جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں۔ اسی لئے عرب شاہنامہ کو قرآن العجم کہتے ہیں۔ اور اسی لئے مثنوی معنوی کی نسبت "ہست قرآں در زبان پہلوی" کہا گیا ہے۔

اُردو میں چند چھوٹی چھوٹی عشقیہ مثنویوں کے سوا اخلاق یا تاریخ وغیرہ میں ظاہرا آج تک کوئی چھوٹی یا بڑی مثنوی کسی مسلم الثبوت اُستاد نے نہیں لکھی عشقیہ مثنویوں کا

حال بھی جیساکہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اس زمانہ کے مقتضٰی اور مذاق سے بمراحل دورتر اور بعید تر ہے۔ جو قصّے ان مثنویوں میں بیان کیے گئے ہیں اُن میں قطع نظر اسکے کہ ناممکن اور فوق العادۃ باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے۔ اکثر مثنویوں میں شاعری کے فرائض بھی پورے پورے ادا نہیں ہوئے۔ مثنوی میں علاوہ اُن فرائض کے جو غزل یا قصیدے میں واجب الادا ہیں کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کی مراعات نہایت ضروری ہے ازانجملہ ایک ربط کلام ہے جو کہ مثنوی اور ہر مسلسل نظم کی جان ہے۔ غزل اور قصیدہ میں ایک شعر کو دوسرے شعر سے جیساکہ ظاہر ہے کچھ ربط نہیں ہوتا۔ الا ماشاءاللہ۔ بخلاف مثنوی کے کہ اُس میں ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہیئے جیسے زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے۔ اسی لیئے جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے اُن سے مثنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں ہو سکتے۔ باورچیوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ پتیلی پکانے والے سے دیگ اچھی نہیں پک سکتی۔ جو نسبت پتیلی کو دیگ کے ساتھ ہے وہی نسبت غزل کو مثنوی کے ساتھ ہے۔ جسطرح پتیلی پکانے والے کو دیگ کے نمک پانی اور آنچ کا اندازہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ اسیطرح جو لوگ غزل میں منہمک ہوجاتے ہیں اور اُن پر غزلیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے وہ مثنوی کی ترتیب اور انتظام سے اکثر عہدہ برآ نہیں ہوتے۔

جس نظم میں کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی فرضی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اُس میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ

مطالب ایسی صفائی سے ادا کیے جائیں کہ اگر اُنھیں مطالب کو نثر میں بیان کیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ واضح اور صاف اور مربوط نہو۔ البتہ نظم کا بیان نثر سے صرف اسقدر ممتاز ہونا چاہیے کہ نظم کی طرز بیان نثر سے زیادہ مؤثر اور دلکش و دلاویز ہو۔

پس مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے۔ اور دونو کے بیچ میں کہیں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت مقدر نہ مانی جائے۔ تب تک کلام جیسا کہ چاہیے مربوط اور منتظم نہ ہو مثلاً **گلزار نسیم** میں کہتا ہے

"خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے"

"پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اِسی کو پھر دیکھ نہ سکیگا کسی کو"

جو مطلب کہ صاحب مثنوی ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ "لوگ تو اُس طفلِ مہ جبیں کو دیکھکر خوش ہوتے تھے۔ مگر نجومیوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ یہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اسکو دیکھکر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیگا کیونکہ اسکو دیکھتے ہی بینائی جاتی رہیگی" ظاہر ہے کہ ان دونو بیتوں میں جب تک کہ کئی لفظ بڑھائے اور کئی لفظ بدلے نہ جائیں تب تک یہ مطلب جو ہمنے اوپر بیان کیا ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا۔ اور پہلا مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہو سکتا۔ یا مثلاً اسی مثنوی میں ہے۔

"نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو چشمک تھی نصیب اُس پدر کو"

مطلب یہ ہے کہ بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے۔ مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے لئے ظلمت تھا۔ پس جب تک دوسرے مصرع کے الفاظ بدلے نہ جائیں کلام مربوط نہیں ہو سکتا۔ یا مثلاً

"آتا تھا شکارگاہ سے شاہ — نظارہ کیا پدر نے ناگاہ"

یہ دونو مصرعے بھی مربوط نہیں ہیں۔ کیونکہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شاہ اَور شخص ہے اور پدر اَور شخص ہے۔ حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ پس دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیے "بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ"۔

۱ــــ بہرحال مثنوی میں ربط کلام کا لحاظ رکھنا خاصکر جب کہ اُسمیں تاریخ یا قصہ بیان کیا جائے نہایت ضرور ہے۔

۲ــــ دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اُسکی بنیاد ناممکن اور فوق العادہ باتوں پر نہ رکھی جائے۔ اگرچہ قصوں اور کہانیوں میں ایسی باتیں بیان کرنے کا دستور نہ صرف ایشیا میں بلکہ کم و بیش تمام دنیا میں قدیم سے چلا آتا ہے اور جب تک کہ انسان کا علم محدود تھا ایسی باتوں کا اثر لوگوں کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن اب علم نے اُس طلسم کو توڑ دیا ہے۔ اب بجائے اسکے کہ اُن باتوں کا لوگوں کے دل پر کچھ اثر ہو اَور اُنپر ہنسی آتی ہے اور اُنکی حقارت کیجاتی ہے اور بعوض اسکے کہ اُنسے کچھ تعجب پیدا ہو شاعر کی حماقت اور سادہ لوحی معلوم ہوتی ہے۔ اب شاعر یا ناولسٹ کی لیاقت اِس سے ثابت ہوتی ہے کہ جو مرحلے پہلے محالات کے ذریعہ سے طے کیے جاتے تھے اور جن کا عادةً طے ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا اُنکو علم اور فلسفہ کے موافق نہایت آسانی

کے ساتھ طے کر جائے۔ مثلاً **شاہنامہ** میں جہاں رستم اور سہراب کو لڑایا ہے وہاں فردوسی یا اصل قصہ بنانے والے کو دو متضاد باتیں ثابت کرنی منظور ہیں۔ ایک سہراب کا رستم سے بہت زیادہ قوی اور تنومند ہونا۔ دوسرے رستم کے ہاتھ سے آخر کار اُسکو قتل کرانا۔ پہلی بات تو اُسنے اسطرح ثابت کی ہے کہ پہلے مقابلہ میں سہراب نے رستم کو پچھڑوایا ہی مگر اب دوسری بات بغیر اسکے ثابت نہیں ہوسکتی کہ رستم میں غیر معمولی طاقت خود بخود پیدا ہوجائے۔ پس اس غرض کے لیئے یہ بات گھڑی گئی کہ رستم نے جوانی میں جبکہ وہ اپنی طاقت اور زور سے تنگ آگیا تھا خدا سے دعا کی تھی کہ میری طاقت کم ہوجائے۔ چنانچہ اُسکی اصلی طاقت بہت کم ہوگئی تھی۔ اب سہراب سے مغلوب ہوکر اُسنے پھر دعا کی کہ میری اصلی طاقت مجھکو ملجائے چنانچہ اُسکی اصلی طاقت جو خدا کے ہاں امانت رکھی تھی اُسکو واپس مل گئی اور دوسرے یا تیسرے مقابلہ میں وہ سہراب پر غالب آگیا۔ لیکن اس زمانہ میں ایسے ڈھکوسلوں سے کچھ کام نہیں چلتا آج کل کسی کو ایسا مرحلہ پیش آئے تو وہ اُسکو اسطرح طے کرسکتا ہے کہ رستم جو کسی سے مغلوب نہ ہوا تھا اور جسکی شہرت تمام ایران اور توران میں ضرب المثل تھی۔ ایک لونڈے کے ہاتھ سے پچھڑ کر اُسکی غیرت سخت جوش میں آئی اور اپنی عمر بھر کی ناموری اور عزت قائم رکھنے کا ولولہ اُسکے دل میں نہایت زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ گو وہ طاقت میں سہراب سے بہت کم تھا۔ مگر سپہگری کے کرتبوں اور تجربوں میں سہراب کو اُس سے کچھ نسبت نہ تھی۔ لہٰذا دوسرے یا تیسرے مقابلہ میں جوش غیرت اور پاس عزت اور فن سپہگری کی مشاقی سے اُسنے سہراب کو مار رکھا۔

رہی یہ بات کہ اخلاقی مضامین جو اکثر قدیم زمانہ کے نامور شعرا نے سوپر نیچرل باتوں کے

پیرایہ میں بیان کیئے ہیں یا اب شایستہ ملکوں میں بیان کرتے ہیں یہ ایک دوسرا عالم ہی
اُنکا مطلب ایسے پیرائے اختیار کرنے سے اخلاقی نتائج نکالنے اور کلام کو تعجب انگیز کرکے
اُس میں اثر پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ ناممکن باتوں کا لوگوں کو یقین دلانا اور اُن کو واقعات کا
لباس پہنانا یہ بالکل ایسی ہی بات ہی کہ ایک شخص جانوروں کے پیرایہ میں خصائل انسانی ظاہر
کرتا ہے اور اُن سے اخلاقی نتائج استخراج کرتا ہے اور دوسرا شخص بغیر اس مقصد کے
جانوروں کی حکایتیں اسطرح بیان کرتا ہے کہ گویا وہ اُن میں فی الواقع تمام خصائل انسانی
ثابت کرنا اور لوگوں کو اُنکا یقین دلانا چاہتا ہے۔ اسمیں اور اُسمیں بہت بڑا فرق ہے۔ پس ایسے
بے سروپا قصے لکھنے سے خاصکر اس زمانہ میں اجتناب کرنا چاہیئے۔

۳۔ مبالغہ کو اہل بلاغت نے صنائع معنوی اور محسنات کلام میں شمار کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ
اُس کی سئے بڑھتے بڑھتے اب وہ اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ کلام کو بے قدر و سبک اور کم وزن
کردیتا ہے۔ انتہا سے انتہا درجہ کا مبالغہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے کہ جو کچھ کسی چیز
کی تعریف یا مدح یا ذم میں کہا جائے گو وہ اُس چیز کے حق میں صحیح نہ ہو مگر کسی نہ کسی چیز پر
صادق آسکتا ہو۔ نہ یہ کہ دنیا میں کوئی چیز اُسکی مصداق نہ ہو۔ اور مبالغہ کی غایت یہ ہونی چاہیئے
کہ جو مطلب بیان کرنا منظور رہے مبالغہ کے سبب سے اُسکا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت
کے ساتھ ہو۔ نہ یہ کہ اُسکا رہا سہا یقین بھی جاتا رہے۔ مثلاً کسی پر رونق بازار کی نسبت ایک
تو یہ کہنا کہ "وہاں صبح سے شام تک کٹورا بجتا ہے" (اگرچہ وہاں کسی وقت بھی کٹورا
نہ بجتا ہو) اور ایک اُسکی تعریف اسطرح کرنی۔

"رات دن جمگھٹا ہے میلا ہے مہرومہ کا کٹورا بجتا ہے"

یا مثلاً ایسے بازار کی نسبت ایک تو یہ کہنا کہ "وہاں چھڑکاؤ سے ہر وقت زمین نم رہتی ہے" اور ایک یہ کہ "وہاں گلاب اور کیوڑے کا نہیں بلکہ آب گوہر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے" پس آج کل ایسے مبالغے باعث شرم سمجھے جاتے ہیں، اور بجائے اسکے کہ اُنسے سامع کے دل پر کوئی نقش بیٹھے یا شاعر کی لیاقت ظاہر ہو اُسکی لغویت اور بے سلیقگی پائی جاتی ہے۔

۴۔ مقتضائے حال کے موافق کلام ایراد کرنا خاصکر قصہ کے بیان میں ایسا ضروری ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بلاغت کا بھید صرف اسی بات میں چھپا ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت وسیع بحث ہے مگر ہم یہاں صرف چند مثالیں دیکر اس مطلب کو ناظرین کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔

مثلاً مثنوی طلسم الفت میں اُس موقع پر جب کہ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے وزیر رشید آپنے شہزادہ کے لیئے نسبت کا پیغام لیکر شہر حسن آباد میں شاہانہ جاہ و حشم کے ساتھ پہنچا ہے اور حسن آباد کے بادشاہ نے اُسکے آنے کی خبر سُنکر اپنے وزیر کو اُس سے گفتگو کرنے کے لیئے بھیجا ہے وہاں صاحب مثنوی اسطرح بیان کرتا ہے۔

جاتے ہی اُسنے قرب شہر پناہ خیمہ اپنا کیا بہ شوکت و جاہ
بسکہ دانائے روزگار تھا وہ مرد میدان کارزار تھا وہ
رُعب پہلے ہی سے بٹھلانے کو صولت و دبدبہ دکھلانے کو
کی اُسی روز لشکر آرائی کثرتِ فوج سب کو دکھلائی

خبر آمد کی اُسکی عام ہوئی — خلق دہشت زدہ تمام ہوئی
اتنے میں وھاں کے شہریار کو بھی — خبر اُسکے ورود کی گذری
کہ کسی شہر کا کوئی سردار — لیکے ہمراہ لشکر جرار
آکے اُترا ہے قربِ شہر پناہ — مستعد جنگ پر ہے وہ ذی جاہ
سنتے ہی وہ کمال گھبرایا — وزرا کو بُلا کے فرمایا
دیکھو تو کس کا لشکر اُترا ہے — کون ہم پر غنیم آیا ہے
الغرض اک وزیر با تدبیر — اپنی ہمراہ لیکے فوج کثیر
تھا فرو کش جہاں وہ ہم پایہ — وھاں ملاقات کے لیئے آیا
سنتے ہی پاس یہ کیا اُس نے — بے تکلف بُلا لیا اُس نے
تا لبِ فرش لینے کو آیا — ملکے پہلو میں اپنے بٹھلایا
پہلے تو ذکر ادھر اُدھر کا رہا — بعد اک طور سے یہ اُسنے کہا
کہ جہاں دار جو ہمارا ہے — اُس فلک قدر نے یہ پوچھا ہے
آپنے کی ہے کیوں ادھر تکلیف — کس ارادہ سے لائے ہیں تشریف
سیر کا عزم ہے تو گھر ہے یہ — ہر مسافر کا رہگذر ہے یہ
دل میں گر اور کچھ ارادہ ہو — تو میں باہر نہیں ابھی آؤ
فقط اتنی ہی دیکھتا تھا میں راہ — دیر پھر کس لیئے ہے بسم اللہ

اس بیان میں قطع نظر لفظی کمزوریوں کے بڑی کسر یہی ہے کہ کلام مقتضاے حال کے موافق

ایراد نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے بیان میں مؤرخ خود واقعات کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ اور قصہ میں واقعات اُسکے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ تاریخ میں جس واقعہ کی صحت بخوبی ثابت ہو جائے اُس کی جواب دہی مؤرخ کے ذمہ باقی نہیں رہتی البتہ اُسکا یہ فرض ہے کہ اُسکے اسباب کا تفحص کرے اور بتائے کہ کیوں ایسا واقع ہوا۔ بخلاف قصہ کے کہ اُسکے بیان میں جو بے ربطی پائی جائے گی اُسکا ذمہ دار خود قصہ کا بنانے والا ہے۔ اولاً تو نسبت کے پیغام کو پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سے طے نہ کرنا اور دفعۃً وزیر اور شاہزادہ کے ساتھ ایک لشکر جرار روانہ کر دینا۔ پھر وزیر کا فوج کثیر لیکر اور مہینوں کا رستہ طے کر کے حسن آباد کی شہر پناہ تک پُہنچ جانا اور بادشاہ حُسن آباد کو اُسکے حال اور اُسکے ارادہ کی مطلق خبر نہ ہونی پھر اُسکا حال دریافت کرنے کے لیئے بادشاہ کا وزیر کو مع فوج کثیر کے بھیجنا۔ پھر وزیر کا بادشاہ کی طرف سے مہمان کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جیسی کہ بازاریوں میں ہوتی ہے یعنی یہ کہ "اگر کچھ اور ارادہ ہو تو میں اُس سے بھی باہر نہیں ہوں میں بس اتنی ہی راہ دیکھتا تھا اب دیر کیا ہے بسم اللہ" بالکل مقتضائے مقام کے خلاف ہے۔

اسکے بعد **شیدا** وزیر۔ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے نسبت کا پیغام دینے کے بعد کہتا ہے

جاہ و حشمت کا کچھ اگر ہو خیال — تو یہ بیجا ہے اے ہمایوں فال
آپ ہیں اپنے شہر کے سلطاں — بندہ ہے تاج بخش باج ستاں
دل میں انصاف کیجئے تو صریح — ہر طرح سے ہے بندہ کو ترجیح

کہ میں سلطانِ خسرواں ہوں آج بلکہ شاہنشہِ جہاں ہوں آج
میرے قبضے میں ہیں کئی اقلیم بخشتا ہوں میں افسر و دیہیم
مجھکو دی ہے خدا نے وہ طاقت وہ مرادبار بہ ہے اور صولت
آج چاہوں تو باج دے قارون ربعِ مسکوں پہ سکہ بٹھلاؤں
زور دکھلانے پر میں آؤں اگر چھین لوں تاج خسروِ خاور
میں دلاور وہ ہوں وہ ہوں سفاک ہفت اقلیم میں ہے جسکی دھاک
سرکش آآکے پاؤں پڑتے ہیں ناک در پر مرے رگڑتے ہیں

اس بیان کی بے ربطی بھی ظاہر ہے کہ وزیر نے جس بادشاہ کی طرف سے نسبت کا پیغام دیا ہے اور جسکا منصب عجز و انکسار کرنے کا ہے۔ اُسکی طرف سے ایسی نامعقول گیدڑ بھبکیاں دیتا ہے اسکے بعد جب وزیرِ حسن آباد شیدا کی تقریر سنکر اپنے بادشاہ کے پاس واپس گیا ہے اور وہاں جاکر اُسنے شیدا کی تقریر کا اعادہ کیا ہے تو بادشاہِ حُسن آباد اُسکے جواب میں کہتا ہے۔

ہاں کہو جلد فوج ہو تیار مابدولت کے لاؤ تو ہتھیار
دیکھیں تو کتنا حوصلہ ہے اسے ہمسے عزمِ مقابلہ ہے اسے
لوہا دکھلانے کو یہ آیا ہے ہمکو کیا موم کا بنایا ہے
بادشاہ اسکا کیا ہے یہ کیا ہے کثرتِ فوج پر یہ بھولا ہے

یہ تمام تقریر ایسی سبک اور کم وزن ہے کہ ہرگز کسی بادشاہ کے مونہ سے زیب نہیں دیتی۔ بلکہ

یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بادشاہ کی حماقت ظاہر کرنے کے لیئے کوئی شخص اُسکی نقل اُتار رہا ہی۔ پھر جب امیروں نے بادشاہ کو سمجھا بُجھا کر ٹھنڈا کیا ہے تو وزیر بادشاہ کی طرف سے **شیدا** کے پاس یہ مصالحت آمیز پیغام لیکر چلا ہے۔

یہ تعلی جو آپ کرتے ہیں اتنا جرأت کا دم جو بھرتے ہیں
سابقہ ہو تو حال کُھل جائے ادھر آؤ تو حال کُھل جائے
گو کہ میں تم سا خود پسند نہیں سیکڑوں سے بھی پر میں بند نہیں
سر بھی جائے تو یہ قدم نہ ہٹیں ٹل بھی جائے زمیں تو ہم نہ ہٹیں
یھاں تو رستم سے بھی نہیں ڈرتے شیر سے بھی جری نہیں ڈرتے
کیا کروں پاس ہے شریعت کا دھیان ہے دوستی و اُلفت کا
شرم ہے میہماں کے آنے کی رسم بھی ہے یہی زمانے کی
ورنہ سیر آپ کو دکھا دیتا سب گھمنڈ آپ کا مٹا دیتا

یہاں تک خود بادشاہ کا پیغام بادشاہ کی طرف ہی۔ ان تمام ابیات میں الفاظ و محاورات کی لغزشوں سے ہم کچھ بحث نہیں کرتے۔ البتہ ہمکو یہ دکھانا منظور ہے کہ کلام بالکل مقتضائے حال کے برخلاف ایراد کیا گیا ہے۔ اسی داستان پر کچھ موقوف نہیں ہے۔ اس مثنوی میں کہیں بھی اس بات کا خیال نہیں کیا گیا کہ جیسا موقع ہو ویسی گفتگو کیجائے۔ اس داستان سے پہلے جہاں بادشاہِ حُسن آباد اور اُسکی بُڑھیا ملکہ بیٹیوں کے عقد کے باب میں باہم مشورہ کر رہے ہیں اسطرح بیان کرتا ہے۔

ایک دن بادشاہِ حُسن آباد | اندرونِ محل تھا بادلِ شاد
اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا | محوِ راحت تھا مستِ عشرت تھا
اُس پر پیرو نے تخلیہ پاکر | عرض کی اختلاط میں آکر
لڑکیوں کا نہیں کچھ آپکو دھیان | ہو چکی ہیں سلامتی سے جوان
اور باتوں کا تو نہیں کچھ غم | ہاں مگر یہ خیال ہے ہر دم
کہ میں بیٹھی ہوئی ہوں پا بہ رکاب | طاقتِ جسم دے چکی ہے جواب
سب مہیا ہیں کوچ کے ساماں | اَور دو چار دن کی ہوں مہماں
کچھ ہی دن اب سفر میں باقی ہیں | انکا سہرا تو دیکھ لیتی میں
سن کے کہنے لگا وہ عالی جاہ | تیرے کہنے ہی تک ہے کیا اے ماہ
بخدا خود خیال ہے مجھکو | جستجو بھی کمال ہے مجھکو
مجھکو غیروں میں تو قبول نہیں | اُنسے جز رنج کچھ حصول نہیں
یہ بھی بالفرض گر کروں منظور | تو یہ مجھسے کبھی نہ ہوا اے حور

اس تقریر میں بھی اکثر الفاظ بالکل بے محل اور بے موقع استعمال ہوئے ہیں۔ بادشاہ خود شیخ فانی ہے اور اُسکی ملکہ بھی عجوزِ سالخوردہ ہے۔ وہ خود جابجا کہتی ہے کہ میں پا در رکاب بیٹھی ہوں، اور چناں ہوں اور چنیں ہوں۔ باوجود اسکے ایسے الفاظ استعمال کرنے کہ "اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا یا محو راحت اور مستِ عشرت تھا۔ یا اُس پر پیرو یعنی بڑھیا نے اختلاط میں آکر عرض کی۔ یا بادشاہ کا اپنی بڑھیا ملکہ کو کہیں اے ماہ اور کہیں اے حور کہنا یہ سب باتیں

مقتضائے حال کے خلاف ہیں۔

ایک جگہ جب کہ شاہزادہ کو غش آگیا ہے اور یہی بڑھیا ملکہ جو اُسکی ماں ہے محل کے اندر گھبرا رہی ہے۔ اور بار بار اُس کی خبر باہر سے منگواتی ہے۔ ایک خواص باہر سے یہ کہتی آئی ہے۔

" لوگو بتلاؤ تو کہاں ہیں حضور کہدو کیا بیٹھی کرتی ہو اے حور "

پھر تھوڑی دیر کے بعد اَور نوکریں آکر یہ کہتی ہیں۔

" دوڑسی دوڑ ہو رہی ہے حضور باہر اندر یہی ہے ذکر اے حور "

دونو جگہ ایک مصرع میں ملکہ سالخوردکو حضور اور دوسرے مصرع میں اے حور کہنا اور پھر نوکروں کا اور وہ بھی نہایت تشویش کی حالت میں کہنا بالکل مقتضائے حال کے خلاف ہے۔

نواب مرزا شوق لکھنوی نے جو چار مثنویاں یعنی بہارعشق۔ زہرعشق۔ لذت عشق اور فریب عشق لکھی ہیں۔ اگرچہ اُنکو روزمرہ اور محاورہ کی صفائی۔ قافیوں کی نشست۔ ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے میں تمام اُردو کی موجودہ مثنویوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن قطع نظر اسکے کہ وہ حد سے زیادہ امورال اور خلاف تہذیب ہیں۔ اُن میں بھی مقتضائے حال کے موافق ایرادِ کلام کا بہت کم لحاظ کیا گیا ہے۔ مثلاً **لذت عشق** میں اُس موقع پر جہاں بادشاہزادہ اور وزیرزادہ اپنے ساتھ والوں سے بچھڑکر کسی باغ میں دم لینے کو ٹھیرے ہیں اور رستے کی تکان سے ایک چبوترہ پر پڑکے سو رہے ہیں وھاں اُس شہر کی شاہزادی جو باغ کی مالک ہے اور اُسکے ساتھ وزیرزادی دونو باغ کی سیر کو آئی ہیں اور اُن دونو

سوتوں کے سر پر جا کھڑی ہوئی ہیں۔ اور ایسے قہقہے لگائے ہیں کہ وہ جاگ اُٹھے ہیں۔ اُسوقت شاہزادہ نے جو دیکھا کہ شام ہوگئی ہے وہ وہاں سے چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور بادشاہزادی اُس سے اسطرح گفتگو کرتی ہے۔

کہا ہنسکے ملکہ نے اے مہ جبیں مجھے تیری فرقت گوارا نہیں
مرا کہنا اس وقت کا مان لے نہیں جان دیدوں گی یہ جان لے
خدارا نہ ٹالو مری بات کو یہیں آج رہ جاؤ اب رات کو

اسکے بعد وزیرزادہ ملکہ سے کہتا ہے کہ اگر آپ میری اک عرض قبول کرلیں تو نہ میں قدموں سے جدا ہوں گا اور نہ شاہزادہ یہاں سے جائے گا۔ اسکے بعد کہتا ہے۔

کھڑی ہے جو یہ پاس دختِ وزیر حقیقت میں ہے یہ نہایت شریر
انیلا پن اس کا بہت مجھے بھا گیا کروں کیا دل اسپر مرا آ گیا
مجھے اسکو دیدیجئے گر حضور تو ساری حرمزدگی ہو جائے دور

یہ سنکر دختِ وزیر۔ وزیرزادہ سے کہتی ہے۔

سمجھنا نہ دل میں ذرا مجھکو نیک سُناؤں گی سو گر کہے گا تو ایک
نہ ملکہ کی باتوں پہ مغرور ہو ہوا کھا ذرا چل پرے دور ہو
ذرا ہوش کی لے تو اپنے خبر میں جوتی نہ ماروں ترے نام پر

اول تو عورت ذات۔ دوسرے بادشاہزادی۔ پھر پہلی ملاقات۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ شاہزادہ پر مائل ہوگئی ہے اور اُسکو اپنے اوپر مائل کرنا چاہتی ہے۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ وہ

بیسواہی ہے تو بھی اُسکی گفتگو ایک محض اجنبی مرد کے ساتھ ایسی کھلی ڈلی اور بے حجابانہ۔ یا شوق کا اظہار ایسے تقاضے کے ساتھ کہ جس سے دوسرے کو نفرت ہو جائے کسقدر بے محل اور بے موقع ہے۔ پھر وزیر زادہ کی پہلی ہی گفتگو دختِ وزیر کی نسبت ایسی عامیانہ اور عشق کا اظہار ایسے بھونڈے پن کے ساتھ۔ اور پھر دختِ وزیر کا پتنیوں کی طرح جواب دینا یہ تمام باتیں بلاغت کے بالکل خلاف ہیں۔ میر حسن نے بدر منیر میں بعینہ ایسے ہی موقع پر یعنی جبکہ پہلے ہی پہل بے نظیر۔ بدر منیر کے باغ میں آیا ہے اور بدر منیر اُسکو دیکھکر فریفتہ ہو گئی ہے۔ یوں بیان کیا ہے۔

کہ وہ نازنیں کچھ جھجک مونہ چھپا — کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
چلی اُسکے آگے سے مونہ موڑکر — وہیں نیم بسمل اُسے چھوڑ کر
ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی — چھپا مونہ کو اور مسکراتی چلی
"یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں — میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں"
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں — چھپی جاکے اپنے وہ دالان میں
دیا ہاتھ سے چھوڑ پردہ شتاب — چھپا ابر تاریک میں آفتاب

اس بیان میں شوق کے بیان کی نسبت موقع اور محل کا جیساکہ ظاہر ہے زیادہ خیال کیا گیا ہی۔ اسکے بعد عین ملاقات کے وقت بھی میر حسن کے بیان میں شرم و حجاب کا بہت لحاظ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس موقع کو اسطرح بیان کرتا ہے۔

بزور اُسکو لاکر بٹھایا جو وھاں — نہ پوچھ اُس گھڑی کی ادا کا بیاں

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے بدن کو چُرائے ہوئے ناز سے
مُنہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
گھڑی دو تلک وہ مہ و آفتاب رہے شرم سے پا بہ بند حجاب

۵۔۔۔ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان وغیرہ کی بیان کیجائے وہ لفظاً اور معنًی نیچرل اور عادت کے موافق۔ ایسی ہونی چاہیئے جیسی کہ فی الواقع ہوا کرتی ہے۔ اس موقع پر ہم بطور مثال کے **شوق** اور **میر حسن** دونو کی مثنویوں سے کچھ کچھ اشعار نقل کرتے ہیں۔ شوق جدائی کے زمانہ میں ملکہ کی حالت اسطرح بیان کرتا ہے۔

نہ رونے سے دم بھر تامل کیا نہ خاصہ بھی دن بھر تناول کیا
یہ نقشہ چمن کا مبدل ہوا کہ گلزار جو تھا وہ جنگل ہوا
وہ آتشکدہ سب چمن گل کا تھا صدا سوز کی نالہ بلبل کا تھا
دکھائی دیا یوں وہ نہروں کا آب کہ ملکہ کی گویا ہے چشم پر آب
تھے رقاص طاؤس جو باغ کے نمونہ تھے ملکہ کے ہر داغ کے
لگے خُوشے جو حسبِ دستور تھے وہ سب زخم ملکہ کے انگور تھے
شجر جتنے تھے صورتِ غم تھے سب جو تھے سرو وہ نخل ماتم تھے سب
صبا نے چمن میں اُڑائی تھی خاک دل ملکہ تھا مثل گل چاک چاک
ہوا دن تو رونے میں اُسکا بسر قیامت مگر رات آئی نظر

نہ پہلو میں پایا جو اُس یار کو — ہوا صدمہ اک جان بیمار کو
ذرا یاد بھولی نہ اُس ماہ کی — جو کروٹ بھی لی دل سے اک آہ کی
نظر آ گیا چاندنی میں جو باغ — ہوا تازہ اس غم سے اک دل پہ داغ
ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی جو چلنے لگی — یہ فرقت کی آتش سے جلنے لگی
سحر تک دل اُس کا بھٹکتا رہا — کہ پہلو میں کانٹا کھٹکتا رہا
تصور جو تھا اُس گل اندام کا — کوئی پہلو نکلا نہ آرام کا
تڑپتی تھی پر رنج جاتا نہ تھا — کسی طرح آرام آتا نہ تھا
خدا کھو دے بنیاد اس چاہ کی — جدھر پھر گیا مُنہ اُدھر آہ کی
کبھی ہو گئے دونو رخسار زرد — کبھی ہو گئے دست و پا دونو سرد
کبھی رنگ رُخ کے بدلنے لگے — کبھی شعلے مُنہ سے نکلنے لگے
کبھی ضبط وہ چاہ کرنے لگی — کبھی چیخ کر آہ کرنے لگی
کبھی جان جینے سے عاری ہوئی — کبھی غش کی صورت سی طاری ہوئی
نہ نیند آئی ہرگز سحر ہو گئی — یہ شب اُسکے غم میں بسر ہو گئی
اُڑے آشیانوں سے اپنے پرند — ہوئی بانگ اللہ اکبر بلند
ہوا پھر تو یہ شاہزادی کا حال — کہ گھٹ کر ہو جوں ماہ کامل ہلال
تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی — نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی
بہت آ گیا فرق اوقات میں — وہ کھیانا ہو جانا ہر بات میں

وہ گرمی سے رُخ تمتمایا ہوا　وہ رونے سے مُنہ بھر بھرایا ہوا
وہ سوجی ہوئی بَرنیاں اور گال　وہ آنکھوں میں ڈورے پڑے لال لال
غرض کیا بیاں ہو کہ جو حال تھا　جو دیکھے وہ رووے یہ احوال تھا

اگرچہ اس نظم میں اول کی چند بیتوں کے سوا سارا بیان بہت صاف اور نیچرل ہو مگر **میر حسن** نے **شوق** سے تقریبًا ستر برس پہلے جب کہ زبانِ اُردو کی ابتدائی حالت تھی۔ اسی مقام کا سما اُس سے زیادہ نیچرل طور پر باندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی　بہانے سے جا جا کے سونے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب　لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا　نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے　محبت میں دن رات گھُٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بیوی چلو　تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے　تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی　یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے　کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اُسے　غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے
نہ کھانے کی سُدہ اور نہ پینے کا ہوش　بھرا دل میں اُسکے محبت کا جوش
کسی نے کہا سیر کیجے ذرا　کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا

چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر | وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
نہفتہ اُسی سے سوال و جواب | سدا روبرو اُسکے غم کی کتاب
غزل یا رباعی و یا کوئی فرد | اُسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جسمیں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں | نہیں تو کچھ اس کی بھی پروا نہیں
سبب کیا کہ دل سے تعلق ہی سب | نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہی غضب
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل | کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
زباں پر تو باتیں و لے دل اُداس | پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ مونہ کی خبر اور نہ تن کی خبر | نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں | جو کرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مستی ہے دو دن کی تو ہے وہی | جو کنگھی نہیں ہے تو یوں ہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام | نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سو بھاؤ | کہ بگڑے سے دونا ہو ان کا بناؤ
نہیں حسن کی اسطرح بھی کمی | جو بیٹھی ہے بگڑی تو گویا بنی
غرض بے ادائی ہے یہاں کی ادا | بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہے بھلا

ان دونو نظموں میں بہ اعتبار سادگی اور نیچرل ہونے کے جو فرق ہے اُسکے بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن میر حسن کے بیان میں جہاں جہاں نیچرل حالت کی تصویر بعینہٖ کھینچی گئی ہے اُسکو جتا دینا ضرور ہے۔ بہانہ سے جا جا کے سونا۔ دحشت آلودہ خواب دیکھنا

جہاں بیٹھ جانا پھر وہاں سے نہ اُٹھنا۔ اگر کسی نے اُٹھنے کو کہا تو اُٹھ کھڑا ہونا نہیں تو بیٹھے رہنا۔ کسی نے حال پوچھا تو خیر و عافیت کہدی۔ کسی نے بات کی تو جواب دیدیا مگر بے ٹھکانے۔ کسی نے کھانے کو کہا تو کہا بہت اچھا نہیں تو کچھ نہیں۔ ہر کام اوروں کے کہنے سے کرنا نہیں تو کچھ نہ کرنا۔ دل ہی دل میں کسی سے سوال و جواب کرنے۔ دن رات کسی کی صورت آنکھوں کے سامنے رہنی۔ زبان سے باتیں کرنی اور دل میں اُداس رہنا۔ جو سر کھُلا رہی تو کھلا ہی ہے جو کُرتی میلی ہے تو میلی ہی ہے۔ جو مسی نہیں مَلی تو یونہیں سہی۔ جو کنگھی نہیں کی تو بے کنگھی ہی سہی۔ نہ سرمہ سے مطلب نہ کاجل سے غرض۔ مگر بغیر بناؤ سنگار کے بھی بھلا لگنا اور بگڑنے سے اور زیادہ بننا۔ یہ سب ایسی سچی اور پتے کی باتیں ہیں جو ہمیشہ ایسی حالتوں میں واقع ہوا کرتی ہیں۔ اگرچہ **شوق** کا بیان اور مثنویوں کی نسبت نہایت عمدہ ہی۔ مگر جیسی جچی تُلی باتیں **میر حسن** نے بیان کی ہیں ویسی **شوق** کے ہاں بہت کم ہیں۔

جو لوگ صنعتِ الفاظ پر فریفتہ ہوتے ہیں اور لفظی مناسبتوں پر جان دیتے ہیں وہ کبھی کسی نیچرل حالت کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ یہی جدائی اور انتظار کا بیان **طلسم الفت** میں اسطرح کیا گیا ہے۔

شرم اُسکو حیا سے آنے لگی بے حجابی کے ناز اُٹھانے لگی
کم وقاری کی قدر بڑھنے لگی چشم ترچھی نظر پہ چڑھنے لگی
ٹھنڈی سانسوں کا دم وہ بھرنے لگی سوزِ الفت کا پاس کرنے لگی

پان کے بدلے خونِ دل کھانا — دیکھکر مہندی پانو پھیلانا
رات دن ہم کلام خاموشی — یاد ہر دم زخود فراموشی
گرم صحبت تھی سرد آہوں سے — سرمہ بھی گر گیا نگاہوں سے
ناتوانی بھی زور کرنے لگی — لاغری فکر گور کرنے لگی
آشنا دودِ آہ لب سے ہوا — اوجِ سوزِ دل اس سبب سے ہوا
شدتیں دردِ دل کی سہنے لگی — یاس پہلو کے پاس رہنے لگی
رنگ خونِ جگر بھی لانے لگا — آنکھ سے جائے اشک آنے لگا
سرگرانی بھی سر اُٹھانے لگی — بیقراری سے چین پانے لگی
کاجل اور آئینہ سے آٹھ پہر — چشم پوشی تھی اُس کو مدِ نظر
روز افزوں تھا شوق کم سخنی — زردیِ رنگ رُخ پہ غازہ بنی
چوٹی بھولے سے بھی نہ گُندھواتی — پیچ و تاب اَور کنگھی سے کھاتی
ذکر سُن سُن کے لاکھے کا وہ نگار — ہونٹ اپنے چباتی سو سو بار
ہمنشینوں سے ہوگئی نفرت — کُنجِ عُزلت سے رہتی تھی خلوت
خشکیِ لب جو کرتی مونہ زوری — صاف کر جاتی اُسکی غمخوری
بدلے ہنسنے کے روز رونا تھا — خاک مسند کی جا بچھونا تھا
خاصہ جسوقت کوئی لاتی تھی — گھڑیوں اُبکائی اُسکو آتی تھی
کوفت کھانے سے بس وہ جیتی تھی — خونِ دل جائے آب پیتی تھی

گو کہ دردِ جگر مصاحب تھا ضبط آٹھوں پہر مصاحب تھا

گاہ آنکھیں لگی ہوئیں چھت سے شور سے گاہ دردِ فرقت سے

دل سے کہنا کبھی نہیں رہ دل دلربا کا یہ زعم ہے باطل

کچھ تو امید جی میں تھی کچھ یاس گاہ درجہ یقین کا گاہ ہراس

یہ مثنوی لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر آفتاب الدولہ مہرالملک خواجہ اسد علیخاں بہادر شمس جنگ متخلص بہ **قلق** کی ہے۔ سُنا ہے کہ اکثر اہل لکھنؤ اسکو اعلیٰ درجہ کی مثنوی سمجھتے ہیں۔ شاید ایسی ہی ہو۔ مگر افسوس ہے کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق سے بالکل آشتی نہیں رکھتی۔ جو شعر ہمنے اس مقام پر اُس سے نقل کیے ہیں۔ اُنکی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ اس مثنوی کا تمام بیان اول سے آخر تک اسی قبیل کا ہے۔ لفظی رعایتوں میں معنی کا سر رشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اور کوئی حالت یا سماں جیسا کہ چاہیے بیان نہیں ہو سکتا۔ اول کے چاروں شعروں میں پہلے مصرعوں کا تو بمشکل کچھ کچھ مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ مگر آخر کے چاروں مصرعوں کا مطلب ہماری سمجھ میں مطلق نہیں آیا۔ اِنکے بعد بھی اکثر مصرعے اسیطرح کے ہیں۔ باقی جن شعروں یا مصرعوں کا مفہوم کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ اُن میں کوئی بات سیدھی طرح نہیں بیان کی۔ مثلاً "اُسکو کسی کی شرم باقی نہیں رہی تھی" اسکو یوں بیان کیا ہے کہ "اُسکو شرم سے شرم آنے لگی" یا "رات دن وہ خاموش رہتی تھی۔" اسکی جگہ "وہ خاموشی سے ہمکلام رہتی تھی" یا "وہ خود فراموش رہتی تھی" اسکی جگہ "اُسکو خود فراموشی یاد رہتی تھی" غرضکہ کل اشعار کا حال جیسا کہ ظاہر ہے ایسا ہی ہے یا اس سے بھی زیادہ ژولیدہ اور اُن نیچرل

مثنوی **گلزار نسیم** میں بھی لفظی رعایتوں کا بہت التزام کیا گیا ہے۔ اُس نے بھی **بکاولی** کا حال تاج الملوک کے فراق میں کچھ مختصر سا لکھا ہے۔ وہ اس طرح بیان کرتا ہے

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں ۔۔۔ آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ ۔۔۔ کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذری بے خور و خواب ۔۔۔ زائل ہوئی اُس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ ۔۔۔ ہیأت میں مثال رہ گئی وہ

اس بیان میں بھی تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا اور ظاہراً اُسنے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں۔ اُسکو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی۔ پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔ کپڑوں کی عوض رنگ بدلتی تھی وغیرہ وغیرہ۔

۲ ۔۔۔ قصہ میں اسبات کا بھی لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے۔ کیونکہ اس سے قصّہ نگار کا پھوڑپن ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ سچ مچ اس مثل کا مصداق بنتا ہے کہ " دروغگو را حافظہ نباشد "۔ آج کل جو شایستہ ملکوں میں نوول لکھے جاتے ہیں اُنکا تو کیا ذکر ہے۔ ایشیا کے قدیم زمانہ کے قصہ نویسوں نے بھی اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھا ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کے منافی نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ قصّہ میں کسی خاص واقعہ کا بیان نہیں ہوتا۔ مگر قصہ نگار اُسکو ایک واقعہ ہی کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ پس اُسکو ایسے طور پر بیان کرنا جس سے جا بجا اُسکی غلط بیانی ثابت ہو اصولِ قصہ نگاری کے خلاف ہے

جو کاریگر کسی انسان کی صورت پتھر یا دھات کی بناتا ہے ظاہر ہے کہ وہ صورت انسان کی نقل ہوتی ہے نہ اصلی انسان۔ لیکن کاریگر کا فرض ہے کہ اُسمیں اور اصلی انسان میں ایک جان پڑنے کے سوا اور کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ اسیطرح قصہ نگار کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ قصہ بالکل واقعات کی شکل میں بیان کیا جائے۔ اِس مطلب کے ذہن نشین کرنے کے لیئے ہم چند شعر مثنوی طلسمِ اُلفت کے نقل کرتے ہیں۔ ایک قصہ گو۔ شاہزادۂ عشق آباد یعنی **جانِ جہان** سے حُسن آباد کی شہزادی **عالم آرا** کا حال اپنی آنکھوں دیکھا بیان کر رہا ہے۔ کہ جب میں حُسن آباد میں پہنچا تو ایک شخص نے مجھسے عالم آرا کے حُسن و جمال کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہا

" دیکھنا بھی تو اُسکا مشکل ہے — کہ وہ لیلیِ بیانِ محمل ہے "

" آدمی کیا ملک سے پردہ ہے — بلکہ چشمِ فلک سے پردہ ہے " (یعنے پردہ میں ہے)

اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکو بڑے اہتمام کے ساتھ پردہ میں رکھا جاتا ہے۔ مگر اسی بیان میں اُسکا ذکر ہوتے ہوتے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ باغ میں جس دریچہ میں جا کر وہ بیٹھتی ہے وہاں۔

" تہِ بام اژدہام رہتا ہے — مجمع خاص و عام رہتا ہے "

" مشقِ جور و ستم کسی پر ہے — چشمِ لطف و کرم کسی پر ہے "

" ناز سے ایک سے کلام کیا — ایک کو غمزہ سے تمام کیا "

" وصل کا ایک سے کیا اقرار — ایک مشتاق سے کیا انکار "

" دو ہی فقروں میں اک کو ٹال دیا — ٹھٹھے بازی میں اک کو ڈال دیا "

کھینچ مارا کسی پہ ہنس کے اُگال   رخ سے مونہ کسیکا ہو گیا لال
دور سے ہنسکے اک کو شاد کیا   قربِ پردہ کسیکو یاد کیا
یوں ہی وہ دن تمام ہوتا ہے   کیا کہوں قتل عام ہوتا ہے
دو گھڑی دن رہے سے تا سرِ شام   جلوہ آرا رہی وہ مہر اندام

غرض کہاں تک لکھوں دور تک ایسے ہی اشعار جنسے نہ صرف بے پردگی بلکہ غایت درجہ کا بیسواپن پایا جاتا ہے چلے جاتے ہیں۔ اس بیان میں اور اوپر کے دونو شعروں کے بیان میں جو منافات ہے وہ ظاہر ہے۔ ایسی مثالیں اس مثنوی میں اور گلزار نسیم میں بہت ہیں۔ مگر اور مثنویاں بھی اس سے بالکل پاک نہیں ہیں۔

۷۔۔۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا ضرور ہے کہ قصے کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کیجائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ جسطرح ناممکن اور فوق العادۃ باتوں پر قصہ کی بنیاد رکھنی آج کل زیبا نہیں ہے۔ اسی طرح قصہ کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی جن کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس سے قصہ نگار کی اتنی بے سلیقگی ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ اُس کی لاعلمی اور دنیا کے حالات سے ناواقفیت اور ضروری اطلاع حاصل کرنے سے بے پروائی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً بدر منیر میں ایک خاص موقع اور وقت کا سماں اسطرح بیان کیا ہے۔

وہ گانے کا عالم وہ حُسنِ بتاں   وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
درختوں کی کچھ چھانو اور کچھ وہ دھوپ   وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

اخیر مصرع سے صاف یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ایک طرف دھان کھڑے تھے اور ایک طرف سرسوں پھول رہی تھی۔ مگر یہ بات واقع کے خلاف ہی کیونکہ دھان خریف میں ہوتے ہیں اور سرسوں ربیع میں گیہوں کے ساتھ بوئی جاتی ہے

یا مثلاً مثنوی طلسم الفت میں جبکہ شاہزادہ **جان جہان** کا جہاز غرق ہوتا ہے اور جان جہاں اور سب اہل جہاز ڈوب چکے ہیں۔ اسطرح بیان کرتا ہے۔

دوسرے دن وہ گوہرِ یکتا　　جھیل کر محنتِ محیط بلا

مثلِ خورشید ڈوب کر نکلا　　زندہ اک تختہ پر مگر نکلا

یعنی جان جہان ایک رات اور ایک دن ڈوبے رہنے کے بعد زندہ دریا سے نکلا اور نکلا بھی ایک تختہ پر بیٹھا ہوا۔ اول تو اسقدر عرصہ کے بعد زندہ نکلنا اور پھر قعرِ دریا سے ایک تختہ پر بیٹھے ہوئے نکلنا۔ بالکل تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے

۸ — جسطرح اُن اہم اور ضروری باتوں کو جن پر قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرنا ضرور ہے۔ اسیطرح اُن ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں ہیں رمز و کنایہ میں بیان کرنا ضرور ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری مثنویوں میں دونو باتوں کا بہت کم لحاظ کیا گیا ہے۔ مثلاً گل بکاولی کے قصہ میں سارے قصہ کی بنیاد صرف اس بات پر رکھی گئی ہے کہ زین الملوک کے جب پانچواں بیٹا پیدا ہوا تو نجومیوں نے یہ حکم لگایا کہ اگر بادشاہ اس بیٹے کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھیگا تو اُسکی بینائی جاتی رہے گی۔ مگر گلزار نسیم میں اس بات کو ایسا ناکافی طور پر بیان کیا ہے کہ اگر گل بکاولی کا قصہ پہلے سے کسیکو معلوم نہ ہو تو

اُسکی سمجھ میں کچھ نہیں آسکتا۔ رہی دوسری بات سو اُسکا خیال تو ہمارے شعرا نے کبھی بھولکر بھی نہیں کیا بلکہ جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہیں وہاں اور بھی زیادہ پھیل پڑتے ہیں۔ اور نہایت فخر کے ساتھ ناگفتنی باتوں کو کُھلم کُھلا بیان کرتے ہیں۔ افسوس کہ ہم ایسے موقعوں کی زیادہ صاف اور کُھلی ہوئی مثالیں نہیں دے سکتے۔ صرف تصریح اور کنایہ کی صورت زیادہ ذہن نشین کرنے کے لیئے یہاں ایک سرسری مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ خواجہ **میر اثر** دہلوی اپنی مثنوی **خواب و خیال** میں اختلاط کے موقع پر کہتے ہیں۔

"ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا کُھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا"

دوسرے مصرع میں اس بات کی کچھ تصریح نہیں کی گئی کہ کیا چیز کُھلتی جاتی تھی اور کس چیز کو بار بار ڈھانپا جاتا تھا۔ یہ مطلب اس سے بہتر لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسے موقع پر ہمیشہ بولا بھی یونہیں جاتا ہے کہ سینے یا چھاتی یا محرم وغیرہ کا صراحتاً نام نہیں لیا جاتا۔ اسی مطلب کو نواب مرزا **شوق** نے **بہار عشق** میں اسطرح ادا کیا ہے

"ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا"

شوق نے اتنا پردہ تو رکھا ہے کہ لباس ہی کے نام پر اکتفا کیا ہے سینے وغیرہ کا نام نہیں لیا۔ مگر پردہ ایسا باریک ہے کہ اُس میں بدن جھلکتا نظر آتا ہے۔

تصریح کچھ بے شرمی و بے حیائی ہی کے موقع پر بدنما نہیں ہوتی۔ بلکہ قصہ میں اکثر مقام ایسے آجاتے ہیں کہ اگر وہاں رمز و کنایہ سے کام نہ لیا جائے تو کلام نہایت سبک اور کم وزن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بحث فی الواقع چوتھی دفعہ سے علاقہ رکھتی ہے جس میں مقتضائے حال کے

موافق ایرادِ کلام کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اسکو زیادہ اہم سمجھکر خصوصیت کے ساتھ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

ان آٹھ باتوں کے سوا قصہ نگاری کے اور بھی فرائض ہیں۔ مگر یہاں صرف انھیں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر ہمارے ہموطنوں کو شاعری کی اصلاح کا خیال ہوگا تو اُن کو کسی کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے خود اُن کی طبیعت اُن کی رہنمائی کرے گی۔

اب ہم خاص اُن مثنویوں پر جو ہمارے نزدیک کسی نہ کسی حیثیت سے امتیاز رکھتی ہیں ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ اب تک اُردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر سے گذری ہیں۔ اُن میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی ایسی ہے۔ جس میں شاعری کے فرائض کم و بیش ادا ہوئے ہیں۔ اول **میر تقی** جنھوں نے غالباً سب سے اول چند عشقیہ قصے اردو مثنوی میں بیان کئے ہیں۔ جس زمانہ میں **میر** نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اُسوقت اُردو زبان پر فارسیت بہت غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اردو زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور اگر ایک آدھ نمونہ موجود بھی ہو تو اُس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی۔ اسکے سوا اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی۔ مگر مثنوی کا رستہ صاف ہوتے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا اسی لئے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اُردو زبان متحمل نہیں ہو سکتی۔ اُس اندازہ سے جو آج کل فصیح اردو کا معیار ہے بلاشبہہ کسیقدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اُردو زبان کے بہت سے الفاظ و محاورات جو اب متروک ہو گئے ہیں میر کی مثنوی میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں میر کی غزل میں بھی کم و

بیش پائی جاتی ہیں۔ مگر غزل میں اُن کی کھپت ہوسکتی ہے۔ کیونکہ غزل میں اگر ایک شعر بھی صاف اور عمدہ نکل آئے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے۔ وہ عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے اور باقی پُر کُن اشعار سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ لیکن مثنوی میں جستہ جستہ اشعار کے صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ پس ان اسباب سے شاید میر کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں نہ بچے۔ مگر اس سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جس وقت میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں۔ اُس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنی امکان سے خارج تھی باایں‌ہمہ میر کی مثنوی اکثر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے۔ باوجودیکہ میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گذری ہے مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو اُنھوں نے کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور مطالب کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے جیساکہ ایک مشاق وماہر اُستاد کر سکتا ہے۔ اسکے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بمقابلہ اُن اشعار کے جن میں پُرانے محاورے یا فارسیت غالب ہی کچھ کم نہیں ہیں۔ صدہا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زباں زد چلے جاتے ہیں۔

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ نہ اُن میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا سماں بیان کیا گیا ہے۔ نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہے۔ مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہمنے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز

اور عام مثنویوں کے برخلاف سب بے شرمی و بے حیائی کی باتوں سے مبرا ہیں۔

میر تقی کے بعد میر حسن دہلوی کی مثنوی **بدرِ منیر** نے ہندوستان میں جو سچی شہرت اور قبولیت حاصل کی ہے وہ نہ اُس سے پہلے اور نہ اُسکے بعد آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ خیال کہ میر تقی کے نمونوں سے میر حسن کو کچھ مدد ملی ہو گی یا کچھ رہبری ہوئی ہوگی۔ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ قصے کی شان جو میر حسن کی مثنوی میں ہے میر تقی کی مثنویوں میں اُسکا کہیں پتا بھی نہیں۔

اگر اس بات سے قطع نظر کر لی جائے کہ قدیم قصوں کی طرح اس مثنوی کی بنیاد بھی دیو افسانوں پر رکھی گئی ہے تو یہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہے۔ کہ میر حسن نے قصہ نگاری کے تمام فرائض پورے پورے ادا کر دیئے ہیں۔ سلطنت کی شان و شوکت۔ تختگاہ کی رونق اور چہل پہل۔ لاولدی کی حالت میں یاس و ناامیدی اور دنیا سے دل برداشتگی۔ جوتشیوں کی گفتگو۔ شاہزادہ کی ولادت اور چھٹی کی تقریب۔ ناچ رنگ اور گانے بجانے کے ٹھاٹھ۔ باغوں اور ہر قسم کی محفلوں کے سمے۔ سواریوں کے جلوس۔ حلم میں نہانے کی کیفیت اور حالت مکانوں کی آرایش۔ شاہانہ لباس اور جواہرات اور زیورات کا بیان۔ خوابگاہ کا نقشہ۔ جوانی کی نیند کا عالم۔ رنج اور غم کے عالم میں محلوں اور باغوں کی بے رونقی۔ عاشق و معشوق کی پہلی ملاقات اور اُس میں شرم و حجاب کا پاس و لحاظ۔ عشق و محبت کا بیان۔ حُسن و جمال کا بیان۔ جدائی کا بیان۔ مصائب کا بیان۔ خوشی کا بیان۔ نسبت کے پیغام و سلام۔ بیاہ شادی کے سامان بچھڑے ہوؤں کا ملنا اور اُس حالت کا نقشہ۔ غرضکہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا ہے اُس کی

آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچدی ہے۔ اور مسلمانوں کے اخیر دَور میں سلاطین و اُمراء کے ہاں جو جو حالتیں ایسے موقعوں پر گذرتی تھیں اور جو معاملات پیش آتے تھے اُنکا بعینہ چربا اُتار دیا ہے۔ میر حسن کے بعد اَور مثنویوں میں بھی بدرِ منیر کی ریس سے یہ تمام سین دکھانے کا قصد کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر شعرا راہِ راست سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ایک صاحب بازار کی تعریف میں کہتے ہیں کہ " وہاں ناز و شوخی و انداز کی جنس بکتی ہے (یعنی کوئی جنس دستیاب نہیں ہوتی) ٹھنڈی سانسوں کا بازار گرم رہتا ہے (یعنی بازار میں بالکل رونق نہیں) داغِ دل کا سکہ ہر طرف بُھنایا جاتا ہے (یعنی سکۂ رائج کی ریزگاری نہیں ملتی) خارِ مژگاں کے کانٹے میں زرِ جان تُلتا ہے (یعنی نہ وہاں سونا ہے نہ سونا تولنے کا کانٹا) میوہ فروش سیبِ ذقن بیچتے ہیں (یعنی سیب نہیں ملتے) ترکاری کی جگہ جوبن بکتا ہے (یعنی ترکاری نہیں ملتی) حلوائیوں کی دوکان پر شیرۂ جان کی مٹھائی بنتی ہے (یعنی لڈو پیڑے اور بالوشاہی وغیرہ کا قحط ہے) بازار میں آبِ گوہر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے اور مہر و ماہ کا کٹورا بجتا ہے (یعنی بازار میں خاک اُڑتی ہے اور ہر وقت سناٹا رہتا ہے) اسیطرح جو سین دکھانا چاہا ہے اُسمیں محض الفاظ کا طلسم باندھا ہے۔ معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھا۔ بہر حال اُردو کی عشقیہ مثنویوں میں ہمارے نزدیک اکثر اعتبارات سے بدرِ منیر کے برابر آجتک کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ البتہ اُس میں کچھ الفاظ و محاورات ایسے ضرور ہیں جو کہ اب متروک ہو گئے ہیں۔ لیکن آج سے ستر اسی برس پہلے کی مثنوی کا حُسن لوازم یہی ہے کہ اُس میں ایسے الفاظ و محاورے موجود ہوں۔

میر حسن کے بعد نواب مرزا **شوق** لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ **شوق** نے غالباً واجد علی شاہ کے اخیر زمانۂ سلطنت میں یہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں سے تین[8] مثنویوں میں اُسنے اپنی بوالہوسی اور کامجوئی کی سرگذشت بیان کی ہے یا یوں کہو کہ اپنے اوپر افترا باندھا ہے۔ اور ایک مثنوی یعنی لذتِ عشق میں ایک قصہ بالکل بدر منیر کے قصے سے ملتا جلتا اُسی کی بحر میں لکھا ہے۔ ان مثنویوں میں اکثر مقامات اسقدر اَنْ مورَل اور خلاف تہذیب ہیں کہ ایک مدت سے ان تمام مثنویوں کا چھپنا حکماً بند کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک انکو بدر منیر پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ وہ قدیم الفاظ اور محاوروں سے جو اب متروک ہو گئے ہیں اور حشو اور بھرتی کے الفاظ سے بالکل پاک ہیں۔ اُن میں ایک قسم کا بیان۔ زبان کی گھلاوٹ روزمرہ کی صفائی۔ قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدر منیر کے بہت بڑھا ہوا ہے۔ اُن میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اسطرح برتا ہے کہ نثر میں بھی ایسی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔ اگرچہ ان مثنویوں میں بدر منیر کی طرح ہر موقع کا سین نہیں دکھایا گیا۔ جس سے شاعر کی قدرتِ بیان کا پورا پورا اندازہ ہو سکے مگر جو کچھ اُسنے بیان کیا ہے خواہ وہ مورل ہو اور خواہ اَنْ مورل۔ اُس میں حسن بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اُسنے برخلاف عام شعرائے لکھنؤ کے لفظی رعایتوں کا مطلق التزام نہیں کیا۔ اور اُردو کے عام روزمرہ کو صحتِ الفاظ پر جسکے اہل لکھنؤ سخت پابند ہیں

8 یعنی بہارِ عشق۔ زہرِ عشق اور فریب عشق میں ۱۲

اکثر ترجیح دی ہے۔ ردیف وقافیہ میں عروضیوں کی بے جا قیدوں کی بھی چنداں پابندی نہیں کی۔ مگر جو اصل مقصود ردیف وقافیہ سے ہوتا ہے۔ اُسکو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً

کوئی مرتا ہے کیوں؟ بلا جانے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس ردیف کو ہمارے شعرا ضرور غلط بتائیں گے۔ مگر ردیف کا جو اصل مقصد ہی وہ اس سے بخوبی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ سامع کو یہ شعر سُن کر واحد اور جمع کا فرق مطلق محسوس نہیں ہوتا اور یہی ردیف کا ماحصل ہے۔ اختلاط کے موقع پر جس بے تکلفی کے ساتھ معاملات کی تصویر اُسنے کھینچی ہے۔ اُس کی نسبت سوا اسکے اَور کیا کہا جائے کہ " چور کی ماں گھٹنوں میں سر دے اور روئے " افسوس ہے کہ شوق کی مثنویوں کی اس سے زیادہ اور کچھ داد نہیں دی جاسکتی کہ جو شاعری اُسنے ایسی اَن موزل مثنویوں کے لکھنے میں صرف کی ہے اگر وہ اسکو اچھی جگہ صرف کرتا اور روشنی کے فرشتے سے تاریکی کے فرشتے کا کام لیتا تو آج اُردو زبان میں اُسکی مثنویوں کا جواب نہ ہوتا۔

یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ نواب مرزا شوق کو اپنے اسکول کے برخلاف مثنوی میں ایسی صاف اور بامحاورہ زبان برتنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ کیونکہ جب سوسائٹی کا رُخ دوسری طرف پھرا ہوا ہوتا ہے تو اُسکے مخالف رُخ بدلنے کے لئے کسی خارجی تحریک کا ہونا ضروری ہے۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر دہلوی نے جو ایک مثنوی لکھی ہے۔ جسکا نام غالباً **خواب و خیال** رکھا تھا اور جسکی

شہرت ایک خاص وجہ سے زیادہ تر پورب میں ہوئی تھی۔ اُس مثنوی میں جیسا کہ ہم نے اپنے بعض احباب سے سُنا ہی۔ تقریباً ۴۰-۴۵ شعر اسی قسم کے ہیں جیسے کہ شوق نے **بہارِ عشق** میں اختلاط کے موقع پر اُنسے بہت زیادہ لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق کو ایسی صاف زبان برتنے کا خیال اُس مثنوی کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اور چونکہ وہ ایک شوخ طبع آدمی تھا۔ اور بیگمات کے محاورات پر بھی اُسکو زیادہ عبور تھا اُس نے اپنی مثنوی کی بنیاد خواب و خیال کے اُنھیں ۴۰-۴۵ شعروں پر رکھی۔ اور اُن معاملات کو جو خواجہ میر اثر کے ہاں ضمناً مختصر طور پر بیان ہوئے تھے۔ اپنی مثنوی میں زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کیا اور جس قسم کے محاروں کی اُنھوں نے بنیاد قائم کی تھی شوق نے اُسپر ایک عمارت چُن دی اسکا بڑا ثبوت یہ ہی کہ خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں جنمیں سے ایک دو شعر ہمکو بھی یاد ہیں۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب و خیال کو بہارِ عشق سے کچھ نسبت نہیں ہوسکتی۔

اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ اس کی نسبت یہ امید رکھنی کہ ہمارے دیرینہ سال شاعر جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ اس مضمون کی طرف التفات کرینگے یا اسکو قابلِ التفات سمجھیں گے محض بے جا ہے۔ اور یہ خیال کرنا بھی فضول ہی کہ جو کچھ اسمیں لکھا گیا ہے وہ سب واجب التسلیم ہے۔ البتہ ہمکو اپنے نوجوان ہموطنوں سے جو شاعری کا چسکا رکھتے ہیں اور زمانہ کے تیور پہچانتے ہیں یہ اُمید ہے کہ وہ شاید اس مضمون کو پڑھیں اور کم سے کم اسقدر تسلیم کریں کہ اُردو شاعری کی موجودہ حالت بلاشبہ اصلاح یا ترمیم

کی محتاج ہے۔ ہم نے اپنی ناچیز رائیں جو اس مضمون میں شاعری کی اصلاح کے متعلق ظاہر کی ہیں گو اُنمیں سے ایک رائے بھی تسلیم نہ کی جائے۔ لیکن اس مضمون سے ملک میں عموماً یہ خیال پھیل جائے کہ فی الواقع ہماری شاعری اصلاح طلب ہے تو ہم سمجھیں گے کہ ہمکو پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے۔

اگرچہ اُردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیئے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر صراحۃً نکتہ چینی کیجائے کیونکہ عمارت کا بودا پن جیسا بُنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہموطن ابھی اعتراض سُننے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ہوسکا ہے اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض اسطرح نہیں کیا گیا جو خاص اُسکے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو۔ بلکہ شاعری کے عام طریقہ پر اعتراض کر کے مثال کے طور پر جس کسی کا کلام یاد آیا ہے نقل کر دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس شخص پر بالتخصیص اعتراض کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ شاعری کے عام طریقہ کی خرابی ظاہر کرنی مقصود ہے۔ جسمیں اُس شخص کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔ اسکے علاوہ جہاں تک ممکن تھا کسی پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کیا۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ اپنی شاعری کے اصول مسلمہ سے ناواقف ہے۔ یا اُسنے کوئی گریمر یا عروض کی غلطی کی ہے۔ یا کوئی ایسی فروگذاشت کی ہے جس سے قدیم طریقہ کے موافق اُسکی شاعری پر حرف آتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ایسے اعتراض کیئے ہیں جو نہ صرف اُردو شاعری بلکہ تمام ایشیائی شاعری پر وارد ہوتے ہیں۔

باایں ہمہ اگر بمقتضائے بشریت کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو ہمارے کسی ہموطن کو ناگوار گزرے تو ہم نہایت عاجزی اور ادب سے معافی کے خواستگار ہیں۔ اور چونکہ یہ مضمون اُردو لٹریچر میں جہاں تک کہ ہمکو معلوم ہے بالکل نیا ہے اسلیئے ممکن ہے کہ اگر بالفرض اسمیں کچھ خوبیاں ہوں تو اُنکے ساتھ کچھ لغزشیں اور خطائیں بھی پائی جائیں۔ اگرچہ خدانے تو یہ قاعدہ بتایا ہے کہ "اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ" مگر انسان نے اُسکی جگہ یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ "اِنَّ السَّیِّئَاتِ یُذْهِبْنَ الْحَسَنَاتِ" پس اس انسانی قاعدہ کے موافق ہمکو یہ امید رکھنی تو نہیں چاہیئے کہ اس مضمون کی غلطیوں کے ساتھ اُسکی خوبیاں بھی (اگر کچھ ہوں) ظاہر کیجائیں گی۔ لیکن اگر صرف غلطیوں کے دکھانے ہی پر اکتفا کیا جائے اور خوبیوں کو بہ تکلف برائیوں کی صورت میں ظاہر نکیا جائے۔ تو بھی ہم اپنے تئیں نہایت خوش قسمت تصور کرینگے۔

§ یعنی نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ پس دوسرے فقرہ کے یہ معنی ہونگے کہ بدیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں ۱۲

راقم

الطاف حسین حالی

کتبہ ضعیف العباد فقیر محمد الدین عفا اللہ عنہ ورزقہ رزقاً طیبۃً دیانا کاملاً "جنڈیالوی"

دیوان حالی

جس میں قطعات۔ غزلیات۔ قصیدے۔ مرثیے
ترکیب بند۔ رباعیاں۔ تاریخیں۔ اور
اور متفرق اشعار شامل
ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نُما ہے   یہ ہی بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق (عاشق ہونا) یا تعشق (عاشق بننا ۱۲) کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا اول تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اُس جوش اور ولولہ سے ہوا ہی۔ جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور شعر کی ذات میں جو ایک آتشگیر مادّہ ہی وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہی۔ پھر قوم٭ کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اِسی خیال کی تائید کرتا تھا بائنہمہ حداثتِ سِن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہدِ رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیرزال کی صورت میں کیا جائے اور شراب ارغوانی کی جگہ سرکۂ بے نمک سے ضیافت طبع کی جائے۔ غرضکہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا۔ بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اُسپر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اُچھلا آنکھیں بند کیں اور اُسی شارع عام پر پڑ لئے جسپر رہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلہ کا ساتھ۔ راہ کی ہمواری۔ اور رہگذر کی فضا چھوڑ کر

٭ قوم سے یہاں اُس کے متعارف معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں قوم سے مراد شعرا ہیں ۱۲

دوسرا رستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا تو وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل و تشبیب کی اُمنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی۔ اور جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

" یقولون هل قبل الثلثین مَلْعَبٌ فقلتُ وهل بعد الثلثین مَلْعَبٌ "

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جس منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دلشکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔ اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے۔ کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔

یکرہ بحالِ خویش ہم آخر تواں گریست تا چند بر فلان و بہ بہمان گریستن

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند۔ مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی۔ اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ جو نظمیں کسیقدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی ہیں۔ اب زیادہ تر کچھ بچے کھچے متفرق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں۔ جنمیں سے کسیقدر قطعہ و رباعی کے لباس میں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کئے گئے ہیں ان کے سوا چند ترکیب بند۔ ایک آدھ مسمط۔ کچھ قصیدے اور کچھ تاریخیں ہیں جنمیں سے اکثر خاص خاص

8 یعنی لوگ کہتے ہیں کہ کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہے؟ سو میں نے اُنسے کہا کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟ ۱۲

طور پر وقتاً بعد وقتٍ شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں پہلا کلام جو عالمِ جہل و نادانی یا خلاصۂ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسیقدر تلف ہو جانے کے بعد جسقدر بچا ہے اب تک محفوظ ہی۔ انسان کی طبیعت کا مقتضےٰ ہی کہ جو کام اُسکی تھوڑی یا بہت کوشش سے سر انجام ہوتا ہے عام اِس سے کہ اچھّا ہو یا بُرا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو وہ اُسکو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے جس فخر کے ساتھ کہ وہ اعرابی[3] جسنے کبھی آب شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا ایک کھاری پانی کے چشمہ سے مشک بھر کر ہاروں رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لے گیا تھا۔ وہ اُس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کلمبس امریکا دریافت کر کے اِزبلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ پس یہ تمام مجموعہ جسمیں کچھ نئے اور کچھ پُرانے خیالات شامل ہیں محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھئے مردود ہو یا مقبول۔ مُلک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے۔ ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانہ کے خیالات میں پہلے زمانہ کی نسبت حقائق و واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے۔ اور جیسی کہ امید کیجاتی ہے اِن خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں ایسے سچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہمکو بھی معلوم نہیں۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولہ سے ہوتا ہی ویسا ہی

[3] یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہی یعنی ہاروں رشید کے زمانہ میں ایک بدوی جسنے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزا نہ چکھا تھا۔ اُس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا۔ جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے کچھ نسبت نہ رکھتا تھا۔ لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوی ہمیشہ پیا کرتا تھا۔ اُس سے کسیقدر میٹھا تھا۔ وہ خوشی خوشی اُس کی ایک مشک بھر کر بغداد میں پہنچا۔ اور خلیفہ کے دربار میں اُس کو بطور ایک عِلقِ نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اُس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا۔ مگر اُس کی بدمزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ اور اُس کو انعام دے کر رخصت کیا۔ اور حکم دیدیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا۔ ۱۲

بلکہ بعض اوقات اُس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش۔ تحسین وآفرین کے لالچ۔ جلب منفعت کی توقع۔ یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگرچہ ہم اُس وقت نہونگے۔ مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ اور پانی کو الگ کیئے بغیر نہ رہے گا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا۔ اور جھوٹ برسات کے سبزہ کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔

"وکم قد رأینا من فروعٍ کثیرةٍ تموتُ۔ اذا لم یحیہن اصولُ"

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیا اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے۔ مگر اسلوب بیان میں مُطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح۔ ہجا۔ غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید۔ مناجات۔ اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاصکر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہو کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر اُن کے طریقۂ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہو کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیئے اُسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے۔ اور اپنی وضع۔ صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کردے۔ اِسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی

8 ترجمہ۔ ہمنے وہ شاخیں اکثر سوکھتی دیکھی ہیں جن کی جڑیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شاخوں کو سرسبز رکھ سکیں ۱۲

سخت ضرورت ہو کہ طرز بیان میں قدما کی طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو اُنھیں پیرایوں میں ادا کرے۔ جنسے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔ اور قدما کا دل سے شکر گذار ہو جو اُسکے لئے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اِس مجموعہ کو اور نیز اُن نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھکر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی ایسے اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں۔ اور نہ طرز بیان ہی میں کوئی ایسی جدت ہو جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور یہ سمجھکر وہ بے اختیار پکار اُٹھیں کہ "ھٰذَا الَّذِی رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ" پس اُن کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا میں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو اُن کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے ہیں۔ اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں۔ یا کسی کے ذہن کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے۔ بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و ناشاعر کے دل میں ہمیشہ گذرتے ہیں اور ہر وقت اُن کے پیش نظر ہیں۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور متبذل ہیں اُنکو حقیر سمجھکر چھوڑ دیا گیا اور اُن کی طرف بہت کم التفات کیا گیا۔ اور پایۂ شاعری کو اُن سے وراء الورا

8 قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے ھذا الذی رزقنا من قبل (یعنے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزا اور لذت جُدا ہوگی ۱۲

سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقۃ شاعری کا بھید انھیں مبتذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بسبب غایتِ ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدمِ محض سے وجود میں لا سکے۔ اُسکی بڑی دَوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چونہ کا۔ یا بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے۔ اسیطرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مصالح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مصالح کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گذرتے ہیں۔ خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں۔ یا زمین۔ آسمان۔ چاند۔ سورج۔ پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے۔ یا مچھر۔ مکڑی اور بھنگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے۔ پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھکر چھوڑ دیا۔ اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی۔ اُسکی مثال اُس معمار کیسی ہوگی جو عمارت بنانے کے لئے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی۔

"ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست"

الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی۔ معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزولِ مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانہ کے حالات دیکھکر جو

کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سُننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی اُنکو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقہ کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورتِ وقت اقوالِ سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیئے گئے۔ کہیں اُن کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اُسکو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیئے گئے جو شائد کہیں کہیں مطائبہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں مگر انوری و سعدی و شفائی کے مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریا و مکر و سالوس و عُجب و خود پسندی اور اَور اسی قسم کے۔ اخلاق وعظ و زہد و صوفی و شیخ و مُلا پر ڈھالے گئے۔ نہ اسلیئے کہ نعوذ باللہ اس فرقۂ عَلیّہ کی مذمت مقصود تھی۔ بلکہ اسلیئے کہ ان اخلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تر کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبّا جیسا اُجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں۔ مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہی تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسیطرح ریا و عُجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ مگر جب اُسکو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈرا نی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعری کی علتِ غائی ہے۔

شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اُسکو بضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اسلیئے ہمکو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے۔ مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہی۔ اصلی ناصح خود بُرائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو اُن سے

بازرہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچکر دکھاتا ہے۔ اور گھر کے بھیدی کیطرح چھپے رُستموں کے پترے کھولتا ہے۔ اسلیئے سمجھنا چاہیئے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ۔ پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔ پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے۔

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم سبکو ساری　　**حالی** سے بدگمانی بیجا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہو سکے کہ اُسمیں فطرتِ انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جسکی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو وہ پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح نقشہ کھینچدیتا ہے کہ خود اُس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اسیطرح ایک دوسرا شاعر جسنے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقہ سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا وہ رُنود و اوباش کی صحبتوں کا ایسا چربا اُتار دیتا ہے کہ گویا اُنھیں میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ **ابونواس** نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع سُنکر جسمیں رات کے تخلیہ اور عیش و عشرت کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا۔ اُس مصرع کی تضمین میں ایسے واقعات بیان کر دیئے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہو کر بے ساختہ یہ کہہ اُٹھتا تھا "قَاتَلَكَ اللهُ[8] كَاَنَّكَ كُنْتَ ثَالِثَنَا" **شکسپیر** جسکے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنیوالے

8 ترجمہ۔ خدا تجھکو شرمائے گویا کہ تیسرا ہم میں تو تھا یعنی تو نے ایسے صحیح واقعات بیان کیئے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا۔

تھے اور جسنے کبھی آنکھ کھولکر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی اُسنے میکبتھ۔ جولیٹ۔ کیتھراین۔ ڈزڈیمونا۔ اور بعض اَور لیڈیوں کے ایسے اصلی کیرکٹر دکھائے ہیں جن کا اُس سوسائٹی پر جسمیں اُسکی عمر گذری تھی کبھی پرچھاواں تک نہ پڑا تھا۔ ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس۔ رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکانے کی لکھ جاتے ہیں جنسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود اُنپر گذرے تھے۔

اس عذر سے اگرچہ کسیقدر شاعر کی برارت ہوسکتی ہے۔ مگر پھر بھی اُسکو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے۔ بخلاف شاعر کے کہ اُسکا اصل مقصود فطرت انسانی کی کُرید۔ اور واقعاتِ دہر سے متاثر ہوکر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس۔ وہ کسی کے سمجھانے کے لیئے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھکر چیخ اُٹھتا ہے۔

ناصحِ مشفق ہیں یاروں کے نہ مُصلح اور مُشیر ۔۔۔ دردمند اُنکے نہ اُنکے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اِس چمن کا دیکھکر ۔۔۔ نالۂ بےاختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اُسکے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اُسکو واعظ یا ناصح قرار دیکر یہ الزام دینا نہیں چاہیئے کہ "اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ"۔ بلکہ اُسکی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیئے کہ "اَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ"

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقض پایا جانا ایک ضروری بات ہی بلکہ اُسکے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کما قال اللہ تعالیٰ "وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافاً کَثِیْراً"۔ مگر جسطرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا

اُس تصنیف کو عیب لگاتا ہے۔ اسطرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا بلکہ اُسکا بیساختہ پن ظاہر کرتا ہے جسکو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیئے۔ فلسفی یا مؤرخ ہر ایک چیز پر اُسکے تمام پہلو دیکھکر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے۔ اور اسلیئے ضرور ہے کہ اُسکا بیان جامع و مانع ہو لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہی۔ بلکہ اُسکا کام یہ ہے کہ ہر ایک شئے کا جو پہلو اُسکے سامنے آئے۔ اور اُس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہوکر اُسکے دل کو بے چین کردے اُسکو اُسیطرح بیان کرے پھر جب دوسرا پہلو دیکھکر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اُسکو اُس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تاکہ اُسکو حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے۔ بلکہ جسطرح ایک فوٹوگرافر ایک ہی عمارت کی کبھی رو کار کا۔ کبھی پچھیت کا۔ کبھی اس ضلع کا اور کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اُتارتا ہے۔ اسیطرح شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے۔ پس ممکن ہی کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت۔ اور ممکن ہی کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بُری چیز کی تعریف۔ کیونکہ خیر محض کے سوا ہر خیر میں شر کا پہلو۔ اور شر محض کے سوا ہر شر میں خیر کا پہلو موجود ہے۔ عقل۔ علم۔ زہد۔ دولت۔ عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں۔ مگر شعرا نے انکی جا بجا مذمت کی ہے۔ اسیطرح دیوانگی۔ نادانی۔ رندی۔ فقر۔ ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں۔ لیکن شعرا انکے اکثر مداح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اُس سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلہ میں اسلیئے کہ وہ اُستاد اور موجدِ فن تھے اپنے

تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے۔ اور کبھی اسلیئے کہ اسنے اُنکی دولت میں کسیقدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہی جو اُنکے پاس نہ تھی اپنے تئیں اُنپر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی اسلیئے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دار الغرور و دار المحن ہی۔ اور کبھی اُسکی بڑائی و عظمت اسلیئے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعۂ آخرت ہی وہ ایک ہی گورنمنٹ کی کبھی اُس کی خوبیوں کے سبب سے ستایش کرتا ہے اور کبھی اُس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت۔ مگر وہ کبھی اُن حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اُسکے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو گویا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہی۔ وہ ایک نادان بچہ کیطرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اُسکے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھکر لوگ متعجب ہوں۔ مگر جب تک شاعر کا سا دل اُن کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا اُن کے دماغ میں نہ ہو اُنکا تعجب رفع ہونا مشکل ہی۔

"بہ زیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر"

یہ چند اصول جو اوپر بیان کیئے گئے اُنسے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے۔ کیونکہ جسطرح فوّارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اُچھلتا ہے۔ اسیطرح نکتہ چینوں کی زبان۔ بند کرنے سے اور زیادہ کھلتی ہے۔ دوسرے نکتہ چینیوں سے کان اسقدر مانوس ہوگئے ہیں کہ جسطرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا۔ اسیطرح مصنف نکتہ چینوں کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ پس اُن کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورتِ وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچہ میں یہ چند باتیں جتادی جائیں

ظاہر ہے کہ سویلزیشن جسکو شعر و شاعری کا قاتل کہا جاتا ہے اُسکا پرچھاواں اس مُلک پر بھی پڑنے لگا ہے۔ شعر جسکو مدرسہ 8 میں لیجانے کی اجازت نہ تھی اُسکو روز بروز زیادہ تر مدرسہ ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پُتلے جوق جوق اور فوج فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوقِ معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شُعرا اُن کے نزدیک عقل و دانائی سے۔ اُنپر شعر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حُدی خواں کی آواز اثر کرتی ہے۔ غرضکہ شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسی علامتیں موجود ہیں جنسے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لئے گل ہونے والا ہے۔ نہ پُرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول بیان نہ کرنے ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی۔ اسی لئے مقدمہ میں مطلق شاعری پر کسیقدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اور چند باتیں جو خاص اس مجموعہ سے علاقہ رکھتی تھیں وہ اب دیباچہ میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگر غور کیجئے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار۔ سرے سے شعر کہنے ہی کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

"آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست"

مگر مدبر السموات والارض نے اس خرابہ آباد دُنیا کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے رہیں۔ دھوکے کو

8 یہ اشارہ ہے اُس مشہور مقولہ کی طرف کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" ۱۲

حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں۔ اور جس کوشش و جانفشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے کبود ے اور کمزور جالے کے پورنے میں سرگرم رہتی ہے اُسی کوشش و جانفشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور ناپائدار ہوائی عمارتیں چنتے رہیں یہاں تک کہ فنا ہو جائیں۔

"در کارخانہ کہ بنائش بہ غفلت ست — ہشیار زیستن نہ ز قانونِ حکمت ست"

"نَرُوحُ وَنَغْدُوْ لِحَاجَاتِنَا ⁸ — وَحَاجَةُ مَنْ عَاشَ لَا تَنْقَضِي
وَيَسْلُبُهُ الْمَوْتُ أَثْوَابَهُ — وَيَمْنَعُهُ الْمَوْتُ مَا يَشْتَهِي
تَمُوْتُ مَعَ الْمَرْءِ حَاجَاتُهُ — وَتَبْقَى لَهُ حَاجَةٌ مَا بَقِي"

8 ترجمہ ہم اپنے کاموں میں صبح شام سرگرم ہیں۔ اور جو شخص زندہ ہے اُسکا کام ختم نہیں ہو سکتا۔ موت ہی اُسکے کپڑے اُتار لیگی اور موت ہی اُس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اُس کے ساتھ ہی مریں گی جب تک وہ زندہ ہے کوئی نہ کوئی خواہش اُسکے ساتھ لگی ہوئی ہے ۱۲

قطعات

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط اک دانا نے کھینچکے یاروں سے یہ کہا
دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہو کوئی؟ جو بے ہاتھ لگائے دے یونہیں چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے ۔ جتنے خط تھے بڑے اٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا
جب نہ رہا وھاں پیش نظر خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھا اٹھا کر آنکھ جدھر تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہی یارو بات کہ تھی قوم میں باقی جان ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اب آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں اَخطل و اعشیٰ کے ہمتا
منشیوں میں ایسے تھے بہت جنپہ کہ نازاں تھی انشا
شعر میں تھے استاد اکثر سحر بیاں اور نکتہ سرا

لیگئی اُن کو آخر کار　　بحرِ فنا کی موج بہا
اہل ہنر کا نام و نشاں　　قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زید و عمر بنے　　صاحبِ دیواں نامِ خدا
اب چاہو۔ اُستاد گنو　　یا ہمیں سمجھو تم یکتا
ہم ہیں وہی ناچیز مگر　　کَبُرَ نَا مَوتُ الکُبرَا

شعر کی طرف خطاب

اے شعر دلفریب نہو تو تو غم نہیں　　پر تجھ پہ حیف ہی۔ جو نہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں　　تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
حُسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو　　آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہی بحرِ حقیقت کو موج خیز　　دھوکے کا غرق کر کے رہیگا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری　　قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز　　جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ　　معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو
چُپ چاپ اپنے سچ کئیے جا دلوں میں گھر　　اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو
جو نابلد ہیں اُن کو بتا چور بن کے راہ　　گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو

بلد واقف راہ اور نابلد ناواقف راہ ۱۲

عزت کا بھید مُلک کی خدمت میں ہی چھپا — محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعرِ راہِ رہت پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر۔ پہ بیقدریوں کے بعد — اسکے خلاف ہو تو سمجھ اُسکو شاذ تو
جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ — حالی کو تجھ پہ ناز ہے۔ کر اُسپہ ناز تو

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر۔ حیف — طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں — جو غزل لکھتے تھے۔ ہوتی تھی سراسر حالی
اب۔ کہ الفت ہی نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ — سر ہے سودا سے تہی۔ عشق سے دل ہی خالی
گر غزل لکھیے تو کیا۔ لکھیے غزل میں اکثر — نہ رہی چیز وہ مضمون سو جھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو۔ ہے وہ کہانی بے لطف — گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں — لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر — کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تا کہ بھڑکاتے جوانوں کے دل۔ آتش کیطرح — وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل — "قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی"

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں ‏ ‏ جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجے
کیجے تصنیف اور تالیف میں سعیِ بلیغ ‏ ‏ اسمیں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا ‏ ‏ اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں ‏ ‏ شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجے

بے تمیزی ابنائے زمان

ازرہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا ‏ ‏ ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ ‏ ‏ تیرے پلنے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونیکا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بنجائے تو کیا ‏ ‏ امتحاں کے وقت کھلجاتا ہے سب تیرا بھرم
سنکر اکڑ آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا ‏ ‏ گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز ‏ ‏ ہیں مبصر ایسے اس بازار ناپرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں ‏ ‏ تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑ رہتے ہیں ہم

ایک خود پسند امیرزادہ کی تضحیک

کہتے ہیں اک امیرزادہ کو ‏ ‏ تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیرزادوں میں ‏ ‏ لازمی ہیں۔ وہ اسمیں بھی سب تھیں
گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی ‏ ‏ اسپہ تھا خود پسند اور خود بیں

کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ — عِلم تیر و کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سُنتے سُنتے یاروں کی — ہوگیا تھا ہنر کا اپنے یقیں
الغرض ایک روز صحرا میں — جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
مشقِ تیر افگنی میں تھا مصروف — کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آکے دیکھا جو اک ظریف نے حال — وجہ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
تیر جتنے کمان سے چھوٹے — پائے سب بے اصول و بے آئیں
جاکے تُودے سے بھی نہ پڑتا تھا — تیر آماجگہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چُھٹ کے سوئے شمال — ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی — رکھکے بالائے طاق سب تمکیں
خاک تودے پہ جاکے ہو بیٹھا — لوگ کرتے رہے چناں و چنیں
ناوک انداز بولا چلّا کر — کوئی تجھکو جنوں ہوا ہے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے — یا کہ دو بھر ہے تجھکو جانِ حزیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا — جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زَد سے اِن بے پناہ تیروں کی — کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجھکو ہر پھر کے شش جہت میں حضور — امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

پولٹکل سپیچیں

اے بزمِ سفیرانِ دوَل کے سخن آرا — ہر خُرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہی
یہ سچ ہی کہ جادو ہی بیاں میں ترے لیکن — کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہی
ظاہر ہی نہ غصہ میں بیاں سے تری رنجش — نہ لطف میں کچھ طرز بیاں اُس سے جدا ہی
ہی دلمیں نہاں ایک شکایات کا طومار — اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہی
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سی شیریں — اور جنگ میں کچھ لطف سخن اُس سے سوا ہی
گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں مَفَر کے — اور سُنیئے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہی
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات — گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانیے کیا ہی
کُھلتا نہیں کچھ اسکے سوا تیری بیاں سے — اک مرغ ہی خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہی
تھے لب پئے اظہار پہ اب آ کے کُھلا یہ — انسان کو اخفا کے لیئے نطق ملا ہی

بدی کر کے نیکنامی کی توقع رکھنی

نامنصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم — برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیت
جب دورہ کو اُٹھتا تھا تو دیہات میں جاکر — تھا پوچھتا ایک ایک سے ازراہِ شرارت
ہیں پرگنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا — کرتے ہیں ہماری وہ ستایش کہ مذمت
تھی اُسکی مثال ایسی کہ اک شخص بدآواز — جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے — ہر بار لپکتا تھا بصد تیزیٔ و سُرعت
ہو۔ تا کہ یہ معلوم کہ ہی دور سے میری — آواز خوش آیند و یا قابلِ نفرت

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا "زینت و اسباب پہ جو لوگ اتراتے ہیں۔ اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے"
حالی نے کہا "جنکو ہے اترانے سے نفرت اترا کے وہ اسطرح نہیں ناک چڑھاتے"

سید احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں بعض کے نزدیک توحید اُسکی حدِ تام ہے
ہی مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول جو ہیں قائل اسکے اُنپر کفر کا الزام ہے
کیونکہ اِس سے ماننا پڑتا ہی اُس رحمت کو عام جس سے غیر از اہلِ قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ "شر سے تیرے سب ایمن رہیں بس مسلمانی و دیں داری اسیکا نام ہے"
پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عند الفحول کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اِسے وہ خام ہے
ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ اور سب کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے
بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہی لباس جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے
بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ حصر کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے
مذہب منصور ہے لیکن بیاں کرنا ضرور جو مسلّم آج کل نزدیک خاص و عام ہے
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

8 اقوال مختلفہ میں سے جو قول راجح ہو اُسکو مذہب منصور کہتے ہیں +

قرض لیکر حج کو جانے کی ضرورت

قریب موسمِ حج قرض لیکے اک دیندار — چلا بہ نیتِ حج گھر سے سوئے بیت اللہ

کہا یہ اُس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت — کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ

کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز — وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بحالِ تباہ

نہ نان و نفقۂ فرزند و زن سے خاطر جمع — نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ

سُنا یہ۔ اور بہت ترش ہو کے فرمایا — کہ روکتا ہے مسلماں کو حج سے اے گمراہ

وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے — نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی — پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے بر و بحر کی راہ

جنھیں فراغت و تنگی میں ہے اُسی سے اُمید — جنھیں سلامت و آفت میں ہے اُسی کی پناہ

وہ سُن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو — اُمیدِ لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ

ذلیل ہوتے ہیں جو بن بُلائے جاتے ہیں — طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت و جاہ

یہ سُن کے شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر کہ کہیں — ہو بحث میں نہ یہاں کوئی ہمراہ

بُلا کے پاس پھر آہستہ اُس سے فرمایا — ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ

قدم پہنچتے جہاں تک ہیں بخت کاروں کے — جوانِ عقل کی جہاں تک نہیں پہنچتی نگاہ

خدا کے حکم ہیں مبنی تمام حکمت پر — فتوح جن میں ہے دنیا و دیں کی خاطر خواہ

نماز و روزہ ہو۔ یا ہو طواف عمرہ و حج — حصول جیسے کہ ہوتا ہے اُنکا قرب الٰہ

اِسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام — نہ جن میں چاہیئے محنت نہ کوشش جانکاہ

مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے۔ ورنہ — ہزاروں پھرتے ہیں محتاج سادہ لوح تباہ

یہ کہنے سُننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار — وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا۔ حاصل ہے آزادی جنھیں — قدرداں اُنسے بہت بڑھکر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں — قدر آزادی کی جتنی ہمکو ہو اُتنی ہے کم

عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا — بینواکو ہے زیادہ قدر دینار و درم

تُعرَفُ الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم — دیکھا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

سُن کے ایک آزاد نے یہ لاف چُپکے سے کہا — ہی سقر۔ موری کے کیڑے کے لیئے باغِ ارم

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں "آزاد ہو جاتا ہی جب لیتا ہی سانس — یہاں غلام آکر۔ کرامت ہی یہ انگلستان کی

اُس کی سرحد میں غلاموں نے جوہیں رکھا قدم — اَور کٹ کر پانو سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی"

قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا — کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی

آن کر آزاد یہاں آزاد رہ سکتا نہیں — وہ رہے ہو کر غلام۔ اِسکی ہوا جنکو لگی

8 یعنی جسطرح موری کے کیڑے کو موری ہی میں آرام ملتا ہے اور وہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا اسیطرح جو قومیں ہمیشہ محکوم ہی چلی آئی ہیں وہ غلامی ہی میں خوش رہتی ہیں

سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ کس لئے سید سے صاف اے حضرتِ والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اُسکو ٹھیراتے ہیں آپ ثابت اسلام اُسکا۔ نزدیک آپ کے گویا نہیں
آپ بھی (نامِ خدا) ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں
خود نبوت پر سُنے ہیں ہمنے ایراد آپ کے اور اُلوہیت سے بھی دل۔ جمع حضرت کا نہیں
چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہی مشرب وسیع پھر یہ سید پر تبرّا آپ کو زیبا نہیں
سُن کے فرمایا" اگر ہو پوچھتے انصاف سے بات یہ ہی۔ سُن لو صاحب تم سے کچھ پردہ نہیں
رنج کچھ اسکا نہیں مجھکو کہ وہ ایسا ہے کیوں بلکہ ساری کوفت ہی اس کی کہ میں ویسا نہیں

قحط اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری جو تھا سو چشم پُر نم۔ اپنا تھا یا پرایا
"دُنیا سے اُٹھ گئے سب جو تھے مرید صادق" یہ کہکے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہمنے کہا۔ مریدی باقی رہی نہ پیری یہ کہکے ہم بھی روئے اور اُسکو بھی رُلایا

نوکروں پر سخت گیری کرنیکا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر درگذر بھی اور نہ ساتھ اُن کے عایت تھی کہیں

بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف — کام سے مُہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار — ذکر کیا۔ نکلے جو چھوٹے مُنہ سے اُسکے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اُس سے دوچار — نتھنے پھولے۔ مُونہ چڑھا۔ ماتھے پہ بل ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیئے کوئی فتوح — آنکے ہوجاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
رہتا تھا اِک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس — فرض جسمیں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار — زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجلئے انگبیں
حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں — تاکہ یہ درخواست۔ دیکھیں وجہی ہے یا نہیں
وھاں سوا تنخواہ کے۔ تھا جس کا آقا ذمہ دار — تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمہ تھیں
دیکھکر کاغذ کو ہوجاتے تھے نوکر لاجواب — تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں
ایک دن آقا تھا اک مُنہ زور گھوڑے پر سوار — تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں
دفعۃً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار — اور گرا اسوار صدرِ زیں سے بالائے زمیں
کی بہت کوشش۔ نہ چھوٹی پانو سے لیکن رکاب — کی نظر سائیس کی جانب۔ کہ ہو آکر معیں
تھا مگر سائیس ایسا سنگدل اور بے وفا — دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں
دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا — دیکھ لو سرکار اسمیں شرط یہ لکھی نہیں

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے — اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب

کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم — زباں جسکی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہے — نہیں جو رائے میں اپنی مُذَبذَب
وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی — کہ جسمیں وحدتیں مفقود ہوں سب
زباں اس کی نہ ہو مفہوم اُس کو — ہوں آدم تک جُدا سب کے جَد و اَب
جو واحد لاشریک اس کا خدا ہو — تو لاکھوں اُس کے ہوں معبود اور رَبّ

صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گذرا کہیں میلا کچیلا اک غُلام — اُسکے مَیلے پن پہ لوگوں نے ملامت اُسکو کی
عرض کی "ایک اک رُواں ہو جس بدن کا مِلکِ غیر — اختیار اُسکی صفائی کا نہیں رکھتے رہی"
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال — عذر مَیلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونکہ جسم آدمی ہے پیشِ اہلِ معرفت — کوئی چیز اُسکی نہیں سب ہے امانت گور کی

دلّی کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالی کے کہا از رہِ انصاف — "کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اُسکے سخن کو"
چند اہلِ زباں جن کو کہ دعوےٰ تھا سخن کا — بولے کہ "نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے — ہو چھو نہ گئی غیر زباں اُس کے دہن کو
معلوم ہے۔ حالی کا ہے جو مولد و منشا — اُردو سے بھلا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو

اُردو کے دھنی وہ ہیں جو دلّی کے ہیں روڑے | پنجاب کو مَس اُس سے۔ نہ پورب نہ دکن کو
بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے | کیا عالمِ گلشن کی خبر زاغ و زغن کو
حالی کی زباں گر بمثل نہرِ لبَن ہو | خالص نہو تو کیجیے کیا لے کے لبَن کو
ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ | پہنچے گا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو
مانا کہ ہے بے ساختہ پن اُسکے بیاں میں | کیا پھونکیئے اِس ساختہ بے ساختہ پن کو
یہ۔ دوست نے حالی کے سُنی جب کہ تعلّی | حق کہنے سے وہ رکھ نسکا باز دہن کو
کچھ شعر تھے یاد اُنکے پڑھے اور یہ پوچھا | کیوں صاحبو عزّت اِسی اُردو سے ہی فن کو
سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے | کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے | پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسم عرب | کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ اُسے گود سے لیکر ماں کی | گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جاکر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن | جو کہ اندھے ہیں ہیَ کے نہیں کچھ انکو خبر
لوگ بیٹی کے لیئے ڈھونڈھتے ہیں جب پیوند | سب سے اول اُنھیں ہوتا ہے یہ منظور نظر
ایسے گھر بیاہیئے بیٹی کو جو ہو آسودہ | اور مہ وِمہر سے جو ذات میں ہوا فضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانہ کے سارے زن و مرد | اُنکے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر

ایک ہی شہر میں ہوں دونو گھرانے آباد
دونو۔ نزدیک قرابت میں ہوں باہم اگر

بیٹے جی مر گئی بس اُن کی طرفسے گویا
جاکے پردیس ہیں بیٹی کو دیا بیاہ اگر

چھان بین اسکی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہے
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر

بدمزاجی ہو۔ جہالت ہو۔ کہ ہو بدچلنی
کچھ بُرائی نہیں۔ ذ تو نتا ہو داماد اگر

وہ یہی ناشدنی ریت ہی جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دیجاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر

ساتھ بیٹی کے مگراب پدر و مادر بھی
زندہ درگور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی

وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اُسکے ہاتھ کہیں نوکری لگی

اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اُسکی نہ تقدیر سے چلی

روزی کی خاطر اُسنے کیئے سیکڑوں جتن
پر کی کہیں نصیب نے اُس کے نہ یاوری

راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اِک خضر پے خجستہ نے کی آکے رہبری

جھک کر کہا یہ کان میں اُسکے کہ آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہیں تصانیف احمدی

جا۔ اور لفظ لفظ کو اُسکے چھیڑ کر
تردید اُسکی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی

پھر دیکھنا کہ رسں و چپ گرد و پیش سے لگتی ہے کیسی آکے زر و سیم کی جھڑی
دنیا طلب کو چاہیئے ابابہ فریب ہو دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہی الٰہی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا
جی میں ترے ہزاروں گذرتے ہیں وسوسے ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا
تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بُت پرست جس کا یقیں ہی تیرے یقیں سے کہیں سوا
وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر گو حاجت اُس کی اُنسے ہوئی ہے نہ ہو روا
آتا نہیں یقین میں اُس کے کبھی قصور اُمید اس کی روز فزوں ہی اور التجا
تو بندۂ غرض ہے۔ وہ راضی رضا پہ ہی وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندۂ خدا

استفادہ

لیجیئے بھیک دوڑ کر۔ گر ہے گداگری کا یہ جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے
ہی یہی اصل اکتساب۔ ہو جیئے سب سے مستفید زر ملے۔ یا سزا ملے۔ درس ملے۔ ادب ملے

لایق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول ایک حکیم کا ہی کہ وہ گر غور کیجیئے ہی حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر

اول تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو — اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب — سو سو طرح سے وہ اُسے کرتا ہی جلوہ گر
دشمن سے بڑھکے کوئی نہیں آدمی کا دوست — منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال — رکھتا ہی جو کہ دوست کے عیب اُس سے مستتر
گو قول ہی متین یہ جو تھی سخن کی تہ — افسوس ہی حکیم کی پہنچی نہ وھاں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید — عیب اُنکے دوست کیوں نہ جتائینگے بیخطر
اور جو کہ دوست سے نہیں سُن سکتے اپنے عیب — وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہونگے بہرہ ور
جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یھاں — موقوف عبرت[۵] اُنکی نہ دشمن نہ دوست پر

سخن سازی

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز — پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اُسکو
موجود سخنگو ہوں جہاں وھاں ہیں طبیب آپ — اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخنگو
دونو میں سے کوئی نہو تو آپ ہیں سب کچھ — پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں (مغلوب) — اپنے دعووں پہ بیاں کرکے دلیل و برہاں

۵ عبرت و اعتبار نصیحت حاصل کرنا ۱۲

کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی
درد ہیں تیرے۔ اسی واسطے سب بے درماں

ہی غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
جسکا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں

سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز
تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں

نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
یہ بھی ہے نیند کوئی۔ موت کا ہی جسپہ گماں

نہ جوانی میں تجھے صبر۔ نہ پیری میں شکیب
کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں

کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو
دیکھ۔ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہی کہاں

ہاتھ دھو لذتِ فانی سے۔ نہیں گر منظور
عیش باقی و حیات ابدی سے حرماں

نفس نے عقل سے کی عرض کہ ای خضرِ طریق
وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجئے جاں

پر نہیں حکم ترا کوئی۔ عمل کے قابل
گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہی بیاں

نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی امید
کوئی تسلیم کرے گا نہ اِسے جز ناداں

ہی یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا
سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جسپر قرباں

ایک اب بھوکے سے کہتا ہے کہ لے قابِ طعام
ایک مدعو اُسے کرتا ہے پس از سال رواں

کیونکہ امید پہ اک مائدۂ نعمت کی
سال بھر صبر کرے گرسنگی میں انساں

عقل نے سُن کے کہا خوف ہی تجھسے ای نفس
جُز بزہ تیرا تجھے دیکھیئے پہنچائے کہاں

حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں باطل سرسبز
کیجئے لاکھ بیاں اُسپہ دلیل و برہاں

جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر
زہر دانستہ کرے نوش۔ نہیں یہ امکاں

نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمۂ نقد
اسکے کھانے میں نہیں جاں کی خیر اے ناداں

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جائے
ہنسکے عادت نے کہا کیا عقل ہو مجھسے الگ؟ میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہے رائے "چاہیے گر رونقِ علمِ زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجیے رُکن جن پہ اُسکی سب رکانیں ہیں عیاں"
رائے صائب ہے بظاہر اور متیں گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ ہے بہت کم پر خلاف اِسکے گماں
سلطنت کا پر خدا حافظ ہے جب شاعروں کے ہاتھ ہو اُس کی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے شعر و انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
ایک پر اُن میں سے چل سکتا نہیں دوسرے کا جادوے حسنِ بیاں
ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

لوگ کسی کی خوبیاں سُن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اُسکے عیب سُن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنوں حالی اُسقدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گزار

لوگ جب عیب ہمارا کوئی سُن پاتے ہیں — گو کہ کرتے ہیں تاسف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو رنج اُن کو کمال — گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار
اور جو ہو گوش زد اُن کے کوئی خوبی اپنی — خوش تو پڑتی ہے بنانی اُنھیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم اُنکے — کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار
للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا — نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ طیار

شایستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال — انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اُسکی جب یہی دیکھی گئی روش — پوچھا کسی نے اُس سے کہ اِسکا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اسلیئے کی ہے یہ اختیار — چھُٹ جائے تا کہ مجھسے یہ لپکا سوال کا
پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک — آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار — منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا
امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت — گر چند روز اَور رہا اِن سے سابقہ
آیا جواب سُن کے یہ اُسکا بہت پسند — کی آفریں اور اُس سے مخاطب نے یوں کہا
نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ — حق میں ترے مفید ہیں یہ اُنسے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل — اہل وطن پہ اُن کی مگر جان ہی فدا
پھر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ — دل بھائیوں پہ بھی نہیں اُن کا پسیجتا

انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور
جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا

اہلِ غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ
شایستگی کا زہر ہے جب سے انھیں چڑھا

اسراف

ایک مُسرف نے یہ ممسک سے کہا
کب تک اے ناداں یہ حُبِّ مال وزر

تو - جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ
ہی سدا دنیا ہی میں رہنا مگر؟

ہنسکے ممسک نے کہا اے سادہ لوح
زر لٹانا رائگاں اور اسقدر؟

آج ہی گویا (نصیب دشمناں)
آپ کا دنیا سے ہے عزم سفر

پاس نیکنامی

اے نیکنام شکر کر اللہ کا ادا
جسنے بنایا نیک تجھے کرکے نیکنام

ہوتا اگر نہ پاس تجھے نامِ نیک کا
پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام

حاشا کہ تجھکو خوف خدا کا ہو اسقدر
جتنا کہ خوفِ طعنہ و تشنیعِ خاص و عام

غرور نیکنامی

گئی ہو حد سے گذر شیخ کی نکونامی
گمان بد کبھی اُس کی طرف نہیں جاتا

جو اُسکے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی
خود اُسکو عیب کا اپنے یقیں نہیں آتا

کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

دو ملازم۔ ایک کالا اور گورا دوسرا   دوسرا پیدل۔ مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں   کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت   کوکھ میں کالے کی اک مُکّا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلّی کو بہت مسکین کی   آکے گھوڑے سے لیا سائیس نے اُسکو اُتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی   چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جاکے دونوں پیش و پس   ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگذشت   تہ کو جا پہنچا سخن کی سُن کے قصہ ایکبار
دی سند گورے کو لکھ۔ تھی جسمیں تصدیقِ مرض   اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مُکّے سے مرے   کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے "تم کو مل نہیں سکتی سند   کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نجائے   آے بابا اُس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

خودستائی

اے دل بشر وہ کون ہے جو خودستا نہیں   پر۔خودستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا
جو زیورِ خرد سے مُعرّا ہیں سادہ لوح   کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا

جو اُن سے تیز ہوش ہیں۔ سو سو طرح سے وہ　　پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج　　کمبل تھا ایک گھر میں۔ سو سائل کو دیدیا
کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل　　سائل کی ڈب میں میں نے دیا مال جب دکھا
پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ　　اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وہ سخا
کچھ۔ اسلئے کہ ہم بھی انھیں میں سے ہوں شمار　　اہل وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ۔ اسلئے کہ اپنا ہو انصاف آشکار　　کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی　　ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی　　پر جانتے آدمی کو ہیں کہہ کے ہم برا
دھوکا ہنر کا دیکے چھپاتا ہے عیب یہ　　اور سونہ سے دُرد کہکے دکھاتا ہے وہ صفا
چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں　　یعنے کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اسپہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہ　　اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
قانع ہے وہ انھیں پہ۔ ہوئے وصف جو بیاں　　اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
کہتا ہے زید۔ عمرو ہے شدت سے سادہ لوح　　گنتا ہے سب کو نیک وہ۔ اچھا ہو یا برا
کہتا ہے عمرو۔ زید بھی گنتا ہے عیب ہیں　　بد ہو کہ نیک۔ اسکی زباں سے نہیں بچا
یہ اسکا اور وہ اسکا بیاں کرکے کوئی عیب　　ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا
غیبت۔ امید ہے کہ نہوتی جہان میں　　ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خود ستا
حالی جو تیرے کھول رہے ہیں جہان کے　　شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مدعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصہ جسکو دیکھیے۔ جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہی بیچارہ مبتلا

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہماری بس میں ہے
گر کبھی حملہ یہ اُسکے غالب آجاتے تھے ہم

پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اُسکے ٹھیراتے تھے ہم

جب کیا حملہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زور بازو پر ہمیشہ جسکے اتراتے تھے ہم

جس قوم میں افلاس ہو اُسمیں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اِس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مُسرف کی مذمت

لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت

اسراف بھی مذموم ہے۔ پر بخل سے کمتر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت

حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اِس کا
یاروں کے لئے ہے یہ بیاں موجبِ رقت

کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُسوقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت

وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر
پھر اُسمیں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت

اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر یہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹوں کو جیسے ہدایت

رُؤسائے عہد کی فیاضی

کی رئیسِ شہر کی تعریف یاروں نے بہت — برسبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا
بولے آج اُس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر — عاملانِ شہر مدعو اُسکے رہتے ہیں سدا
ضلع کے حکّام کا ادنےٰ اشارہ چاہیئے — پھر کوئی دیکھے سخاوت اُس کی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی بنیں — اُنمیں صرف اُس کی رقم ہے سب کے چندے سے سوا
پالکی یا وگنٹ ۔ ہے جو سواری اُسکے پاس — اہلکاروں کے لیئے ہے وقف بے چون و چرا
کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس — اُس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رو و ریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام — جوڑ کر ہاتھ ۔ اُنسے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اُس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں — سُنتے سُنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

ایمان کی تعریف

فقیہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف — تو دی چراغ سے اُسکو بہ آب و تاب مثال
کہا "فتیلہ" اقرار باللسان ہے ضرور — جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال
کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل[٭] — نہیں ضرور فتیلہ کا جسمیں استعمال

٭ یعنے کروسنو آئل جو بغیر بتی کے بھی جل سکتا ہے۔ گویا مجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے ۱۲

برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جنمیں ملاپ — دولت و بخت ہے ہر حال میں اُنکے ہمراہ
نہ اُنھیں حاجتِ اعواں۔ نہ تلاشِ انصار — نہ اُنھیں خوفِ بداندیش نہ بیمِ بدخواہ
پر نہیں ربطہ جس قوم میں اور یکجہتی — اُسکی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت وجاہ
نہ ملاذ اُنکے لیئے قلعہ نہ خندق نہ فصیل — نہ مفید اُنکے لیئے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک مُلا نے سُنا جب یہ سخن فرمایا — تکیہ اور اسقدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں — دستِ قدرت کے ہیں سب ہاتھ سفید اور سیاہ
وھاں نہ ملت کی ضرورت ہی۔ نہ کچھ پھوٹ کا ڈر — پڑگئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر — کردیں افرادِ پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہی اللہ کی عادت معلوم — اُسکو جب دیکھا ہے۔ دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

بُعدِ صوری مانعِ قربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیئے شہر میں اک گھر — جا اپنے محلہ سے کہیں دور بنایا
جب اہل محلہ سے چلا ہو کے وہ رخصت — دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا
ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس — اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
بلی کہ جو بے عقل ہے۔ دم دیتی ہے گھر پر — اتنی بھی محبت تمھیں گھر سے نہیں آیا؟

حالی نے کہا "اُنس ہی چیز اَور۔ وفا اَور
بلّی نے مزا اہل کا وفا کے نہیں پایا
اُس مہر و وفا کی نہیں بلّی پہ پڑی چھینٹ
کُتّے نے ہے جس کا کہ سبق ہمکو پڑھایا
ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی
گھر بھول گئے ہم تو نہیں تمکو بھلایا
گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر۔ گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

ناصح مخلص اور اہل غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفرِ صادق سے عرض کی
"محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھپہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور
فرمایا "ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرفِ نصیحت زبان پر
اور جنسے ہے امیدِ نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کرینگے تری حذر"

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدّام ماموں کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
"کوئی آقا جبکہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیش خدمت اُسکے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا"
پر۔ جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم
ہے دلیل اسکی کہ ہے خود خُلق آقا کا بُرا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جسنے اور تمکین کو
اُسنے گویا ڈھا دیا رکن رکین اخلاق کا

خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکل کا تیر چڑیا پر ہو گیا اتفاق سے جو خطا

ابن حمدوں ندیم تھا حاضر کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا

"جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہی خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا

جا نہ سکتی تھی بچکے تیر سے وہ تو نے دی قصداً اُسکی جان بچا"

ابن حمدوں نے کی یہ دانائی کہ خوشامد سے یوں اُسے تھپکا

دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا

جائے کنجشک ابن حمدوں پر تیر کا اپنے امتحاں کرتا

ابن حمدوں کی جان گو جاتی دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

رعیت پر نا اہل کو مسلط کرنا

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اسکے فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا

وہ خطۂ ملعوں تھا یہی جسکی بدولت تھا دل میں خدائی کا خیال اُسکے سمایا

میں بھی اسے اُس باغی طاغی کے علی الرغم اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا"

کہتے ہیں خصیب ایک غلام حبشی تھا جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا

کی سلطنتِ مصر کی باگ اُسکے حوالے نا اہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا

بارہی گئی تہ ایک برس نیل کی رَو میں یہ حادثہ آ اُسکو کسانوں نے سُنایا

فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اُون
ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اُٹھایا

ہارون نہ سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی
محکوم ہے جو میری رعایا و برایا

فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا
اپنے کو خدا جسنے ہے عالم کو بنایا

جو کھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی
اک سفلۂ ناکس کی بنا اُسکو رعایا

رشک

ظاہر امردوں کی طینت میں نہیں رشک اسقدر
ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں

ایک شہزادی۔ کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
تختِ شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں

سلطنت میں اُسکی۔ تھا مردوں کو کلی اختیار
عورتیں اصلا دخیل اُس کی حکومت میں نہ تھیں

مرد ہی تھے اُسکے محرم۔ مرد ہی اُسکے مشیر
تھا نہ عورت کا پتا دربار میں اُسکے کہیں

تخلیہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
ہنسکے فرمایا کہ "اے دولت کے ارکانِ رکیں

مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں
بلکہ ہے اُنس اسلیئے تم سے کہ تم عورت نہیں"

بات کی حُسنِ بیاں سے اُسنے دی صورت بدل
تاکہ کوئی سوءظن اُسپر نہ کر بیٹھے کہیں

ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اسلیئے نفرت۔ کہ ہے مردوں کی صورت دلنشیں

قانون

کہتے ہیں ہر فردِ انساں پہ ہے فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا

پر جو سچ پوچھو۔ نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا

اُس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا

پر اُسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا

حق میں کم زوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زور مندوں کی ہے لا

شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو
تختِ پدر پہ اُسکو ممنوع ہے بٹھانا

قانون ہے بنایا یہ اُن مقننوں نے
عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا

لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی
کہتے ہیں وہ عبث ہی قانون یہ بنانا

نزدیک اُنکے گویا بر زعم عقل و دانش
ہے کنگڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

حرص

اثنائے وعظ میں تھی تکیہ کلام واعظ
قدرِ قلیل ہے سب مال و منالِ دنیا

گویا کہ حرص اُنکی اس سے بجھی نہیں ہے
ہے جسقدر فراہم پاس اُنکے مالِ دنیا

اُمرا اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خرد مند
وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت

پر۔ اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت

بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبا بیمار کو کچھ اس سے سوا اُن کی ہے حاجت

عصمتِ بی بی از بے چادری

اے بینواؤ ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم اخلاق میں کچھ اُن کے اگر آگیا بگاڑ

تم زد سے نفس کی ہو جبھی تک بچے ہوئے ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے مفلسی کی آڑ

اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش گر تم کو ہوں نصیب تو دنیا کو دو اُجاڑ

سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے دیکھ لو جا کے خزانوں میں کُتب خانوں کے

سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

ٹھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا

افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ بازپرس اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آ آ کے جو لوگ تمہاری ہر دم اے اربابِ دولت

خوشامد پر نہ اُن کی بھولنا تم
وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہمنے بیاں کیں خصلتیں نیک
نہیں اِن میں سے تم میں ایک خصلت

تدبیر قیام سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
وھاں پانو جمانے کے لیئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اسکے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرفِ سبک بھول کے مونہ سے نہ نکالو
پر۔ رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اُسے۔اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو۔لیکن
جو بات سبک ہو اُسے مونہ سے نہ نکالو

مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر
مردوں کی حکومت میں ہی ملکوں کی بُری گت
لیکن بخلاف اسکے۔ ہے عورت کا جہاں راج
وھاں ملک ہی سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار
قبضہ میں ہی وھاں عورتوں کے دولت و مکنت
اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی
سمجھو کہ ہے اُس مُلک میں مردوں کی حکومت

مغرور کی پہچان

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو
تو سمجھو۔ کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار

جنھوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا　　　بُرائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

کام اچھا کرنا چاہیئے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے　　　اُسنے کی تاخیر اُسنے جسقدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں　　　بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

گدائے مُبرم

اک برہمن موتی کے سامنے باصد نیاز　　　مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں
آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا اُدھر　　　دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں
جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے　　　تاکہ پوچھے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں
موتی کے سامنے جب کرچکا وہ التجا　　　بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں
موتی کچھ تجھکو دے گی اور نہ دیکھتی ہو　　　ناحق اتنی التجائیں اُسکے آگے تو نے کیں
ہنسکے برہمن نے کہا "ہے مانگنا بندہ کا کام　　　دے نہ دے وہ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں
ہم نہیں دیتے ڈھئی تم جیسے ڈھیٹوں کی طرح　　　ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پانو پھیلاتے نہیں

مئے اعتدال

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو　　　ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کر

نہیں کام کا اُنکو اندازہ ہرگز ۔۔۔ جدھر ڈھل گئے۔ ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت ۔۔۔ تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اُٹھو نہ جبتک ۔۔۔ کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر ۔۔۔ تو فرصت ملے شاید اب تمکو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو ۔۔۔ کہ بس ٹھن رہے گئے عزم جنگِ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر ۔۔۔ تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو ۔۔۔ کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی ۔۔۔ رہیں پانو کے ہوش جسمیں نہ سر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو اَت گت ۔۔۔ غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے[۱]

طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمہ سے ہوتا ہی ہر بشر کو ملال ۔۔۔ کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے ۔۔۔ تو اور بھی اُسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہی کہ ہوتے نہیں طبیب ملول ۔۔۔ جو چل بسے کوئی اُنکے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ چھُپ جائیگی خطا ہم پر ۔۔۔ کیا ملال کا اپنے گر سجگہ اظہار

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

---

[۱] یعنی پیٹ بھر کے احمق۔ احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں گویا مخاطب کے سوا کسی پر اُسکی حماقت ظاہر کرنی نہیں چاہتے ۱۲

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی | پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اُس سے کار نمایاں کوئی اگر | کرتا ہے بار بار بیاں اُسکو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیئے | ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اک جدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اُسکو یاد | یاروں سے میں بیان ابھی کرچکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد پہ انساں کو چاہیئے | آخر بشر کا خاصہ ہے سہو اور خطا

فضول خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف | جہاں سے ہو کے گذرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش | سخی ہو ہمیں کہ مُمسک غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولتمند | کہ جسکا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اُس راہ سے گذر اُسکا | درم اک اُسنے بھی چاہا کہ کیجیے نذرِ فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت | کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر
پہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار | کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اَللے تللے رہے تو آپ کو بھی | ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہی یہی لینے کا خود بدولت سے | دکھائے دیکھیئے پھر اسکے بعد کیا تقدیر

اختلاف مذہب رفع نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اُٹھ جائے دلیل و بحث سے | جو چلا آتا ہی باہم اہل مذہب میں خلاف

ہو نہیں سکتا مطابق جبکہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیونکر ہزاروں اختلاف

انسان جو اشرف المخلوقات ہی سب سے زیادہ موردِ آفات ہی

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
دو ہیں اُنمیں سے نہایت جانگزا

ایک فکر اُس آنے والے وقت کی
شک نہیں ہی جسکے آنے میں ذرا

دوسرے چوٹیں زبانِ خلق کی
زخم جن کا زخم ہے تلوار کا

اور بھی حیوانِ ناطق کے لیئے
ہیں بہت سی زحمتیں اِنکے سوا

پر گدھے اور اَور حیوانات سب
رہتے ہیں دور۔ اِن گزندوں سے سدا

کیسا اِن آلام سے رہتا نچنت
اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

چنڈو بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈو کے وہ تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ اس کام کا آخر انجام؟

بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام

آنکھ میں اپنے پرائے کی ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام

جس سے عقبیٰ ہو درست ایسا نہ ہونا کوئی ہیچ
جس سے دنیا میں ہو نام ایسا نہ کرنا کوئی کام

ہم پہ آئینہ ہی جو حال ہے ہونا اپنا
نفسِ سرکش کے مگر ہاتھ میں ہی اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر
لے نہ اِس زہرِ ہلاہل کا کوئی بھول کے نام

یہ تو کہتے ہو کہ انجام برا ہے۔ لیکن
یہ بتاؤ کہ برا ہوتا ہے کیسا انجام؟
برے انجام کی تب ہوگی حقیقت روشن
برے انجام سے جب آکے پڑیگا خود کام
مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس اِن لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کسقدر
چاہتے ہیں۔ نفع پہنچے اپنے اہل ملک کو
گو کہ اُنکے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہ ر جس کے کبھی چاکو نہ لیں
اُسکا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یہاں سے لینی پڑتی ہیں اُنھیں
اُنکو لندن سے منگائیں بس چلے اِنکا اگر
الغرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا۔ قصہ مختصر
سُن کے حالی نے کہا۔ "ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہی ایک قوم اِس عیب ہیں آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبع بشر
مکھیاں جیسی نکلجاتے ہیں پاسِ قوم میں
اچھے اچھے راستباز اور حق پسند اور دادگر
ہاں بری اِس عیب سے لے دیکھے ہیں دنیا میں ہے
چشم بد دور تمت مرحوم اے جانِ پدر
اور قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ۔ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہو گا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو بھی
جسقدر ہے اِنسے اپنوں اور یگانوں کو خطر

غزلیات قدیم و جدید

چونکہ بہت سی ردیفیں قدیم غزلیات میں اور بہت سی جدید غزلیات میں نہیں تھیں۔ اسلیئے ہر ایک ردیف میں دونوں قسم کی غزلیں ملا جلا کر لکھدی گئی ہیں۔ اور تمیز کے لیئے ہر قدیم غزل کے شروع میں حاشیہ پر حرفِ ق لکھدیا گیا ہے تاکہ ناظرین اندازہ کرسکیں کہ قدیم و جدید غزل میں کیا فرق ہے

قبضہ ہو دلوں پر کیا اَور اِس سے سوا تیرا ۔۔۔ اک بندۂ نافرمان ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدّم ہے حق تیرا ادا کرنا ۔۔۔ بندے سے مگر ہوگا حق کیونکہ ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم ۔۔۔ کچھ کہہ نسکا جس پر یہاں بھید کھُلا تیرا

جچتا نہیں نظروں میں یہاں خلعتِ سلطانی ۔۔۔ کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

قطعہ

۱ عظمت تری مانے بن کچھ بَن نہیں آتی یہاں ۔۔۔ ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

۲ تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط اُن کو ۔۔۔ جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

۳ نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بیخود ۔۔۔ جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا

۴ سمجھا ہے پَرے تجھکو ادراک کی سرحد سے ۔۔۔ جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

۵ طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہی گو بڑھکر ۔۔۔ عصیاں میں ہی طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری ۔۔۔ گھر گھر لیئے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گذرتا ہے
کچھ رنگِ بیاں حالی ہے سب سے جُدا تیرا

---

۵ یہ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف "اَلَا اِنَّ لِلّٰہِ نَفَحَاتٍ فِی الدَّھرِ اَلَا فَتَعَرَّضُوا لَھَا" یعنی خدا کی خوشبوئیں زمانہ میں پھیلی ہوئی ہیں سر اُٹھا اُٹھا کر ان کو برابر سونگھے جاؤ

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا — باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ — ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا

کاوش میں ہے الٰہی دُگدا ہیں ہی طبیعی — جو حل ہوا نہو گا وہ ہے سوال تیرا

چھوٹے ہوئے ہیں گو جی۔ پر دل بندھے ہوئے ہیں — ملنے سے بھی سوا ہے چھُٹنا محال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یھاں ٹالتے رہے ہیں — لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی — پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا

اُنکی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی — آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

دل ہو کہ جان۔ تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے — دل ہی سو چیز تیری۔ جاں ہے سو مال تیرا

ہے پورِ زال سے دل اُس کا قوی زیادہ — رکھتی ہے آسرا یھاں جو پیر زال تیرا

ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی — یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سُن سُن کے سر دُھنینگے قال اہل حال تیرا

رہِ بُر میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اِس نشے میں خمار دیکھا

نہ جی رُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یھاں اُنھیں بھی امیدوار دیکھا

رُخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں

نہ بلبل و گل ہیں وھاں تعلق نہ سرو قمری میں پیار دیکھا

سوار محمل کی جستجو میں ہزاروں دشت طلب میں دوڑے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اُٹھتا غبار دیکھا

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھُلا بھی قسمت سے بھید تیرا
مِلا نہ کھوج اُس کا پھر کسیکو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا

لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پر خطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا

بچی ہوئے کاہشوں سے یھاں کی وُہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا

چمن میں بھُولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گل اُنکی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہے کیسا ہے۔ کون ہے۔ اَور تو کہاں ہی
پہ اپنے میں اَور تجھ میں ہمنے علاقہ اک استوار دیکھا

سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلماں
نہ اُنسے کچھ تیرا بیَر پایا نہ اِنسے کچھ تیرا پیار دیکھا

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیئے ہاتھ باندہ سب کے
جنھیں تھا یھاں اختیار سب کچھ اُنھیں بھی بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بیکار تجھکو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

(ق)

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا — چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا
مضموں ہی نقش دل میں لَدَینَا مَزِید کا — کونین سے بھریگا نہ دامن امید کا
قفل درِ مُراد سب اکبار کُھل گئے — چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا
دیکھا ہی ہمنے عالمِ رحمت کو غور سے — ہی شش جہت میں قحط دلِ نا اُمید کا
شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں — انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا
ہی نردبانِ جذبۂ توفیق درمیاں — یھاں امتیاز کیا ہی قریب و بعید کا
ہی آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ — خونِ جگر میں نشہ ہی جامِ نبید کا
تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے — یارب یہ روزہ دار ہی مشتاق عید کا
دوزخ ہے گرو سیع تو رحمت وسیع تر — لَاتَقْنَطُوا جواب ہی هَلْ مِنْ مَزِید کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لیگا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

نعت

یا ملکی الصفات یا بشری القوٰے — فیک دلیلٌ علیٰ انک خیر الورے
تجھسے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ بارانسے خاک — خَلْقُکَ خِصْبُ الزمان بعثک مُحیا الورے

قرآن شریف میں ہی "لَهُم مَا یَشَاؤُنَ فِیهَا وَلَدَینَا مَزِید" یعنی اہل جنت کے لیئے جنت میں جو کچھ وہ چاہینگے سب کچھ ہوگا اور (اسکے سوا) ہمارے پاس کچھ اور بھی ہے

دعوئے روشن ترا ثابت بے بیّنہ — صورت و سیرت تری صدق پہ تیرے گوا

قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور — اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

غیب سے بھیجا تجھے۔ ٹاپتا پھرتا تھا جب — دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما

اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کیوقت — جیسے کہ ہنگامِ قحط قبلہ سے اُٹھے گھٹا

شان رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں — گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جُدا

گلۂ بنی سعد کا جب کہ چُراتا تھا تو — گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا

دُور پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں — اُمّیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا

رہب و قسّیس و حبر رہ گئے دل تھام کر — دیکھکے تیرا قدم ہمقدمِ انبیا

خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شرّ و فساد — تو نے اُسیکو دیا ارضِ مقدّس بنا

تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب — جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحّم کیا

چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت — تو نے کیا دام دام قرض سب اُن کا ادا

تو نے کیا سرّ حق عارف و عامی پہ فاش — ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا

چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی — ایک کے چرکا لگا ایک کو گھائل کیا

حجتِ حق کر چکا دین ترا جب تمام — پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما

دَیر ہوئے بے چراغ اور صلَواتِ یہود — شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبَا

بجھ گئے آتشکدے بیٹھ گئے بتکدے — ہوگئی تثلیث نات اور ثنویت فنا

دَیر۔ راہبوں کا کلیسا۔ صلوات۔ یہودیوں کا کلیسا۔ ہبَا۔ غبار ناچیز ۱۲ مجوسی جو دو خدا ایک خالقِ خیر اور ایک خالقِ شر یعنی یزداں اور اہرمن کو مانتے ہیں اس عقیدے کو ثنویت کہتے ہیں ۱۲

اُٹھے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھانس　　مزبلہ پر چند روز پاتی ہے نشو و نما

غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام　　مل گئے اُٹھ اُٹھ کے سب خاک میں اصل ہوا

رہ گیا نامِ سجاح کذب میں ضرب المثل　　اسود و ابن کثیر خوار ہوئے برملا

سلسلہ انبیاء ختم نہ ہوتا اگر　　حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اُٹھا

آتے ہی چشمہ دیا تو نے کوئیں سے نکال　　جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا

بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ　　بھیج چکا تیرے ہاتھ ملتِ بیضا خدا

تجھ پہ صلوٰۃ و سلام ربِّ سمٰوات سے

روز و شب و صبح و شام قدر رمال و حصےٰ

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا　　جس گھر سے سر اُٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا

اَبرار تجھسے ترساں اَحرار تجھسے لرزاں　　جو زد پہ تیری آیا اُسکو گرا کے چھوڑا

رایوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے　　گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقوےٰ　　جو گنج تو نے تاکا اُسکو لٹا کے چھوڑا

جس رہگذر میں بیٹھا تو غول راہ بن کر　　صنعاں سے رہ رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا

فرہاد کوہکن کی لی تو نے جان شیریں　　اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوبؑ سے بشر کو دی تو نے ناصبوری　　یوسفؑ سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ دونو ہیں دلگداز تیرے　　پتھر کے دل تھے جن کے اُنکو رُلا کے چھوڑا

---

8 سجاح - ایک عورت مدعیہ نبوت کا نام ہے جسکا کذب عرب میں ضرب المثل ہے چنانچہ کہتے ہیں اکذب من سجاح اور اسود عنسی اور مسیلمہ جسکی کنیت ابن کثیر ہے۔ یہ دونو بھی مدعی نبوت تھے جو آخر کار قتل کیے گئے ۱۲

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی — عقل و خرد کا تو نے خاکا اُڑا کے چھوڑا
علم و ادب رہے ہیں دبتے ترے ہمیشہ — ہر معرکہ میں تو نے اُن کو رُلا کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش — شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اِک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اُسکے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

دیکھ اے اُمید کیجو ہم سے نہ تو کنارا — تیرا ہی رہ گیا ہے لے دیکے اک سہارا
یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے — اے آسماں کچھ اسمیں تیرا بھی ہے اشارا
میخانہ کی خرابی جی دیکھکر بھر آیا — مدت کے بعد کل وہاں جا نکلے تھے قضارا
اِک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے — اے زاہدو تمہارا اسمیں کیا اجارا
دنیا کے خرخشوں سے چیخ اُٹھتے تھے ہم اول — آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
توفیق نے ہمیشہ لی تنگت پر خبر یہاں — جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا
انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے — جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا — خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا
اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر — اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا
کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ — سب کچھ کہا انھوں نے پر ہمنے دم نہ مارا

حالی سے کام ہے یہاں فعلوں سے اُسکے کیا کام
اچھا ہے یا بُرا ہے پھر یار ہے ہمارا

رونا نہو گا حالی شاید یہ کم تمھارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہی نم تمھارا

الفت میں دمبدم کچھ لذت ہی بڑھتی جاتی
چھوڑیگا کھا کے شاید عاشق کو غم تمھارا

عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں اے وعظ
ہی مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمھارا

دلجو نہیں کوئی یہاں حیف اے صنم پرستو
دلکش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمھارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہوگا گر وزن کم تمھارا

دشتِ طلب کے رستو طے ہو گے کسطرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمھارا

دوبینو اُنکو بھی کچھ جم کے جانشینو
بس جامِ جم ہمارا اور مُلکِ جم تمھارا

روسی ہوں یا تتاری ہمکو ستائینگے کیا
دیکھا ہی ہمنے برسوں لطف و کرم تمھارا

کھولی ہیں تمنے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولینگے ہم تمھارا

ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیے سوارو
ہی لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمھارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گذرا ابھی ہی یہاں سے خیل و حشم تمھارا

پھرتے اِدھر اُدھر ہو کسکی تلاش میں تم
گم ہی تمہیں میں یارو باغِ ارم تمھارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تمکو حالی
کچھ کر کے بھی دکھائے زورِ قلم تمھارا

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خود مہرِ وطن سے ہی وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دِلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل — جس دن کہ یہ دونو نہوں وہ دن نہ دکھانا
دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں — چھل بل ہیں تم اس زال فسونگر کی نہ آنا
افسوس کہ غفلت میں کٹا عہد جوانی — تھا آب بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا
یاروں کو ہمیں دیکھکے عبرت نہیں ہوتی — اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سُنانا
دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن — وہ دن ہے کہ جسدن ہی اسے چھوڑ کے جانا
لی ہوش ہیں آنے کی جو ساقی سے اجازت — فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا

ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمو تمسے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

جہاں ہیں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا
ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی۔ نہ جاننا اُس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُسکو تصور اپنا نہ کیجئے گا
سُنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعوے
یہ۔ کہدو۔ دعوی بہت بڑا ہے پھر ایسا دعوی نہ کیجئے گا
اسی میں ہے خیر حضرت دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہمکو
کرے وہ یاد۔ اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجئے گا
کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو

زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اِس کی پروا نہ کیجئے گا
کمال ہے ضدِ بے کمالی۔ نہیں ملاپ انمیں حرف گیرو!
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجئے گا تو آپ بے جا نہ کیجئے گا
لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجئے گا
تمہارا اتحاد دوستدار حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو
سلوک اُس سے کیئے یہ تمنے تو ہمسے کیا کیا نہ کیجئے گا

ہو عزمِ دَیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا
آتا ہی دور ہی سے ہمکو نظر گھر اپنا
قیدِ خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم
وحشت رہیگی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا
پیرِ مغاں سے ہو کر تب سُرخرو ملینگے
فضل و ہنر کا ہوگا جب چاک محضر اپنا
بیگانہ وش ہی گر وہ تو ہی ہمارے ڈھب کا
ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا
عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی
گر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا
کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہی
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہی دفتر اپنا
غیروں کو لینگے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہی حالی کچھ دل مکدر اپنا

معنی کا تمنے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
اے بانگِ طبلِ شاہی دن ہو گیا جب آخر
خوابِ گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کسکو — اے عندلیبِ نالاں یہ تونے گل کھلایا
ویراں ہے باغ تسپر پھولی نہیں سماتی — مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سُنایا
اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا — گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا
ڈرتے رہینگے اب ہم بے جرم بھی سزا سے — احسان اُسکا جسنے ناحق ہمیں ستایا
واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم — کوئی جواب شافی پر اُس سے بن نہ آیا
آیا نہ تھا کبھی یہاں گو یا قدم خزاں کا — دو دن میں یوں پلٹ دی کسنے چمن کی کایا
تقلیدِ قوم ہی پر گر ہے مدارِ تحسیں — تو ہمنے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی جچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہمکو اُن کا نشاں نہ پایا

نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا — گرچہ اُترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا
حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی — وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی — چپکے چپکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا
طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا — وار اُن کا اسلیئے اکثر خطا کرتا رہا
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی — اُسکو۔ حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا
مونہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں — اُنسے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
تھا نہ استحقاقِ تحسیں پر سُنی تحسیں سدا — حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
شہرت اپنی جسقدر بڑھتی گئی آفاق میں — کبرِ نفس اُتنا ہی یہاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تونے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

کہیں الہام منوانا پڑے گا ۱ کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا
نہ صوفی صفا گو تجھ میں لیکن ۲ کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا
نصیحت بے اثر ہی گر نہ ہو درد یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا
جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا اُنھیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا
عوام الناس کا ہو گا جنھیں مونہ اُنھیں خاصوں پہ مونہ آنا پڑے گا
رہی وصفِ جناں کی مشق واعظ تمھیں بچوں کو پھسلانا پڑے گا
سخن میں پیروی کی گر سلف کی اُنھیں باتوں کو دُہرانا پڑے گا
تعلق کا ہے پھندا پیچ در پیچ قطعہ ۱ یہ عقدہ ہمکو سُلجھانا پڑے گا
بہت یہاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہمنے ۲ بس اب دُنیا کو ٹھکرانا پڑے گا
نہیں بو اُنس کی اس عمکدہ میں ۳ کہیں دل جاکے بہلانا پڑے گا
دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہی ۴ ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا
زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند ۵ وفا سے ہمکو پچتانا پڑے گا
جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید ۶ ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہی جبتک
اُسے دُنیا کا غم کھانا پڑے گا

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا — یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی — تمہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا
رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی — بس اب دل سے شکوؤں کو دھونا پڑیگا
بن آئے گی ہرگز نہ یھاں کچھ کیئے بن — جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

کبتک اے ابرِ کرم ترسائے گا — مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائیگا
پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں — جو لگائے گا تجھے پچتائے گا
دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام — آج اگر آیا نہیں کل آئے گا
ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد — اک یہ لپکا دیکھیے کب جائے گا
واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے ۱ قطعہ — پر مزا آنے کا یھاں کیا پائے گا
آئے گا اور ہمکو شرمائیگا مفت ۲ — اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم ۳ — ہم پہ مونہ آئے گا مونہ کی کھائے گا
دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف — رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا
باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل — جی قفس میں اسکا کیا گھبرائے گا
رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا ۱ قطعہ — شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا
ابر و برق آئے ہیں دونو ساتھ ساتھ ۲ — دیکھیے برسے گا یا برسائے گا

مشکلوں کی جسکو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

وھاں اگر جائیں تو لیکر جائیں کیا
ہو نہ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں ہے باقی وہی حرصِ گناہ
پھر کئے سے اپنے ہم پچتائیں کیا

آؤ لیں اُسکو ہمیں جا کر منا
اُس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے اُنس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھئے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعوے کرے
اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزلخوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل۔ ناصح!
اُس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مُٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو — تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا
عشق اُس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا — گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا
لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اُس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا
بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دُنیا — ہمسے اَب جانکے دھوکا نہیں کھایا جاتا
کرتے کیا پیتے اگر مے نہ عشاء سے تا صبح — وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا
دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق — کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا
اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا — بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لیکے ہٹایا جاتا

راحت کا جہاں میں یونہیں اک نام ہے گویا — راحت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا
کچھ کرتے ہیں جو یہاں وہی انگشت نما ہیں — بدنام ہی دُنیا میں نکو نام ہے گویا
ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام — جو کام ہیں۔ اُن کا یہی انعام ہے گویا
ہے وقتِ رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں — آخر ہوئی رات اور ابھی یہاں شام ہے گویا
اُٹھا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بُری طرح — آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا
ادبار بھی دیکھوگے جہاں پاؤگے اسلام — اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا
جب دیکھئے حالی کو پڑا پایئے بیکار — کرنا اُسے باقی یہی اک کام ہے گویا

خلوت میں تری صوفی گر نورِ صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کمانداری
ہم بچکے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھکو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سُنا قاصد
اَن پڑھ تو ہے تو یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا

باتوں میں شکایت کی بو آتی ہی الفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا

ہم روزِ وداع اُس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہمکو روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحبِ دل ہوتے سُن کر مری بیتابی
تمکو بھی قلق ہوتا اور مجھسے سوا ہوتا

جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھکو خبر ناصح
کچھ ہمسے سُنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے درگذرے وہ چاہی سو کر گذرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانیئے کیا ہوتا

کُل حالیِ دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سُننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سُنا ہوتا

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حُسن میزبان کوئی میہماں نہ تھا

ہمکو بہار میں بھی سرِ گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

ملتے ہی اُنکے بھُول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائیگا جی ایک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیمِ جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہی
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

کچھ میری بیخودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات اُنکو بات بات پہ سو سو دیئے جواب　مجکو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یہاں　طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی　مانا کہ اُسکے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار

شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

(ق)

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　وقت پہنچا مری رُسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا　کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا　کس کو دعوٰی ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم　شوق تھا بادیہ پیمائی کا

اُس سے نادان ہی بن کر ملئے　کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ　حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

درمیاں پائے نظر ہے جبتک　ہمکو دعوٰے نہیں بینائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی　ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اُسکو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل　مجکو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا　پوچھنا کیا تری زیبائی کا

یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں؟　گل و بلبل کی شناسائی کا

مدد اے جاذبہ توفیق کہ یہاں　ہو چکا کام توانائی کا

محتسب عذر بہت ہیں لیکن — اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

ق

اغماض پہ چلتے وقت مُروت سے دور تھا — رو رو کے ہمکو اور رُلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ور نہ یہاں — ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز — چرچا ہمارے عشق کا نزدیک دور تھا

جانی نہ قدر رحمتِ حق پارسا نے کچھ — ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا

دُردی کشانِ بزمِ مُغاں کا نہ پوچھ حال — ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا

اب باریابِ انجمن عام بھی نہیں — وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا — کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر — بہرِ نماز نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اُسی کا کہ اتنا صبور تھا

ق

دل سے خیالِ دوست بُھلایا نہ جائیگا — سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائیگا

تمکو ہزار شرم سہی مجکو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست — زنہار بارِ عشق اُٹھایا نہ جائیگا

دیکھی ہیں ایسی اُن کی بہت مہربانیاں — اب ہم سے مُونہ میں موت کے جایا نہ جائیگا

مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ — ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی۔ مگر — دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے — پوچھینگے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں کہ ہمکو منایا نہ جائے گا
ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر — کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اسقدر — یعنی وہ ڈھونڈھتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصّہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

(ق)

قلق اور دل میں سوا ہو گیا — دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑیگا مجھے زخمِ دل — اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور — مرا شکر اُس کا گلا ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا — وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
ہوا اُرکتے رُکتے دمِ آخر فنا — مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
نہیں بھولتا اُسکی رخصت کا وقت — وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد — ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
سمجھتے تھے جس غم کو ہم جانگزا — وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا
نہ دے میری اُمید مجکو جواب — رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

(ق)
سنگِ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا — اب دیکھنا ہے زور دلِ بے قرار کا
اِک خو سی ہو گئی ہے تحمّل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل — کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو — ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا
سمجھو مجھے اگر تمہیں ہے آدمی کی قدر — میرا اِک التفات نہ مرنا ہزار کا
گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال — سُن لینگے وہ مآل شبِ انتظار کا
اب محوِ بوئے گل یہ ہوا کب دلِ حزیں — ہمکو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
ہر سمت گردِ ناقۂ لیلےٰ بلند ہے — پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا
غربت کے مشغلوں نے وطن کو بُھلا دیا — خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا

حالی بس اب یقیں ہی کہ دِلّی کے ہو رہے
ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

ب

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب — کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
چشمۂ زندگی ہے ذِکرِ جمیل — خضر و آبِ بقا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر — ظلِّ بالِ ہما سے کیا مطلب

جو کرینگے بھرینگے خود۔ واعظ　　تم کو میری خطا سے کیا مطلب
جنکے معبود حور و غلماں ہیں　　اُنکو زاہد خدا سے کیا مطلب
کام ہے مردمی سے انساں کی ۱　　قطعہ زُھد یا اتقا سے کیا مطلب
ہے اگر رند دامن آلودہ ۲　　ہمکو چون و چرا سے کیا مطلب
صوفیِ شہر باصفا ہے اگر ۳　　ہو۔ ہماری بلا سے کیا مطلب

نکہتِ مے پہ غش ہیں جو حالی
اُنکو دُرد و صفا سے کیا مطلب

ق
مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب　　چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی مونہ میں زباں ہے اب
وہ دن گئے کہ حوصلہ ضبطِ راز تھا　　چہرے پہ اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
جس دل کو قیدِ ہستیِ دنیا سے ننگ تھا　　وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب
آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا　　کہتے ہیں لوگ جان کا اسمیں زیاں ہے اب
لغزش نہو۔ بلا ہے حسینوں کا التفات　　اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا　　ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مُغاں ہے اب
ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ھنوز　　ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب
ہے دل غمِ جہاں سے سبکدوش ان دنوں　　سر پڑ تا سو جھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

پ

یہ ہیں واعظ ۔ سب پہ مُونہ آتے ہیں آپ — ناصحِ قوم اسپہ کہلاتے ہیں آپ

بس بہت طعن و مُلامت کرچکے — کیوں زباں رندوں کی کھُلواتے ہیں آپ

ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو — چڑھکے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ

واعظو ہے اُن کو شرمانا گناہ — جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں ایک اک کی تکفیر آپ کیوں؟ ١ — اِسپہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور ٢ — خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ

چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد سے — بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

ت

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت — پر جوانی ہمکو یاد آئی بہت

زیرِ برقع تو نے کیا دکھلا دیا — جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

ہٹ پہ اُسکی اَور پس جاتے ہیں دل — راس ہے کچھ اُس کو خودرائی بہت

سرو یا گل آنکھ میں بچتے نہیں — دل پہ ہے نقش اُسکی رعنائی بہت

چُور تھا زخموں میں اور کہتا تھا جی — راحت اِس تکلیف میں پائی بہت

آرہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا — دوست یہاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے — مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

جاں نثاری پر وہ بول اُٹھے مری
ہیں فدائی کم تماشائی بہت

ہمنے ہر ادنےٰ کو اعلےٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی؟
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت؟

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راستگوئی میں ہے رسوائی بہت

اُسکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخ مصور سے کھچے یا نہ کھچے
صورت۔ اور آپ سے بےعیب بشر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تمنے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اُسنے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے۔ تسلیم سپر کی صورت

شوق میں اُسکے مزا۔ درد میں اُسکے لذت
ناصحو اُس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہی ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی ہے بہت آج بھنور کی صورت

اُنکو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

بنلاتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
پہ چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت

جسے دیکھکر دل ہو عاشق کا بے کل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شبِ وعدہ ہی بارِ عام اُنکے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غمِ دل نے رسوا کیا ہمکو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہی اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخ فانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جسکو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھکر کرو قتل حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

ٹ

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ
دل کو یہ کیسی لگادی تونے چاٹ

رَچ رہی ہے کان میں یہاں لَے وہی
اور مُغنّی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہ گئی
راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دَیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یہاں جی کچھ اے زاہد اُچاٹ

جو کہے تجھ کو بنا دیں اے امیر ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ

ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

تیغ میں برّش یہ اے حالی نہیں جسقدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون

شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

ث

باپ کا ہے جبھی پسر وارث ہو ہنر کا بھی اُسکے گر وارث

گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا تیرا ہے کون اے ہنر وارث

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی لیگئے ڈھو کے سیم و زر وارث

ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ کریں میراث سے حذر وارث

خاک و کرمانِ گور و خویش و تبار ایک میت اور اسقدر وارث

واعظو دین کا خدا حافظ انبیا کے ہو تم اگر وارث

قوم بے پر ہے دین بے کس ہی گئے اسلام کے کدھر وارث

ہم یہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف جیسے مردہ کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی

کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث — دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث

جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی — رات بھر یاروں کو جگوایا عبث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز — سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

کوئی پنچھی آکے اب پھنستا نہیں — آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم — تو نے زاہد ہمکو شرمایا عبث

کھیتیاں جلکر ہوئیں یاروں کی خاک — ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

قوم کا حالی پنپنا ہے محال — تم نے رو رو سب کو رُلوایا عبث

ج

بات کچھ ہمسے بن نہ آئی آج — بول کر ہمنے مونہ کی کھائی آج

چُپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ — بات بگڑی بنی بنائی آج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی — پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

بزم ساقی نے دی الٹ ساری — خوب بھر بھر کے خُم لنڈھائی آج

معصیت پر ہے دیر سے یارب — قطعہ ۱ نفس اور شرع میں لڑائی آج

غالب آتا ہے نفسِ دوں یا شرع — ۲ دیکھنی ہے تری خدائی آج

چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو — نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاربار ہیں سب بند — کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

زد سے الفت کی بچکے چلنا تھا
مُفت حالی نے چوٹ کھائی آج

تلخیِ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج　　یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج
رنج و شادی یہاں کے ہیں سب بے ثبات　　اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج
تھا قناعت میں نہاں گنجِ فراغ　　پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج
فکر وسن بڑھتے تھے شاید ساتھ ساتھ　　ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج
ہمکو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا　　جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج
آگئی مرگِ طبیعی ہمکو یاد　　شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج
راہ اب سیدھی ہے حالی سوئے دوست　　ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

چ

بزمِ مے اچھی ہے۔ گو دُنیا ہے اے میخوارہیچ
یہاں سمجھ لیتے تو ہیں دُنیا کو دم بھر یار ہیچ

نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل ہوش
ایک دشمن بر سرِ کیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ

شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دُکاں اور رونقِ بازار ہیچ

شاہدِ معنی کو آرایش کی کچھ حاجت نہیں
سبحہ و سجادہ ہیچ اور جُبّہ و دستار ہیچ

ہو گر بجتے جسقدر اُتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو ہے یہ سب گفتارِ بے کردار ہیچ

روئی تو آٹھ آٹھ آنسو اور یہ جادل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب اے چشمِ گوہر بار ہیچ

خوانِ نعمت نے ترے اے عاملِ مُردار خوار
کر دیئے آفاق کے سب خوان و خواں سالار ہیچ

بے ادب مسند پہ۔ جو کچھ ہے رئیسِ شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

ح

کاٹئے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

منزلِ دُنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح

سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی اُنھیں ہو یا نہ ہو
ہیں اُسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

اُنکے غُصّے میں ہے دلسوزی۔ ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے اُنکو۔ گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتّیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وا

دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح
کیجے کیا حالیؔ۔ نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

خ

مےِ مغاں کا ہے چسکا اگر بُرا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اَور دے لگا اے شیخ

ریا کو صدق سے ہی جامِ مے بدل دیتا
تمہیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ

وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہمنے بارہا اے شیخ

غُرورِ فقر و غرُورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجُھے پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ

زباں پہ ہوتی ہی مُہر انکی جو ہیں محرمِ راز
پھر ایسا کیجیو ہرگز نہ ادّعا اے شیخ

قطعہ ۱ خبر بھی ہے تمہیں ہ کیا بن رہی ہی بیڑے پر
ہیں آپ جو لئے بیڑے کے ناخدا اے شیخ

۲ وہ ڈوبتوں سے الگ ہٹتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا یہی گر ہے۔ مرحبا اے شیخ

۳ گو زن و گور ہیں بچپن سے تارکِ دنیا
نہایت آپ کی ہے۔ اُنکی ابتدا اے شیخ

کمال حسنِ عقیدت سے آیا تھا حالیؔ
پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

د

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہی اَور ذوق گنہ یھاں سزا کے بعد

گر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اِس شفا کے بعد

یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اُسکی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سُن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اِس صدا کے بعد

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد
تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد

درگذر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے
تو ترا اور کوئی ہوگا خدا اے زاہد

ہم دکھا دینگے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

قربِ حق کے لیئے کچھ سوزِ نہاں بھی ہے ضرور
خشک نفلوں میں دھرا کیا ہی بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے
تو ہی کہہ ہمیں ہے کیا میری خطا اے زاہد

جال جبتک ہی یہ پھیلا ہوا دینداری کا
فکرِ دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج کیئے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اب اسکے سوا اے زاہد

ذ

پیاس تیری بوی ساغر سے لذیذ
بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ

جسکا تو قاتل ہو پھر اُسکے لیئے
کونسی نعمت ہی خنجر سے لذیذ

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب ہمکو ہے سب شہد و شکّر سے لذیذ
قند سے شیریں تری پہلی نگاہ دوسری قندِ مکرّر سے لذیذ
بھا نجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو بھوک ہے وہ شیرِ مادر سے لذیذ
ہی یہ تجھمیں کس کی بوباس اے صبا بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ
جو قناعت کے ہیں حالی میہماں اُنکو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

ر

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر وہی اصرار ہے خطاؤں پر
رہیں نا آشنا زمانہ سے حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر
رہرو و باخبر رہو کہ گماں رہزنی کا ہے رہنماؤں پر
ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہی کیا مرتے ہیں ہم انھیں اداؤں پر
اُسکے کوچہ میں ہیں وہ بے پر و بال اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر
شہسواروں پہ بند ہے جو راہ وقف ہی یھاں برہنہ پاؤں پر
نہیں مُنعم کو اُسکی بوند نصیب مینہ برستا ہے جو گداؤں پر
نہیں محدود بخششیں تیری زاھدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجے کس مُونہ سے اِن خطاؤں پر

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار   عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اسکے ہیں نہ اُسکے آشنا   گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر
خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم   گو دکھاتے آپ کو ہیں شیرِ نر
اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں   کرتے ہیں نفرت بدی سے جسقدر
کرنی پڑتی ہے کسیکی مدح جب   کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسیکا عیب سُن پاتے ہیں ہم   کرتے ہیں رسوا اُسے دل کھول کر
کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی   شکر کے ہیں اُس سے خواہاں عمر بھر
ایک رنجش میں بُھلا دیتے ہیں سب   ہوں کسی کے ہمپہ لاکھ احساں اگر
عیب کچھ گنتے نہیں اُس عیب کو   جس سے ہوں اپنے سوا سب بیخبر
خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں   کھینچکر لاتے ہیں اُسکو سوئے شر
بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو   عیب اُن کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اک عالم کے پرمطلب کے دوست   ایسے یاروں سے حذر یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہشِ تحسیں ہے حضرت کو مگر

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیئے بغیر   دام اُٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیئے بغیر
گو ہو شفا سے یاس۔ پہ جبتک ہے دم میں دم   بن آئے گی نہ درد کا درماں کیئے بغیر
بگڑی ہوئی بہت ہی کچھ اِس باغ کی ہوا   یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیئے بغیر

آمادہ دہر۔ پردہ دری پر ہے قوم کی
مبروص کو رہے گا نہ عریاں کیئے بغیر

عزت سے اپنی یارونکو کچھ آپڑی ہے ضد
چھوڑینگے نیمجاں کو نہ بے جاں کیئے بغیر

مشکل بہت ہی گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیئے بغیر

گو مے ہے تند و تلخ۔ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیئے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت اُنھیں نہ مسلماں کیئے بغیر

حالی کٹیگا کاٹنے ہی سے یہ بیتوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیئے بغیر

ڑ

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہوگئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آجتک قصرِ امل ہے ناتمام
بنا چکی ہی بارہا کھُل کھُل کے پاڑ

ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھیلنا آتا ہے ہمکو بھی شکار
پر نہیں زاھد کوئی ٹٹّی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ہیں کِسکام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ

عید اور نوروز ہے سب دل کے سات
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اُجاڑ

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کِشت ہے سرسبز اور نیچی ہی باڑ

بات واعظ کی کوئی بگڑی گئی
ان دنوں کمتر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھولکر ناحق زباں
کرلیا ساری خدائی سے بگاڑ

ز

(ق)
عہدِ وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز	عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
پیغامِ دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز	جھوکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں	ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز
آیا نہ ہوگا اُسکو تغافل میں کچھ مزا	ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا	اُسنے نقاب رُخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز
یھاں دیکھی جواب امیدِ جوابِ خط	وھاں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز
پایا ہے ذوق و شوق میں ہمکو بھرا ہوا	کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز
کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد	بھولے ہمیں کہ تجھکو بُھلایا نہیں ہنوز
سرمایۂ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل	باتوں میں ہمنے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چُور خدا جانے اسقدر
حالی نے جام مونہ سے لگایا نہیں ہنوز

جیتے جی موت کے تم مونہ میں نہ جانا ہرگز	دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازونکی	دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی	زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز
چاہت اک طلعتِ مکروہ ہی برقع میں نہاں	کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے	تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رستے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یہاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سُنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی۔ مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یہاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چُرانا ہرگز

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یہاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اِس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی اُنھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جسکو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہمکو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا انپہ جہاں روتا ہے
اِن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھکو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یہاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہو گی یارو
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کُڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنوں کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنیگا کوئی بُلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یہاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

رنجش و التفات و ناز و نیاز
ہمنے دیکھے بہت نشیب و فراز

عشق کی آنچ اُس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

شیخ! اللہ رے تیری عیاری
اُس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اک پتے کی جو ہمنے کہدی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

ہمکو نسبت پہ فخر ہے تیری
تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز

آج منکر بھی ناچ اُٹھیں گے
گر مغنی کی ہے یہی آواز

قطعہ

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف[۱]
چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

یہ قطعہ اسوقت لکھا گیا تھا جبکہ ٹرکی کو سلطان عبدالعزیز خاں کے قتل کے بعد سرویہ، مانٹنگرو اور روس وغیرہ کے مقابلہ میں اخیر صدمہ پہنچا ۱۲

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا	۲	ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز
ہوتے جاتے ہیں ارجمند ضعیف	۳	بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے	۴	گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
ہے نہتوں کو رہگذر میں خطر	۵	رہزنوں نے کیئے ہیں ہاتھ دراز
ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم	۶	بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لبِ آز
ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے	۷	گھائلوں پر ہیں ہنر تیر انداز
تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے	۸	حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس	۹	اور یاروں کے یار ہیں غماز
ہوگا انجام دیکھئے کیا کچھ	۱۰	ہے پرآشوب جبکہ یہ آغاز
گتے ابھی تک کھلی نہیں لیکن	۱۱	غیب سے آرہی ہے کچھ آواز
وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر	۱۲	موج حائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے	۱۳	یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز
کام اُسے اپنے سونپ دو حالی	۱۴	نہیں جس کا شریک اور انباز
ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے	۱۵	چارہ یاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

س

جاذبِ رحمت ہے مقناطیسِ عصیاں اپنے پاس
رکھتے ہیں عاصی کمندِ صیدِ غفراں اپنے پاس

عاجزوں سے معتدر کرتے ہیں اکثر درگذر
عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس

ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے
عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس

بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند
رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس

خاک میں ہمنے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس

دستبردِ اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمد اللہ وہ مُہرِ سلیماں اپنے پاس

دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویزِ استخلافِ رحماں اپنے پاس

چھیڑ اب نہ اے تصورِ مژگانِ یار بس — کافی ہے خارِ خارِ غمِ روزگار بس
یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے — غمخواری اپنی رہنے دے ای غمگسار بس
ہر داغ فصلِ گل کی نشانی ہے اے صبا — گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس
ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نجائیں — اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس
دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ — یہاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر
کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس

تھوڑی سی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

ش

اک ہم کو مہم برسرِ ایام ہے درپیش
بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش

غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہی چار طرف سے
اور معرکۂ گردش ایام ہے درپیش

وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز
اب اُس مرضِ صعب کا انجام ہے درپیش

گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی۔ قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش

وہ وقت گیا۔ نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا
اب وقتِ خمارِ مئے گلفام ہے درپیش

اُمیدِ شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے
اب موت کا سُننا ہمیں پیغام ہے درپیش

جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

ص

ہر بشر سے اُس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دنیا سے۔ مگر
رہزنِ دل ہیں ابھی اُس کی ادائیں خاص خاص

گو زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گُل
یاد ہیں لیکن وہ بُلبل کی صدائیں خاص خاص

زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص

یوں تو ہے اُمید سب کچھ۔ پر نہ ہوں یہ معاف
وہ جو کی ہیں ہمنے اے حالی خطائیں خاص خاص

درد۔ اور درد کی ہے سب کے دوا۔ ایک ہی شخص
یھاں ہی جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

حور و غلماں کے لیئے لائیں دل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یھاں عہدہ بر آ ایک ہی شخص

قافلے گذریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگونکے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہمکو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہی۔ مگر فیض ہی جاری شب و روز
کچھ سہی شیخ۔ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

ض

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض
چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض

دل میں ہی اے خضر گر صدقِ طلب
راہرو کو رہنموں سے کیا غرض

حاجیو ہے ہمکو گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض

گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
اُنکو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض

نیک کہنا نیک جس کو دیکھنا
ہمکو تفتیشِ دروں سے کیا غرض

دوست ہیں جب زخمِ دل سے بے خبر
اُنکو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض

عشق سے ہیں مجتنب زاہد عبث
شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض

کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب
اب اُسے دُنیائے دُوں سے کیا غرض

آئے ہو حالی پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

دوست کا نا روا نہیں اعراض
دوستوں ہی کا کام ہے اغماض

چاہیئے ایک سب کا ہو مقصود
گو ہوں سب کی جدا جدا اغراض

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دیئے ایک دُکھ نے سب امراض

دیکھیئے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
اَور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

لَا اُبَالِی بِاَنْ یُعَاتِبَنِی
کُلُّ نَاسٍ وَ اَنْتَ عَنِّیْ رَاضٍ

مُنعِمو بذل خیر میں یہ دیر
اپنا مطلب اور اُس پہ سو اغماض

حق میں اپنوں کے سخت مُمسک ہیں
جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض

رای ہے کچھ علیل سی تیری
نبض اپنی بھی دیکھ اے نبّاض

وعظ میں گُل کترتے ہیں واعظ
مُونہ میں اُن کے زباں ہی یا مقراض

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
هَلْ لَنَا فِیْ نِزَاعِنَا مِنْ قَاضٍ

ہے ریاضت پہ ناز کیا زاھد
خار کش تجھ سے ہے سوا مرتاض

شیخ کی تھی یہ آخری تلقیں
چاہیئے زر تو اُس سے کر اعراض

ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

ط

رات گذری ہو چکا دورِ نشاط
طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط

دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط

دن اب ایدل منقبض رہنے کے ہیں
ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط

غنچہ چٹکا اور آپہنچی خزاں
فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط

زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ
جانیو واعظ اِسے راہِ صراط

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

کوچ کی حالی کرو تیاریاں
ہے قُوے میں دمبدم اب انحطاط

ظ

چھپے ہیں حریفوں میں احرار۔ واعظ
بُرا کہہ نہ رندوں کو زنہار۔ واعظ

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
نہ ستار ہے تو نہ غفار واعظ

نکل آئے گی مے کشی کی بھی حِلت
کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
سُنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

ہمیں اَور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن
یہ جُبہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ

نچھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو
یہی ہے اگر حُسنِ گفتار واعظ

مُسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے
ہوئے بات کہکر گنہگار واعظ

ع

اے بہارِ زندگانی الوداع — اے شباب اے شادمانی الوداع

اے بیاضِ صُبحِ پیری السلام — اے شبِ قدرِ جوانی الوداع

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا — الوداع اے عمرِ فانی الوداع

روزگارِ ضعف و سُستی الصلا — وقتِ سعی و جانفشانی الوداع

قطعہ

فرصتِ عشق و جوانی الفراق ۱ دورِ عیش و کامرانی الوداع

تجھکو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں ۲ اے نعیمِ جاودانی الوداع

تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں ۳ اے خدا کی مہربانی الوداع

آلگا حالی کنارے پر جہاز — الوداع اے زندگانی الوداع

غ

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ — دیکھ اس خرام ناز پہ اتنا نہ کر دماغ

ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں — حملے سے یہاں اجل کے نہیں ایکدم فراغ

یارب نگاہ بد سے چمن کو بچائیو — بلبل بہت ہی دیکھکے پھُولوں کو باغ باغ

دو چار گام نقشِ قدم مل کے رہ گئے — آگے چلا نہ آہوئے مشکیں کا کچھ سراغ

آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہلِ ظرف ہوں — ساقی بھرے کھڑا ہے مئے لعل سے ایاغ

جنگل میں تختۂ گل خودرو کو دیکھکر — تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں — باری تب اُنکی آئی کہ گل ہوگئے چراغ

ف

حق نہ مُلّانے کچھ بتایا صاف — اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف
آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھُلی — مہر روشن نظر نہ آیا صاف
کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم — صاف تھے آپ سب کو پایا صاف
زاہدو ہم تو تھے ہی آلودہ — تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف
کیوں فقیہوں سے رُک گئے حالی — بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

ق

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لایق — نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لایق
کرے گا کیا تیرا کحل الجواہر اے کحّال — نہیں یہ آنکھ ہی دیدار یار کے لایق
مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ — بہت ہے زندگیِ مُستعار کے لایق
غرور و حرص ہیں زیور عروسِ دُنیا کے — بناؤ تھے یہی اِس نابکار کے لایق
کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز — رہا نہ باغ قدمِ بہار کے لایق
بس اب ہے فضلۂ روباہ و گرگ پر گذران — رہا نہ شیرِ ژیاں خود شکار کے لایق
گنہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے — ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لایق
گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی — تمھیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لایق
یہ ہم نے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ — مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لایق

ک

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں
جہاں ہو راہزنِ خلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر
بنا ہے غوثِ زماں آجکل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہو رند و پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے امید ہو اُسوقت
کہ یار یار سے ہو جائیگا جدا ایک ایک

چھپا کے اُس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے
جب آپ مونہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اُسکی بندگی کا ادا
کیا ہے جسنے حقِ خواجگی ادا ایک ایک

امیر حاج کی ہمت میں گر نہ آئے قصور
تو موجِ بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اُسکا اڑا لیگئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ
جگر کے پار ہو اب بھی تری نوا ایک ایک

وہ عشق ہی نہ جوانی وہ تو ہی اب نہ وہ ہم
پہ دل پہ نقش ہو ابتک تری ادا ایک ایک

نہ ہم رہینگے نہ حالی یہ دلخراش جہاں
رہیگی حالیٔ دلگیر کی صدا ایک ایک

گ

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں اُنکی اور اُنکا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلائشوں میں۔ بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو ہے عشیرہ اور اُنکا دودماں سب سے الگ
سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں ہے کوئی بھیدی اور اُنکا رازداں سب سے الگ
جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ
اک چمن بھر تفرّج رکھتے ہیں زیرِ بغل روضۂ و بُستان و فردوسِ جناں سب سے الگ
کلبۂ احزاں ہے روشن اُن کا جس مہتاب سے ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندوں میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند پر ٹٹولے کوئی دل اُنکا تو وہاں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے دردمندوں کا ہے دُکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دُکاں سب سے الگ

صلح ہے اک مُہلتِ سامانِ جنگ کرتے ہیں بھرنے کو یہاں خالی تفنگ
عہدِ گیتی پر نہ پھولیں کامراں آخر اسکی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا۔ اخلاق کیا۔ ہتھیار کیا سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
روکیے بدخو کو بدخوئی سے کیوں آپ اپنی خو سے آجائے گا تنگ
زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ
پاکبازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع جو ہیں اچھے اُنپہ سب کُھلتے ہیں رنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا دل میں اب اُٹھتی نہیں کوئی اُمنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

کاہشوں نے پرورش پائی ہے روح — اب لگا کھایا پیا سب آکے انگ

عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ — ہے ابھی کم حاصلِ افیون و بنگ

بڑھ گیا ہے رحمِ انسانی بہت — ہو گئی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ

قوم کو حالی نہیں راس اتفاق — پھوٹ ہی کا بس کھلیگا ہم پہ رنگ

ل

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل — یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل

رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف — اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل

اک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں — ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل

کب تک آخر ٹھیر سکتا ہے وہ گھر — آ گیا بنیاد میں جس کی خلل

ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار — تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ امل

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی — لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

دیکھیے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع — ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل

کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں — وقت کوشش کا گیا شاید نکل

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر — ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

م

مدرسہ میں دہر کے روبرقضا بیٹھے تھے ہم — اُٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ　　زالِ دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم

صحبتیں اہلِ ورع کی سب گئیں نظروں سے گر　　بزمِ رنداں میں یونہیں اک دن جا بیٹھے تھے ہم

شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی　　ورنہ دھوکا دور سے دیکھ اُسکو کھا بیٹھے تھے ہم

ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تری　　آدمی تجھکو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر　　ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اُٹھا بیٹھے تھے ہم

ہمسے خود دنیا ہی پٹپائی نہ حالی ورنہ یہاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم　　پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں　　گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں　　پر گنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز　　گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم

دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر　　پر اُسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی　　جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا اُن دوستوں پر جنمیں ہو صدق و صفا　　پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا　　اک جہاں سے آپکو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا　　اپنے میں گر شمۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم

بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا　　گر کبھی توفیقِ ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر — درد خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھیرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے — حال نفس دوں کا اُتنا ہی بُرا پاتے ہیں ہم

جسقدر جُھک جُھک کے مِلتے ہیں بزرگ و خرد سے — کبر و ناز اُتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم

گو بھلائی کر کے ہمجنسوں سے خوش ہوتا ہے جی — تہ نشیں اُسمیں مگر دُردِ ریا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر — داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم

راہ کے طالب ہیں پر بیراہ پڑتے ہیں قدم — دیکھئے کیا ڈھونڈھتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہمنے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم

(ق) آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم — سب کچھ کہا مگر نہ کھُلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم — کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں — آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں — تنگ آگئے ہیں اپنے دِلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق — بدلینگے تجھکو زندگیِ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر — آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اُسکے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہکے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو — کچھ پا گئے ہیں آپکی طرزِ بیاں سے ہم

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں — ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے || پوچھینگے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

ن

یاروں کو تجھسے حالی اب سرگرانیاں ہیں || نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
یاد اُسکی دل سے دھودے اے چشم تر تو مانوں || اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی || الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
غیبت ہو یا حضوری دونو بُری ہیں تیری || جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں
کہتے ہیں جسکو جنّت وہ اک جھلک ہے تیری || سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے || شانیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں
ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو || کچھ اِن دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یہاں اب تو حقیر ہیں ہم || بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر || یہاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش || حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جنکے نشاں تھے برپا || کچھ مقبروں میں باقی اُنکی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے || اس سے بھی سخت آتی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا || کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑونکے گر تم میں ہوں تو جانیں || گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

روتے ہیں تیرے حالیؔ لذت ہی کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوتے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یہاں ڈھونڈھتے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں

چل کے نئی اک چال فلک نے کھو دیئے ہوش حریفوں کے
ذِرُو سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس انھیں گر اپنا ذرا ہو جاں اپنی بھی اُن پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن ہیں کسیکا پاس نہو
بتلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اُسکو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

یہاں تو بدولت زہد و ورع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا پر کل کے لیئے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سُر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بیوقت سی تھی

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں
غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالیؔ یہاں سمجھو تم مہمان ہمیں

کی تو ہیں ہمنے بھی حالیؔ کوچ کی تیاریاں
سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

خواب راحت میں وہ لذت تیرے ای پیری نہیں
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار
ناگوار اُنسے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی
سب کو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریاں

زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی مُحال
اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہیں ہشیاریاں

بے مزہ ہی اہلِ دیں کی ترشروئی بھی مگر
اُس سے پھیکی اہلِ دنیا کی ہیں ظاہرداریاں

گو طبیعت سے گئے سب بادۂ فاسد نکل
کم ہوئیں حالیؔ نہ لیکن نفس کی بیماریاں

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خون اپنا ہدر کرتے ہیں

عقل کی بات کوئی ہمنے کہی ہے شاید
جنّتی جتنے ہیں سب ہمسے حذر کرتے ہیں

جُرم خالق سے سوا پاتے ہیں جرم فقہا
جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں

کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ!
بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں

زہد و طاعت کا سہارا نہیں جب سے زہد
یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب۔ ہنر دکھلاؤ
ورنہ یہاں عیب تو سب فردِ بشر کرتے ہیں

غمز دو رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ دل دُکھاتے ہیں وہی جسمیں کہ گھر کرتے ہیں
جی رُکاوٹ سے جو اُن کی کبھی رُک جاتا ہے اک لگاوٹ میں اِدھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں
ایک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب یا اِسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں
تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں
قیصر و زار کا یہاں پیٹ تو بھرنا معلوم بس ہماری ہی طرح وہ بھی گذر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں رخنے نکلینگے سیکڑوں اسمیں
کی نصیحت بُری طرح ناصح اَور اک بِس ملا دیا بِس میں
ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے چشم انسان و چشمِ نرگس میں
بے قدم دَم ہیں خانقاہوں میں بے عمل علم ہیں مدارس میں
دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز اب دھرا کیا ہے اُسمیں اور اِسمیں
نہ ہو قبضے میں جب عنانِ فرس ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں
جس سے نفرت ہی اہل نعمت کو وہی نعمت ہی چشمِ مفلس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور۔ آدمی۔ فرشتہ۔ خدا آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
آج کل چرخ صلح جو ہی بہت دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اُسکو مجلس میں

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں — ہیں مَے ناب کے دلاّل۔ قدح خوار نہیں
شہر میں اُنکے نہیں جنسِ وفا کی بکری — بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں
کونسے وہ گُلِ رعنا پہ نوا سنج نہیں — کونسی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں
کبھی لیلیٰ پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا — اور جو پھر دیکھو تو دونو سے سروکار نہیں
اُٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی اُنسے — دل پھنساکر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں
عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ — اور جو ہو کیسل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں
نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا اُن کو — دربدر جھانکتے پھرنے سے اُنھیں عار نہیں
بوالہوس کام طلب بندۂ نفس اہل ہوے — ایک عالم ہے اِسی رنگ میں دو چار نہیں
دعویِ عشق و محبت پہ نہ جانا اُنکے — اُن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں
کہدو واللہ کہ صادق نہیں۔ زنہار نہیں

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آکے پھر چمن میں — اِک حشر سا ہے برپا مُرغانِ نغمہ زن میں
بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے — بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں
بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا — پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں
چُپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہی چشمِ نرگس — قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

ہیں اور تو ادا میں ساری سہی قدوں کی　　　پڑنی ہے جان باقی بس سرو و نارون میں

ہے عیدِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں　　　جنگل بسا ہوا ہے سب عطرِ یاسمن میں

سینہ سے دھواں سا اُٹھا لیتے ہی نامِ اسلام　　　بارود بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

پھر زخم پھوٹ نکلا۔ **حالی** نہ چھیڑنا تھا　　　فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں

گو رو چکے ہیں دُکھڑا۔ سو بار قوم کا ہم　　　پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی　　　تم نے سُنا بھی؟ اُس پر کیا گذری انجمن میں

پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا　　　روندن میں ہے وہ گلبن پھُولا تھا جو چمن میں

رُوبَہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملّت　　　تھی سہمناک کل تک جو شیر کے بَرَن میں

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمنؔ کی　　　ہے اب بجائے حکمت خاک اُڑ رہی یمن میں

وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عَدَن کے　　　ہے کال موتیوں کا اب سر بسر عَدَن میں

قبرِ اُوَیس پر ہے بس فخر اب **قَرَن** کو　　　زندہ اُوَیس کوئی باقی نہیں **قَرَن** میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اُڑا دی　　　فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

ڈالی نہ ہوگی آگے اے دورِ چرخ شاید　　　جو اَب کے تو نے ہل چل ڈالی ہے انجمن میں

فوج اور بہیر دونو پھرتی ہیں بے سری سی　　　گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رَن میں

خُرد و بزرگ سارے ہیں بد حواس۔ گویا　　　لُٹنے کی قافلے کے پہنچی خبر وطن میں

8 یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ الایمان یمانٍ والحکمة یمانیة؎ یعنی ایمان ہے تو یمن کا ہے اور حکمت ہے تو یمن کی ہے“ اسی بنا پر میر باقر داماد نے اپنے فلسفہ کا نام حکمتِ یمانیہ رکھا ہے ۱۲

بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب | جائیں کدھر کہ ہر سو دَوں لگ رہی ہی بن میں

حالی بس اب نہیں یہاں سُننے کی تاب باقی | مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہی یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

ہی جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں | اب ٹھیرتی ہی دیکھیے جاکر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور | ہوتی ہی آج دیکھیے ہمکو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر | تھا اُسکو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق | رکھی ہی آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا | خط کا مرے جواب ہی اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہی دلِ وحشی کنارہ گیر | اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہی گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور | عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی | دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

پیا ہمنے نہ جامِ بے کدورت بزمِ دوراں میں | خزاں کو لیگئے ہمراہ اگر پہنچے گلستاں میں

نہیں کچھ منحصر وابستگی زلفِ پریشاں میں | جو دل چاہے تو اُلجھے اک غبارِ دودِ پیچاں میں

اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشقِ زلیخا نے | نہ رہنے دیگا حُسنِ خود نما یوسف کو کنعاں میں

تصور نے بھلایا تیرے ذوق شادی و غم کو | نہ کچھ کلفت ہی زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں
خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر | کہاں تک جی نہ گھبرائے الٰہی درد ہجراں میں
زباں تقریر سے قاصر قلم تحریر سے عاجز | نہ پوچھو ہمسے کیا دیکھا ہے ہمنے بزم رنداں میں
فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کام دل اے خضر | سوائے طول حسرت کیا دھرا ہے آب حیواں میں
نہ چھوڑیگی محبت یار سے ناکام عاشق کو | نسیم مصر کو آنا ہے اک دن بیت احزاں میں
گل و نسریں تو ہیں کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے | ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیر گلستاں میں
بہت دن چاہئیں یوسف کو تا پہنچے زلیخا تک | نکلکر چاہ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے **حالی** فرصت سیر جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

ق

اب وہ اگلا سا التفات نہیں | جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
مجھکو تمسے ہے اعتماد وفا | تمکو مجھسے پہ التفات نہیں
رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ | زندگی موت ہے حیات نہیں
یونہیں گذرے تو سہل ہے لیکن | فرصت غم کو بھی ثبات نہیں
کوئی دلسوز ہو تو کیجے بیاں | سرسری دل کی واردات نہیں
ذرہ ذرہ ہے مظہر خورشید | جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا **حالی**
عاشقی کچھ کسیکی ذات نہیں

ق

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں　　چاک دل میں ہی مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال　　اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

ہنے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار　　بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا　　فتنۂ دہر ہے جو حُسن وہ کنعاں میں نہیں

محتسب! صدق و صفا یہاں ہی انھیں کے دم تک　　مصلحت بر ہمیِ صحبتِ رنداں میں نہیں

یہاں بھی ہے کون مکاں سے دلِ وحشی آزاد　　جسکو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھیر جائے گا　　بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

کس طرح اُسکی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں　　خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ　　ایسے الجھاؤ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے　　اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ　　اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اُس مردِ مسلماں میں نہیں

ق

غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں　　شادیِ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں

خوبروئی کے لیئے زشتیِ خو بھی ہے ضرور　　سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھسا طرحدار نہیں

قول دینے میں تامُّل نہ قسم سے انکار　　ہمکو سچّا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشہ سے آتی تھی صدا　　دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

حق ہوا کس سے ادا اُس کی وفاداری کا — جسکے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں
دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کونسی راہ — کعبہ و دَیر سے کچھ ہمکو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلعِ ثانی سُنکر
جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

ق
میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں — اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں
کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے — جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
چشم بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ — غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں
ہو چکا ناز اُٹھانے میں ہے گو کام تمام — للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں
مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا — دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں
اصلِ مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا — ورنہ ہم اور کسی شے کے طلبگار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

وحشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں — لائی ہے بوئے اُنس نسیمِ چمن کہاں
ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی — جائے گا دَیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں
اہلِ طریق جسکو سمجھتے ہیں زادِ راہ — وھاں دخل دستبُرد کو اے راہزن کہاں
فصلِ خزاں کمیں میں ہو صیاد گھات میں — مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں
لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا — لیجائے ہمکو دیکھئے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں مگر وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

دل ہو گیا ہے لذّتِ غربت سے آشنا اب ہم کہاں ہولئے نشاطِ وطن کہاں

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

روکا بہت کل آپ کو حالیؔ نے وھاں مگر

جاتا ہے محو شوق کا دیوانہ پن کہاں

(ق)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

کہیں انجام آپہنچا وفا کا گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا بہت وسعت ہی میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا اگر فرصت ملی مجھکو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے ملکر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

و

(قا)

مرے دل میں ہو۔ گو مجھسے نہاں ہو مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو

نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عدو کا اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو

تقاضائے محبت ہی۔ وگرنہ مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بیقرار ہوں محفل میں تیری — کہیں ناخواندہ تو بھی میہماں ہو

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں — بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے — جسے سُننی ہماری داستاں ہو

مؤثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اُس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

حکم ہے پیرِ مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ — خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ

دل کو کس طرح سمجھیے کہ وہی ہے یہ دل — وہ امیدیں ہیں نہ ارماں وہ امنگیں ہیں نہ چاؤ

یار کو بار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر — تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ

دوست ہوں جسکے ہزاروں وہ کسیکا نہیں دوست — سچ بتا تجھکو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ

تو وہی برقِ جہاں سوز ہے بن خواہ نہ بن — ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ

ایک ہی دوست اور اُس سے ہمیں چھُڑواتے ہو — ناصحو اب تمھیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ

ہو گیا ذکرِ قیامت تو اب حضرتِ واعظ — باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ

تجھکو اے ابرِ بلا دیکھکے جی چھوٹ گیا — ایک ہی بار تم اے بادلو اسطرح نہ چھاؤ

پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا — ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ

دیکھیں کسطرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ اُمید — آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مِلکے بہاؤ

اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک — آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ

قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ — وقت اب ہاتھ سے جاتا ہی جو آتے ہو تو آؤ

اُسکے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

ھ

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ

ہر اک کو نہیں ملتی یھاں بھیک زاہد بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ

کچھ اَور آؤ بن کر تم اے میرو مرزا نہیں پوچھتے یھاں حسب اور نسب کچھ

یہ طبلِ تہی ہیں جو ہنکارتے ہیں جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

دیا تو نے یھاں جس بہانے سے چاہا ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی خنت سے واعظ وہ گرمائیگا یہ پسیجینگے جب کچھ

تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ

یہ ہے میرِ مجلس کہ چینی کی مورت ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمہ چرب تاکا ہے شاید
یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتساب شرافت نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو	اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے	نہیں لگتی کچھ اسمیں دولت زیادہ
مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا	مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا	مبادا کہ ثابت ہو خست زیادہ
پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت	بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ
کہیں دوست تمسے نہ ہو جائیں بدظن	جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا	نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا	جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے	خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم	پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا	مگر اسمیں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت یہاں ہم زمانہ کے ہاتھوں	پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر	نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی

الاپیں نہ بس آپ دُھرپت زیادہ

ق حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ	مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ
وفا اغیار کی اغیار سے سُن	مری الفت در و دیوار سے پوچھ

ہماری آہِ بے تاثیر کا حال　　کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ
دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری　　کمندِ گیسوئے خمدار سے پوچھ
دلِ مہجور سے سُن لذتِ وصل　　نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ
نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق　　ہماری چشم دریابار سے پوچھ
نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست　　کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ
فریبِ وعدۂ دلدار کی قدر　　شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ
فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل　　یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ
تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم　　وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ
متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالی　　مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ی

ہے اُنکی دوستی پر ہمکو تو بدگمانی　　وہ ہمکو دوست سمجھیں یہ اُنکی مہربانی
بے جرم کوئی آخر کب تک سُنے ملامت　　ناصح سے ہمکو اپنی کہنی پڑی کہانی
عاشق کے دلکو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے　　دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی
امیدِ وصل سے ہے کچھ جی چھڑائے دیتا　　جو کچھ سُنا ہے ہمنے مشاطہ کی زبانی
ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں ہیں خوش　　کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی
صبر و سکوں سے ہمکو یہ بھی نہ پڑنے دے　　تھوڑی سی رہ گئی ہے لے کاہشِ نہانی

پھر یہ بہارِ مستی ہے تیرے بعد ویراں　　ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے　　کیا جانئے کس ادا سے کی اُس نے دلستانی

اک نکتہ کے بیاں سے سر بر نہو گے حالی

چلتا نہیں کسیکا یہاں لافِ نکتہ رانی

کہدو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے　　گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے

جو کچھ ہے سو ہے اُسکے تغافل کی شکایت　　قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے

دلّالہ نے اُمید دلائی تو ہے لیکن　　دیتے نہیں کچھ دل کو تسلّی یہ دلاسے

ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہِ خوباں　　یہاں ہیں۔ تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے

پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں　　ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آبِ بقا سے

درگزرے دوا سے تو بھروسہ پہ دعا کے　　درگذریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو　　تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے

حالی دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین　　شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے

جب وقت پڑے دیجئے دستک درِ دل پر

جھکئے فقرا سے نہ جھکیئے اُمرا سے

بلبل و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کسکا ہے　　کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کسکا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار　　مرو کسکا ہے بدخشان و ختن کسکا ہے

دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر　　چرخ کہتا تھا کہ یہ بیت حزن کسکا ہے

مطمئن اِس سے مُسلماں نہ مسیحی نہ یہود — دوست کیا جانیے یہ چرخِ کہن کسکا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہی یا ذاتِ خدا — ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کسکا ہے

آج کچھ اَور دنوں سے ہے سوا استغراق — عزمِ تسخیر پھر اے شیخِ زمن کسکا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر — تم میں رُوپ اے گلِ ونسرین و سمن کسکا ہے

عشق اُدھر عقل اِدھر دُھن میں چلے ہیں تیری — رستہ اب دیکھیے دونو میں کٹھن کسکا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اُس کی — ولولہ تجھمیں یہ اے مُرغِ چمن کسکا ہے

ہیں فصاحت میں مَثَل واعظ و حالی دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہوا کچھ اَور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے — ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز — کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سپاہ و میرِ سپہ باغ باغ ہیں لیکن — بہیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب — کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے

قلق اُنھیں نہیں گر دوستوں سے چھُٹنے کا — طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیئے خلجان بینوائی نے — ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز — زمیں بھی اپنے خزانے اُگلتی جاتی ہے

اُڑے گی خاک تقدس کی اب سرِ بازار — فقیہ و شیخ میں جوتی اُچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہی کچھ حالی — کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

بُری اور بھلی سب گذر جائیگی — یہ کشتی یونہیں پار اُتر جائے گی
ملیگا نہ گلچیں کو گُل کا پتا — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاّح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر — یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ! — یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں اُمیدیں نہ ہوں — یونہیں عمر ساری گذر جائے گی

سُنینگے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی — کہ اُنکے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن — حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تونے گلشن میں — یہ گلچینی ہی یا لُٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی
کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے — یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی
رہی دانائی آخر غالب اگر پہلوانی پر — گئے جیں ماں سب چینی و فرغانی و قبچاقی
ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ — لُنڈھائے خُم پہ خُم غیروں پہ کیوں ممسک ہو گر ساقی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز | اسمیں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی
آنکھ سب ایک کھُلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی | اسمیں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی
جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے | گھات میں اُن کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی
دوست گر بھائی نہو دوست ہے تو بھی لیکن | بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی
اے غمِ دوست تجھی پر نہیں اپنی گذراں | کچھ فتوح اسکے سوا اور ہے بالائی بھی
دل غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دنیا جو لوگ | تیور اُن کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی
عقل ہے۔ اپنی حماقت کے چھپانے کی اُنھیں | جنمیں کچھ ساتھ حماقت کے ہی خود رائی بھی
عقل اور حُسن پہ جنکے بھری مجلس ہو گواہ | انکو خود رائی بھی پھبتی ہی خود آرائی بھی
ملنے دے گی نہ اجل تمسے ہمیں جی بھر کر | فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم۔ پہ رہے مُردوں سے بدتر حالی
دیکھ لی ہمنے طبیبوں کی مسیحائی بھی

رہا کھُلکے زاہد کا زھدِ ریائی | بنائی بہت بات پر بن نہ آئی
بُرائی ہی رندوں میں بھی شیخ! لیکن | کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی
گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب | عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی
رُکا ہاتھ جب۔ بنگئے پارسا تم | نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی
بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے | سوا اسکے مُنعم میں ہی کیا بڑائی

ۃ یعنی غمِ دنیا و غمِ زن و فرزند وغیرہ ۱۲ ۩ اپنے دائم المرض ہونے کی طرف اشارہ ہے ۱۲

جو کہیے تو جھوٹی جو سنیئے تو سچی — خوشامد بھی ہمنے عجب چیز پائی
ہوئی آکے پیری میں قدرِ جوانی — سمجھ ہمکو آئی پہ ناوقت آئی
وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت — وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی
جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح — جو وھاں دل پہ لی تھی تو یھاں مونہ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

وصل کا اُسکے دلِ زار تمنائی ہے — نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
قطعِ اُمید نے دل کر دیئے یکسو۔ صد شکر — شکل مدت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے
قوتِ دستِ خدائی ہے شکیبائی میں — وقت جب آکے پڑا ہے یہی کام آئی ہے
ڈر نہیں غیر کا۔ جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے — ہمنے جب کھائی ہے اپنے ہی سے کھائی ہے
نشہ میں چُور نہ ہوں جھانجھ میں مخمور نہ ہوں — پند یہ پیرِ خرابات نے فرمائی ہے
نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی — بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی۔ اور انگلیاں اُٹھیں سب کی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

اُتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے — جسقدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دوچار — آئے اِس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے
دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھولکر — پھول ہیں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی ۔۔۔ لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے
چیونٹوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق ۔۔۔ آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
تجھ میں جوت اے شمع ہے کس رتبۂ عالم سوز کی ۔۔۔ جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی ۔۔۔ رہ گیا کیا ہے اب اے گبر و مسلماں باقی
بزمِ دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اُسوقت ۔۔۔ میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی
حق ادا اک نگہ لطف کا ہو گا کیونکر ۔۔۔ دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی
ظاہرا درد ہی الفت کا نہیں چارہ پذیر ۔۔۔ ورنہ چھوڑا نہیں ہمنے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجئے ۔۔۔ نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجئے
وھاں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہی بار ۔۔۔ اُس سے آخر کسطرح پیدا تعارف کیجئے
ضبط کیجے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں ۔۔۔ اور کُھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجئے
دوست کے تیور ہیں ہم ہر رنگ میں پہچانتے ۔۔۔ بے تکلف ملئے ہمسے یا تکلف کیجئے
جب کہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول ۔۔۔ شیخ لگتے ہاتھ اسپر بھی تصرف کیجئے
وقت تھا جو کام کا حالی گنوا بیٹھے اُسے ۔۔۔ جائیے اب عمر بھر بیٹھے تاسف کیجئے

توبہ حضرت کی یونہیں اک دودھ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دینگے ذرا دم بھر توقف کیجئے

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جان کو ہمنے لگالی ہے یہ علت کیسی

جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیم خزاں
جنکی قسمت میں ہو کلفت اُنھیں راحت کیسی

جی کا اُلفت کو سمجھتے تھے ہم اک بہلاوا
وہ تو آفت تھی ہمارے لیئے۔ الفت کیسی

جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع نادان
قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی

عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ
جنکو کچھ کام نہیں یہاں۔ اُنھیں فرصت کیسی

جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا
وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی

جانتا ہے وہی۔ دل پر ہے گذرتی جسکے
ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیسی

ہمنے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک
ہمسے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی

جبکہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح
وحی بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی انجام
یار کی ہیں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

سعی سے بہتر تن آسانی مری
کفر سے بدتر مسلمانی مری

تھا نہ محتاجِ سبب عفوِ کریم
کچھ نہ کام آئی پشیمانی مری

خلد میں بھی گر رہی یاد اُسکی زلف
کم نہ ہو شاید پریشانی مری

ہے لباسِ جسم تک مجھپر گراں
دور جا پہنچی ہے عریانی مری

مانعِ گلگشت ہے بیمِ خزاں — موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدرِ نعمت ہی بقدرِ انتظار — حشر پر ٹھہری ہی مہمانی مری

خندہ زن ہے اُس مسلمانی پہ کفر
جیسی ہے حالی مسلمانی مری

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سُنا کیئے اور مہرباں رہے
کیا کیا ہیں دل میں دیکھیے ارماں بھرے ہوئے — ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید — اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی — اُتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا — اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے — نرخِ متاعِ عشق۔ الٰہی گراں رہے

حالی سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اُنمیں کہاں رہے

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اُس کی کاٹتے رہے اور ہمزباں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ — یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مُغاں رہے
وصلِ مدام سے بھی ہماری بُجھی نہ پیاس — ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ — تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

ق
حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعن وصل عدو
عذر اُن کی زباں پہ آنے لگے

ہمکو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر الفت بہت جتانے لگے

تمکو کرنا پڑے گا عذرِ جفا
ہم اگر دردِ دل سنانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِ باطن کو فاش کر یارب
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

ق
حشر تک یہاں دلِ شکیبا چاہیئے
کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیئے

ہے تجلی بھی نقابِ روئے یار
اُسکو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیئے

غیر ممکن ہے نہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اُسکو لکھا چاہیئے

ہے دل افگاروں کی دلداری ضرور
گر نہیں اُلفت مُدارا چاہیئے

ہے کچھ اک باقی خلش اُمید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیئے

دوستوں کی بھی نہو پروا جسے
بے نیازی اُسکی دیکھا چاہیئے

بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کیجیئے اغماض جتنا چاہیئے

شیخ! ہے اِن کی نگہ جادو بھری
صحبتِ رنداں سے بچنا چاہیئے

لگ گئی چپ حالیِ رنجور کو
حال اُس کا کس سے پوچھا چاہیئے

ق
جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے
قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

دمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشک اشک دریا ہوا چاہتا ہے

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُنکے
ملاپ اُنسے گویا ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہمکو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے

ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے

مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت
کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

فزوں تر ہے کچھ اِن دنوں ذوقِ عصیاں
درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی
کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے

وفا شرطِ اُلفت ہے لیکن کہاں تک؟
دل اپنا بھی تجھسا ہوا چاہتا ہے

بہت خط اُٹھاتا ہے دل تجھسے ملکر قلق دیکھئے کیا ہوا چاہتا ہے

غمِ رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گذرتے ہیں حالی

کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

(ق) جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے آج دل لے گا اگر کل نہ لیا۔ یاد رہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رُکے اُس شوخ سے ہم یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر نہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت۔ لطف سمجھکر کیجے اس بھلائی کا ہے انجام بُرا۔ یاد رہے

شیخ یہاں شرمِ گنہ شوق بھلا دیتا ہے توبہ اُنکی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے

وادیِ عشق میں موسیٰؑ کو ہو گر رخصتِ دید ہاتھ کٹوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے

خضر نے پانو اگر دشتِ فنا میں رکھا بھول جائینگے رہِ آبِ بقا یاد رہے

دل بُری طرح لگا عشقِ بتاں میں اے شیخ دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے

چارہ گر! کار باندازۂ تدبیر نہیں کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ

حضرت اِس لطف کا پائینگے مزا۔ یاد رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

افسوس شبِ وصال کے ڈھالکار گر نہیں نالے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے

اے دل اب آزمایش تقدیر کا ہے وقت — وہ امتحانِ برّشِ شمشیر کر چکے

کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے — ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز — دیکھا تو دل کو ہم ہدفِ تیر کر چکے

جاں لب تک انتظار میں آتی ہے بار بار — مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے

دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ — گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالیؔ اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ کر چکے

(ق)

نہ وہاں پرسش نہ یہاں تابِ سخن ہے — محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُسکی — وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات — مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی — جو سچ پوچھو تو جائے سوءِ ظن ہے

بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار — تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

دلاتی ہے صبا کسکو چمن یاد — نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

کروں تجھسے بیاں کچھ دردِ غربت — مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے

رہے لاہور میں آکر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے

8 یہ غزل تقریباً ۱۲۹۱ہجری میں اُس وقت لکھی تھی جب کہ اول ہی اول بتقریب ملازمت دلی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا۔ اُس وقت اول تو دلی سے جدا ہونا ہی سخت شاق گذرا تھا۔ دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی یعنی وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور و شور رہا۔ آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا۔ اُس تنہائی اور سراسیمگی و غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے تھے ۱۲

نہیں آتی کہیں یہاں بوئے یوسف مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اسقدر عام کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلی نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس باغ کا پھول؟ جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس مصر کی بو؟ جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے
نہ لینے دیگا جنت میں بھی آرام یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے
گریں نظروں سے سب باتیں پرانی مگر الفت کہ اک رسم کہن ہے
بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی! یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

کیا ہے اُسنے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہمکو ابھی اِسمیں سخن ہے

(ق) دُھوم تھی اپنی پارسائی کی کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت ہمکو طاقت نہیں جدائی کی
مُنہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے تمکو عادت ہے خود نمائی کی

§ یہ غزل بھی لاہور میں اُسوقت لکھی گئی تھی جبکہ غزل سابق لکھی گئی تھی۔ آخر کے اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے ۱۲

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں — صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن — ہم سے باتیں کرو صفائی کی

دل رہا پائے بندِ الفت دام — تھی عبث آرزو رہائی کی

دل بھی پہلو میں ہو تو یہاں کس سے — رکھیئے امید دل ربائی کی

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے — بو نہیں آتی آشنائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی

بختِ ہمداستانی شیداؔ — تو نے آخر کو نارسائی کی

صحبتِ گاہ گاہِ رشکیؔ — تو نے بھی ہم سے بیوفائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے — ساعت آپہنچی اُس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالیؔ
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

(ق)

کر دیا خوگرِ جفا تو نے — خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دور پہنچی تھی اپنی آزادی — پر خدا جانے کیا کیا تو نے

کیوں نہ آئیں گے یہاں وہ اے ہمدم — بس سنا میں نے اور کہا تو نے

گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج — نہ کہا اور نہ کچھ سُنا تو نے

صبر کا ہے بہت بُرا انجام — ہمکو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے

8 شیدا سے مراد منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب دہلوی ہیں کہ اُس زمانہ میں کبھی کبھی فکر شعر کرتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے ۱۲

ملہ رشکی آنریبل نواب محمد علی خاں بہادر رئیس جہانگیر آباد کا تخلص ہے ۱۲

ابتدائے وفا ہے سر دینا ۔۔۔ میری دیکھی نہ انتہا تو نے
دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل ۔۔۔ اور کھویا رہا سہا تو نے
ایک عالم کو خوش کیا اے رشک ۔۔۔ ہمکو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالی اپنا کہا سُنا تو نے

ق

کر کے بیمار دی دوا تو نے ۔۔۔ جان سے پہلے دل لیا تو نے
رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا ۔۔۔ اب لیا چشمۂ بقا تو نے
شیخ جب دل ہی دَیر میں نہ لگا ۔۔۔ آکے مسجد سے کیا لیا تو نے
دور ہو اے دلِ مآل اندیش ۔۔۔ کھو دیا عمر کا مزا تو نے
ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ ۔۔۔ کیا کیا چشم آشنا تو نے
دل و دیں کھو کے آئے تھے سوئے دَیر ۔۔۔ یہاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے اُمیدِ خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

ق

دل کو درد آشنا کیا تو نے ۔۔۔ دردِ دل کو دوا کیا تو نے
طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا ۔۔۔ خاک کو کیمیا کیا تو نے
وصلِ جاناں مُحال ٹھہرایا ۔۔۔ قتلِ عاشق روا کیا تو نے
تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں ۔۔۔ غم کو راحت فزا کیا تو نے

جان تھی اک وبال فرقت میں — شوق کو جاں گزا کیا تو نے

تھی محبت میں ننگ منتِ غیر — جاذب دل کو رسا کیا تو نے

قطعہ

راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی ۱ — درِ میخانہ وا کیا تو نے

قطع ہونے ہی جب لگا پیوند ۲ — غیر کو آشنا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ — عشق کو رہنما کیا تو نے

ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی — عقل کو ناخدا کیا تو نے

بڑھ گئی جب پدر کو مہرِ پسر — اسکو اُس سے جدا کیا تو نے

جب ہوا ملک و مال رہزنِ ہوش — بادشہ کو گدا کیا تو نے

جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد — درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہرو کو ذوقِ طلب — سعی کو نارسا کیا تو نے

پردۂ چشم تھے حجاب بہت — حُسن کو خود نما کیا تو نے

عشق کو تاب انتظار نہ تھی — غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے

حرم آباد اور دیر خراب — جو کیا سب بجا کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھی احباب — ہم کو جادو نوا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب — کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالی اُٹھا ہلا کے محفل کو — آخر اپنا کہا کیا تو نے

---

8 اس شعر میں پدر و پسر کا اشارہ حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کی طرف اور اگلے شعر میں بادشاہ سے مراد ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ ہیں ۱۲

رباعیات

توحید

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا	حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو۔ جانا ہے ضرور	بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہو کھٹکا تیرا

ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا	آتش پہ مُغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے	انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ایضاً

طوفاں میں ہی جب جہاز چکر کھاتا	جب قافلہ وادی میں ہو سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا	وھاں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور	منکر بھی پکار اُٹھتے ہیں تجھکو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ	خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور

توحید

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے — دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سُکھ میں بھول جائیں اطفال — لیکن اُنھیں دُکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

ایضاً

مٹی سے، ہوا سے، آتش و آب سے یہاں — کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر۔ تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک — گنجینۂ غیب میں اُسی طرح نہاں[۵]

ایضاً

ہستی سے ہی تیری۔ رنگ و بو سب کے لیئے — طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور — سب اپنے لیئے ہیں اور تو سب کے لیئے

ایضاً

کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد — دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر۔ جو کہ ہیں تجھ سے لَو لگائے بیٹھے — رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

نعت

زُہّاد کو تو نے محوِ تمجید کیا — عُشّاق کو مستِ لذّتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کا ساجھی کوئی — توحید کو تو نے آکے توحید کیا

ایضاً

[۵] یعنی جو کچھ اب تک ظاہر ہوا ہے وہ بمقابلہ اُسکے جو خزانۂ غیب میں مخفی ہے کان لم یکن ہے ۱۲

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا　　اور اُمیّوں کو خیرِ اُمم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار　　بچھڑے ہوئے گلّہ کو بہم تو نے کیا

ایضاً

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف　　یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر　　آبا کو بھی ہے تیری اُبوّت سے شرف

صلحِ کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بَیر کریں　　شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنّم دنیا　　وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترکِ شعرِ عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی　　بزمِ شعرا میں شعرخوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہمکو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دُکھ میں کامرانوں کی طرح　　ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل اُن کے ہیں ظرف اُنکے جو کرتے ہیں ٹیر　　ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت　　ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص　　نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہیئے اب کیا ہے صلاح فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے۔ پہ اتنی ہی خبر اک مشغلہ دلچسپ ہی بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھیراؤ بد اے فرزند ایک آدھ ادا اُنکی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں ہوں اُسمیں اگر گلے سڑے دانے چند

دوستوں سے بیجا توقع

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جو الومفتوں گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اَور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور

عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو گھٹنے سے کہیں اُنکے نہ بڑھجائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ۔ زباں سے کہتے ہیں وہ کم ہوتے نہیں ساتھ جمع۔ دَمُ اَور قدم
بڑھتا گیا جسقدر کہ حُسن گفتار بس اُتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مُفت یہ امکاں ہے۔ مگر عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

طالب کو سوچ سمجھکر پیر بنانا چاہیئے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفان و یقیں پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں نادان کہیں
گاہک کو ہی احتیاج چار آنکھوں کی اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر آتا نہیں فرق اسکے سوا اُنمیں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجام ترقی بشر یاروں سے کہا پیر مغاں نے ہنسکر
باقی نہ رہیگا کوئی انسان میں عیب ہوجائیں گے چھل چھلاکے سب عیب ہنر

8 دمّم دعویٰ اور قدم عمل ۱۲

مُسرف کو کیونکر فراغت حاصل ہوسکتی ہی

اک مُنعمِ مُسرف نے یہ عابد سے کہا
کہ میرے لیۓ حق سے فراغت کی دُعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اُٹھا کر سوے چرخ
محتاج کر اسکو جلد اے بارِ خدا

کام کی جلدی

یہاں رہنے کی مُہلت کوئی کب پاتا ہی
آتا ہے اگر آج۔ تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام انکو جلدی بُھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہی نفس میں انساں کے جبلّی یہ مرض
ہر سعی پہ ہوتا ہے طلبگار عوض
جو خاص خدا کے لیۓ تھے کام کیۓ
دیکھا تو نہاں اُنمیں بھی تھی کوئی غرض

انقلابِ روزگار

بَس بَس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے عَلَم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اسکی ہے نوبت تو کل اُسکی باری
بَن بَن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضاے سِن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنسکے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی اُمید
وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دُنیاے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو

پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان — اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان — ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان — برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے بس کہ جوتنے سے دہقان — یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لایق ہونا — شیریں سخنی سے شہد فایق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق — آساں نہیں مقبولِ خلایق ہونا

مُسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں پکّا — ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے — سُنتے ہیں کسی کو جب مُسلماں پکّا

مکر و ریا

حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ اُنھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہی حذر — بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
اُنپر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح جن قوموں نے ٹھیرایا تجھے راس المال

ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے سرچشمۂ نعما و آبادی تو ہے
آسایشِ دوجہاں ہے سایہ میں ترے دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

ایضاً

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے عزت نہیں اُسکو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کھات کا نسب بھی عالی پر اُسکو شرف نہیں کچھ اِس نسبت سے

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا۔ مجھ سے ہی عزت ہے جہاں فرمایا ہنر نے۔ میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونوں کا بیاں میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

توقع بیجا

ہیں یار رفیق۔ پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز۔ لیک ذلّت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہی عبث
جو نوعِ بشر کی خود جبلّت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی
اُتنی ہی مغائرت ہے یہاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جسنے کیا فکر مآل
ضدّین ہیں دوستی و دور اندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سوا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیئے کیا ہوتا ہے

ایضًا

اے عیش و طرب تونے جہاں راج کیا
سُلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تونے نینوا اور بابِل
بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اَوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

عشق

اے عشق کیا تونے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ

دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری — قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم — سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت — یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

دین و دنیا کا رشتہ

دُنیا کو دیئے دین نے اسرار و حِکَم — دُنیا نے کمر دین کی تھامی جب دم
گر دین کی ممنون بہت ہی دُنیا — دُنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

آزادگانِ راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ — کافر کہا واعظ نے اُنھیں اور گمراہ
جھُوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت — لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار — اُس قوم کا جینا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جسکو ہرگز پروا — ذلت سے نہیں ہے جسکو ہرگز کچھ عار

عفو باوجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا — مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا

---

8 یعنی کفر و ضلالت ایسی چیزیں ہیں جن کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مثلاً شیخ اکبرؒ کو بعضوں نے صدیق کہا ہے اور بعضوں نے زندیق اور یہ بات کہ وہ فی الواقع صدیق تھے یا زندیق خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ پس جس شخص میں کوئی صریح اخلاقی بُرائی یا عیب موجود نہو اُسکی تکفیر یا تضلیل کرنی ایسی بات ہے جیسے کسی جھوٹے مدعی کو شہادت نہ ملے اور وہ اپنے دعوے پر خدا کو گواہ قرار دے ۱۲

ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی ہے

فتنہ کو جہاں تلک ہو دیجے تسکیں
زہر اُگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غُصہ غُصے کو اَور بھڑکاتا ہے
اِس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمّت

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لیکر سو بار
آخر سرِ بام لیکے پہنچا تو کہا
"مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار"

کم ہمتی

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اسکا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو باہمت تھے بَن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا
ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے ندامتوں کی جانا ہمنے
دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

تاسُّف بر وفات نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم نیّر تخلص دہلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز
آتے ہی خزاں کے کرگئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبل زار
سو اُسکی بھی کل سے نہیں آتی آواز

ایضاً

غالبؔ[8] ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اِسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں جہاں ہر اک دامن میں — محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰؑ کو ملی نہ قوم کی چوپانی — جب تک نہ چرائیں بکریاں مَدیَن میں

گدائی کی ترغیب

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا — کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اسکا اُنکی گردن پہ وبال — دے دیکے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

تکفیرِ اہلِ اسلام

کہنا فُقَہا کا مومنوں کو بے دیں — سُنتے سُنتے یہ ہو گیا ہمکو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال — تکفیر بھی کی تھی فُقَہا نے کہ نہیں؟

ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہمسے سوگواری سُن لو — کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سُن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں — چاہو تو کتھا ہمسے ہماری سُن لو

تنزّلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے

[8] یہ اُن شعرائے دہلی کے نام ہیں جنکے ساتھ راقم کو ربط اور اختصاص رہا ہے عام اس سے کہ وہ مشہور و نامور ہوں یا نہ ہوں ۱۲ (حالی)

مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اول کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہی شرط ابتدا انساں سے — پھر چاہیئے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دستؔ و بازو سے لیا — پائی نہ نجات نوحؑ نے طوفاں سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہی جان کے ساتھ کام انساں کے لئے — بنتی نہیں زندگی ہیں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح — مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

جھوٹی نمایش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سمونے والے — بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جنکی جیبوں میں مدام — اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جسکی ہزار — بدظن نہو عیب اُسمیں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کرکے نظر — کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

سکوتِ درویشِ جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ — خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ مونہ سے یا نہ بولیں حضرت — معلوم ہے ہمکو جتنے پانی میں ہیں آپ

۞ یعنی جب تک کہ کشتی نہ بنائی ۱۲

ملحدوں کا طعن مُسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک مُنکرِ قرآن و خبر ۔۔۔ کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑکر
کچھ دَم ہے تو میدان میں آئیں۔ ورنہ ۔۔۔ کُتّا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا ۔۔۔ ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھسا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر ۔۔۔ اُس سے بھی گیا کہ جسکے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت نہو جب کانوں میں ۔۔۔ دانائی کی باتوں میں اور فسانوں میں
غُربت میں ہے اجنبی مسافر جسطرح ۔۔۔ دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی ۔۔۔ کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ ۔۔۔ دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سُنکر ناک چڑھانا

تعریف سے کھِل جاتے ہیں ناداں فی الفور ۔۔۔ داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سُنکر ناخوش ۔۔۔ مقصود یہ ہے کہ ہو ستایش کچھ اور

حُسنِ ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں ۔۔۔ نیکی میں شک اُسکی کوئی لایا ہی نہیں

ہو سکہ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ پر اُسکو کسی نے یہاں تپایا ہی نہیں

دینداروں کی بُرائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار اور مُفت میں ہوگیا مسیحا بدنام

فکرِ عقبیٰ

منزل ہے بعید۔ باندھ لو زادِ سفر مواج ہے بحر۔ رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے۔ پرکھ لو مال کھرا ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگزر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہوجائے فرشتہ انساں ممکن ہے۔ بدی کا نہ رہے اُسمیں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ۔ پہ حقیقت یہ ہے انسان ہے ابتک وہی قرنُ الشیطاں

سلاطین کا عشق

ہر چند بُرا ہے عشق کا سب کے مآل پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سُلطاں ہو اگر ظلِ الٰہی تو عشق ہو ظلِ الٰہی کے لیئے وقتِ زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ پر تجھے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

بڑھاپے میں موت کے لیئے تیار رہنا چاہیئے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اُٹھا چکے۔ اب حالی
مجلس کرو برخاست۔ ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زردار ذرا سوچ سمجھکر ہونا
جسطرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک
ہے جوہر انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصّہ قابلِ عفو ہے

غُصّہ پہ کسی کے غُصّہ آتا ہے وہیں
جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر
پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

سُفَہا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری
کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر نصیبِ اعدا
رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جسکا پانا ہے مُحال
آتا ہے وہ وقت جسکا ٹلنا معلوم

اسراف

مُسرِف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رایگاں یوں کھوئیں
گر بُخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں۔ بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

ردِّ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے۔ نہ صواب — زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب

بدتر ہے ہزار بار لے دُوں ہمت — سائل کے سُوال سے ترا تلخ جواب

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسّر آئے ہیں ہمیں — جو دیکھے۔ چکھے۔ دل سے بھائے ہیں ہمیں

پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے ای بھوک — جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال — مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال

سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی — اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

اچھوں کو بُرا سُننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا — جو کر کے بھلا۔ خلق سے سُنتے ہیں بُرا

ان گالیوں کا ہے جنکو چسکا حالی — آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکریۂ مدحِ کلامِ راقم

جوشِ خمِ بادہ جامِ خالی میں ہوا — پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا

تسلیم نے دی کچھ اسطرح دادِ سخن — مجھکو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

---

۵ مولوی سلیم الدین مرحوم نارنولی مقیم جے پور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستایش میں اُسوقت بھیجے تھے۔ جب کہ مدت سے فکرِ شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اُن قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی ۱۲

احسان بے منت

احساں کے ہی گر صلہ کی خواہش تمکو — تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اُسے عام — اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

قانون بد اخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار — حاشا کہ ہو انپہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُنکو نہیں حاجت انکی — اور بد نہیں بنتے نیک اِنسے زنہار

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں — بھڑکے گی مداہنت سے اَور آتش کیں
گر چاہتے ہو کہ چُپ رہیں اہلِ خلاف — جز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل — اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اُٹھکر کہ حضور — ہے ٹیکس کا وقت بھی اسیطرح اٹل

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں — اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے — بس مجھکو ہی معلوم ہو جیسا ہوں میں

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ! بھرتے نہیں یوں — دل دیتے ہیں۔ پر جی سے گذرتے نہیں یوں

تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا جو جیتے ہیں اسطرح وہ مرتے نہیں یوں

واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام واعظ نے درشتی سے کیا اُس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدا ہوں جسکے ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

نواب وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اُسکی چھوڑ دی ہمراہی اقبال پہ جس نے فتحیابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی اُنسے ہے جنکی رگوں میں خونِ آصف جاہی

رباعیاتِ قدیم

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھُٹتے ہی چھُٹے گا اُس گلی میں جانا عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئینگے جب یاد کرینگے مجھے تب روئینگے
الفت پہ۔ وفا پہ۔ جاں نثاری پہ مری آگے نہیں روتے تھے تو اب روئینگے

8 یہ رباعی ۱۳۰۶ ہجری میں جبکہ راقم حیدرآباد میں مقیم تھا اور نواب وقار الملک بہادر بمبئی سے پولو میں بازی جیت کر آئے تھے۔ لکھی تھی مگر انکی خدمت میں بھیجی نہیں گئی۔ خون آصف جاہی کے لفظ میں اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ حضور سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں انکے خطاب کی طرف اشارہ ہے

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گذرے
اک خستہ جگر کی رات کیونکر گذرے
گذری نہ ہو جس بغیر یہاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیونکر گذرے

یاد اُس کی یہاں ورد مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجئے کہ ہے نام اُس کا
کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے

کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزید گمراہ!!!
لاحولَ ولا قوۃَ اِلّا باللہ

حُرؔ کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
گمرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگیِ کوئے ضلالت کب تک؟
اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

گر کفر میں **فرعون** کا ثانی نکلا
اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی **یزید**
وھاں **نیل** سے بھی زیادہ پانی نکلا

قصیدے ترکیب بند مسدس اور قطعے مختلف مضامین پر بہ ترتیب اوقاتِ تحریر

۱۔ قصیدۂ نعتیہ

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لیئے
سخن زباں کے لیئے اور زباں دہاں کے لیئے

وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں
عداوت اُس کی عذابِ الیم جاں کے لیئے

وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام
محبت اُس کی حصارِ حصین اماں کے لیئے

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم
زمانہ تفرقۂ روز و شب نہ ... کے لیئے

وہ پھول جس سے ہوئی ہی باغباں مشکور
رہی نہ آمدِ وقتِ چمن خزاں کے لیئے

ہلال مکہ کا۔ ماہِ دوہفتہ یثرب کا
فروغ قوم کے۔ اور شمعِ دودماں کے لیئے

گھر اُس کا موردِ قرآن و مہبطِ جبریلؑ
در اُس کا کعبۂ مقصودِ انس و جاں کے لیئے

[illegible]

سپہر گرمِ طواف اُس کی بارگاہ کے گرد
زمیں سر بسجود اُسکے آستاں کے لئے

وہ لحظہ لحظہ تفقد وہ دمبدم الطاف
رضائے خاطرِ یارانِ جانفشاں کے لئے

وہ گونہ گونہ مُدارا وہ بات بات میں مہر
کشایشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لئے

گہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے
گہ انکسار مُدارات میہماں کے لئے

کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لئے

صفائے قلب حسُودانِ کینہ خواہ کے ساتھ
دعائے خیر بد اندیش و بدگماں کے لئے

کہیں مقدمۃ الجیشِ انبیاؑ و رُسُل
کہیں وہ خاتمۃ الباب داستاں کے لئے

مدینہ مرجع و ماوائے اہلِ مکہ ہوا
مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لئے

اسی شرف کے طلبگار تھے کلیم و مسیح
نوید اُمتِ پیغمبرِ زماں کے لئے

بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہزن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لئے

شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے
بشارت اُمتِ عاصیؔ و ناتواں کے لئے

شفاعتِ نبوی ہے وہ برقِ عصیاں سوز
کہ حکمِ خس ہے جہاں کفر و جہاں کے لئے

خدا کی ذات کریم اور نبی کا خُلق عظیم
گنہ کریں تو کریں رخصت انس و جاں کے لئے

اُسی کا دیں ہے کہ ہے گلشنِ ہمیشہ بہار
وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لئے

عبورِ لجۂ عصیاں سے کسطرح ہو اگر
وہ ناخدا نہو اس بحرِ بیکراں کے لئے

مریضِ حرص و ہوا پائے کب شفا۔ جبتک
وہ چارہ گر نہو اس دردِ جانستاں کے لئے

نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام و لب میں سکت
حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لئے

ارادہ عرش تک اک آن میں پہنچنے کا / کیا تھا عزم اولوالعزم نے کہاں کے لیے
کرم کا دیکھیے دامن کہاں تلک ہو فراخ / ہو میزبان خدا جب کہ میہماں کے لیے
زمیں پہ ٹھیرا ہے ماواے شاہِ عرش نشیں / رہی نہ اب کوئی فوقیت آسماں کے لیے
اِسی سے ہوتا ہے ظاہر عیارِ استعداد / محک ہی حُبِّ نبیؐ دل کے امتحاں کے لیے
اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ / پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسر آئے / کروں نہ طولِ اَمَل روضۂ جناں کے لیے
سمایا اُس کا جو نقشِ قدم تصور میں / ہجومِ شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے
حریفِ نعتِ پیمبرؐ نہیں سخن حالی / کہاں سے لائیے اعجاز اِس بیاں کے لیے
نبیؐ کا نام ہو وردِ زباں۔ رہے جب تک / سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

۲۔ ترکیب بند۔ مرثیہ سنہ ۱۲۸۵ ہجری

مرثیۂ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ غالب

کیا کہوں حال دردِ پنہانی / وقت کوتاہ و قصہ طولانی
عیش دُنیا سے ہو گیا دل سرد / دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال / گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب و وہم و گماں / تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب / جامِ جمشید و راحِ ریحانی

لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی حرفِ باطل ہی عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی اک تماشا ہے حُسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مُشتِ خاک کے بدلے گر ملے خاتمِ سُلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں۔

جس سے دنیا نے آشنائی کی اُس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ ہاں قسم مجکو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے۔ اِس کی صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِ وصل سے محروم جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے شان ہو جس میں دلربائی کی
جنس کاسد سے نارواتر ہے خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خانِ غالب مُرد

بُلبلِ ہند مر گیا ہیہات — جسکی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج — رند اور مرجع کرام وثقات
لاکھ مضموں اور اُسکا ایک ٹھٹھول — سو تکلف اور اُسکی سیدھی بات
دل میں چُھبتا تھا وہ اگر بشل — دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اُسکا تھا اور اُس کی دوات
تھیں تو دلّی میں اُسکی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اُسکے مرنے سے مر گئی دلّی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یہاں اگر بزم تھی تو اُس کی بزم — یہاں اگر ذات تھی تو اُسکی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اُسکی یاد آئیں — کس کی باتوں سے دلکو بہلائیں
کس کو جا کر سُنائیں شعر و غزل — کس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اُس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہی نوحۂ اُستاد — کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہلِ میّت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں

اُسکو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح　　اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم　　لوگ جو چاہیں اُنکو ٹھیرائیں
ہمنے سب کا کلام دیکھا ہے　　ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حُسن و جمال کی صورت　　نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر　　تعزیت اک ملال کی صورت
قال اُس کا وہ آئینہ جسمیں　　نظر آتی تھی حال کی صورت
اُس کی توجیہ سے پکڑتی تھی　　شکل امکاں محال کی صورت
اُس کی تاویل سے بدلتی تھی　　رنگ ہجراں وصال کی صورت
لطفِ آغاز سے دکھاتا تھا　　سخن اُس کا مآل کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے　　انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے　　علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے　　غالب بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج　　اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا — رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع — رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بارِ احباب جو اُٹھاتا تھا — دوش احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی — اُسکی چپ سے جگر فگار ہے آج

دلمیں مدت سے تھی خلش جسکی — وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں — ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج

تلخیٔ غم کہی نہیں جاتی — جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر — ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقدِ معنی کا گنجداں نہ رہا — خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا

ساتھ اُسکے گئی بہارِ سخن — اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں سالار — کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونقِ حسن تھا بیاں اُس کا — گرم بازارِ گلرخاں نہ رہا

عشق کا نام اُس سے روشن تھا — قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں — گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہلِ ہند اب کرینگے کس پر ناز — رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نام ملوک — بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اُٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن
کسکو ٹھیرائیں اب مدار سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا — اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اُس نے ادا — پر کوئی اُس کا حقگزار نہ تھا
بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں — سخن اُس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذرِ سائل تھی جان تک لیکن — قطعہ — درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا — ۲ — جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا — دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے — زہد اُس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب — ہمنے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنٔی لفظ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں — آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیتِ حزن — ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں — اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی — ڈھونڈھتے کیا ہو سیبِ رُماں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش — گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں
گوش معنی شنو ہوا بے کار — مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں
نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر — سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت
آبِ حیوان پہ چھاگئی ظلمت

ہند میں نام پائیگا اب کون — سکہ اپنا بٹھائیگا اب کون
ہمنے جانی ہے اُس سے قدرِ سلف — اُن پر ایمان لائیگا اب کون
اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اُسکو دل سے بھلائیگا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجایش — وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون
اُس سے ملنے کو یھاں ہم آتے تھے — جا کے دلی سے آئیگا ابکون
مر گیا قدردان فہم سخن — شعر ہمکو سُنائیگا اب کون
مر گیا تشنۂ مذاقِ کلام — ہمکو گھر سے بُلائیگا اب کون
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک — ہمکو چالیں بتائیگا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالی — غزل اُسکی بنائے گا اب کون

مصرعِ ثانی اگر بیاں میں نہیں * کیا وہ اب عشق و مرجاں میں ہے

کم لنا فیہ من بکیٰ و عویل
و عناب مع الزمان طویل

۲۔ قصیدۂ نعتیہ

میں بھی ہوں حُسنِ طبع پر مغرور — مجھسے اُٹھینگے اُنکے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ — مجھسے برتر ہے میری طبعِ غیور
خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے — میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنو اہلِ عصر میں مجھکو — میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
چشمۂ آبِ خضر کی مانند — چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت — مجھکو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثلِ یوسفؑ دکھائے جوہرِ ذات — جسکو بکنا ہو مفت یہاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر ۱ — ہوں زمانہ کے ہاتھ سے مجبور
لُبک و قمری کو رخصتِ پرواز ۲ — بال و پرِ مفتِ صعوہ و عصفور

8 اس قصیدہ کی تمہید ۱۲۸۶ یا ۱۲۸۸ھ کے ہذیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلّی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن ذوق۔ آزردہ۔ غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھیں دنوں میں سیتا رام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوی سے لکھیں۔ جن دوستوں کی جا و بیجا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرہ میں نہ آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیساکہ شاعر اُن لوگوں کی بے التفاتی سے جنکو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدردان سمجھتا ہے۔ اُسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدہ کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے مُنہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیونکہ اُس زمانہ کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جسطرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعہ سے ہوتی ہے اسیطرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھگیا تو دفعۃً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا۔ لہذا قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے ۱۲

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اُس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور

لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اُسکو کیا قدرِ خوشۂ انگور

جسکے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روزِ روشن ہے یا شبِ دیجور

پہلے ہوگی کسی کو قدرِ ہنر
اُٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور

دردِ دل کا بیاں کروں کس سے
بات کھونی نہیں ہے مجھے منظور

سخنِ حق کی داد لوں کس سے
سُن چکا ہوں فسانۂ منصور

دلِ آباد مفتِ بے ہنراں
ہو چکا خانۂ ہُنر معمور

مژدہ خسرو کو وصلِ شیریں کا
ہو چکی سعیِ کوہکن مشکور

ہمنے دیکھی تمیزِ اہلِ نظر
ہمنے دیکھا مذاقِ اہلِ شعور

ہے غرض اِن کو صوتِ موزوں سے
نالۂ دل ہو یا نوائے طیور

ہو کسی شے سے اُنکی گرمیِ بزم
داستاں ہو وہ یا کہ درسِ زبور

ہے فقط روشنی سے انکو کام
موم ہو اصلِ شمع یا کافور

ہے یہاں قائلِ اَنا مردود
ہو وہ فرعونِ وقت یا منصور

آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ
دلِ اصحاب گو نہ ہو مسرور

یھاں اگر کام ہے تو شیریں سے
قصرِ خسرو کے اَور ہیں مزدور

دلِ احباب پر نہیں چلتا
سحر میرا کہ رہیو غیر سے دور

ہوں تماشائے شہرِ نابینا
ہے برابر مرا خفا و ظہور

دُرِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب	ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور
چشمہ پیدا او کارواں تشنہ	بادہ پر زور و انجمن مخمور
اس زمانے میں وہ غریب ہوں میں	جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور
صاحبِ قدر و جاہ ہے جبتک	کارفرما ہے چین میں فغفور
کاش اُس عہد میں مجھے پاتے	تھا سخن جب کہ قبلۂ جمہور
کاش وھاں دیکھتے مجھے کہ جہاں	متنبّی تھا مادحِ کافور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز	انوری ہے نہ عرفی و شاپور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار	مر گیا عندلیب[8] نیشاپور
جس سے ہوتا ہے خستہ سینہ ہوش	ہے زباں میری وہ دمِ ساطور
جس سے ہوتا ہے کور پروانہ	ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور
شرح نقطہ کی گر کروں تحریر	تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور
ترکِ عشقِ بتاں کریں عُشاق	مجھ سے سُن پائیں گر ستایشِ حور
گر کروں ذکرِ لذتِ طاعات	تلخ کر دوں مذاقِ فسق و فجور
چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد	دلِ خسرو میں ڈالدوں ناسور
کرنے جاؤں جو حق سے عذرِ گناہ	لے کے آؤں نویدِ عفوِ قصور
لوں ملائک سے دادِ حُسنِ کلام	گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

8 عندلیب نیشاپور سے مراد نظیری ہے ملیکن اگر وہ ہوتا تو اس سے زیادہ اور کیا قدر کرتا جیسا کہ شیخ علی حزین نے سودا کی نسبت کہا تھا کہ دھیوچ گویان

وہ شہنشاہ - اُمتی جس کا　　یھاں گنہگار اور وھاں مغفور
وہ خداوند - خدمتی جس کا　　یھاں سبکسار اور وھاں ماُجور
مژدہ اے اُمتِ ضعیف کہ یھاں　　سعی ہوتی ہے بے کیے مشکور
لبِ شیریں کلام سے اُس کے　　دوست بھی شاد غیر بھی مسرور
اثرِ فیضِ عام سے اُس کے　　کعبہ آباد و میکدہ معمور
چرخ کو دے اگر وہ حکمِ سکوں　　ہو غلط نسخۂ سنین و شہور
صرصرِ قہر گر چلے اُس کی　　بند ہو مسلکِ صبا و دَبُور
جس طرف ہو وہ گرمِ نظارہ　　جلوہ گر ہو اُدھر سے لمعۂ طور
ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن　　موجزن ہو وہاں سے چشمۂ نور
بات پوچھو تو سوئے چرخ نگاہ　　سینہ دیکھو تو علم کا گنجور
ہو سکے اُسکی خوبیوں کا شمار　　نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
اے ترا پایہ فہم سے برتر　　اے ترا نام عرش پر مسطور
میں ترے در پہ سُن کے آیا ہوں　　نام تیرا شفیعِ روزِ نشور
کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے　　مگر اُمیدِ عفوِ ربِّ غفور
طبع غالب ہی اور میں مغلوب　　نفس قاہر ہے اور میں مقہور
بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق　　نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور
چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن　　ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

مہرِ فرزند و خواہشِ زر و سیم   طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور

ایک بیمار اور سو آزار   ایک رنجور اور سو ناسور

نفسِ امارہ اور دیوِ مرید   یہ ہے اغوی تو وہ ہے کلبِ عقور

مجھسے جو کام چاہیئے لیجے   جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور

حسد و بغض و غیبت و بہتاں   بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور

ایک جو مجھسے بن نہیں آتی   ہے وہ خدمت کہ جسپہ ہوں مامور

دل لگے بندگی میں کیا امکاں   لب ہلے ذکرِ حق میں کیا مذکور

مایۂ عقل ہے نہ شورِ جنوں   دلِ بیتاب ہے نہ جانِ صبور

نہ معاصی میں تلخئ خجلت   نہ عبادت میں چاشنئ حضور

فی المثل ہے مری مسلمانی   جیسے زنگی کا نام ہو کافور

ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے   تیرے زمرے میں گر ہوا محشور

جب ترے کارواں میں جا پہنچا   پھر رہا بابِ خلد کتنی دور

دوریِ آستان والا سے   ہے بہت تنگ حالی مہجور

اب دعا یہ ہے اے شفیعِ امم   بسکہ بیتاب ہے دلِ رنجور

جا لگے تیرے در پہ کشتئ عمر   جب کروں بحرِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری

مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

۱۴ قصیدۂ مدحیۂ ناتمام

نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کی شان میں

ظلِ حق **کلب علیخاں** جسکے بذل و جود پر
ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا

صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکامِ دیں
زائرِ قبرِ نبیؐ اور حاجیِ بیت الہدےٰ

شاعری میں فرد موسیقی میں فارابیِ عصر
صوت روح افزا و صورت آیۂ صنعِ خدا

دولتِ برطانیہ پر اُس کی فرزندی کا حق
دولتِ عثمانیہ کو اُس سے پیوندِ وِلا

اُسکی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس
اور مروت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا

قطعہ

۱ مرجع اربابِ علم و فن ہے اُسکا بابِ فیض
یہ وہ دعوٰی ہے کہ خود دربار ہے اسکا گوا

۲ گلزمینِ ہند میں تھے جو درختِ باردار
اُن کو چُن چُن کر یہاں لایا چمن بندِ سخا

۳ گر مناظر ہیں تو ہیں سر دفترِ اہلِ کلام
اور محدث ہیں تو ہیں سرچشمۂ علم و ہدےٰ

۴ زمرۂ اہلِ یقیں یا مجمعِ اہلِ سلوک
نکتہ چینانِ محبطی خردہ گیرانِ شفا

۵ شاعرِ شیریں نفس یا شاطرِ سنجیدہ رائے
فیلسوفِ مستدل یا عارفِ علت رُبا

۶ بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اِس باغ میں یا
بلبلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا

؎ یہ قصیدہ ۱۳۰۱ھ میں اُس وقت لکھا گیا تھا جبکہ نواب ممدوح علی گڈھ کے مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے اور بارہ سو روپیہ سال کی جاگیر ہمیشہ کے لیئے مدرسہ کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپیہ نقد بطور چندہ کے دے چکے تھے مگر بمصلحۃ اُن کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لیئے ناتمام رہا۔ اسکے اول و آخر کے کچھ اشعار ضائع بھی ہوگئے ہیں ۱۲

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلادِ دور و دست — اے خوشا وہ سرزمیں جسپر ہو تو فرماں روا
بارِ محصولات سے یہانتک ہوئی ہلکی کہ اب — بارِ منت سے ترے پشتِ رعیت ہے دوتا
خیر تیری۔ ہے حصارِ عافیت تیرے لئے — سیر ہوکر تجھکو دیتے ہیں بہت بھوکے دعا
نعمتیں حق کی نہ ہٹینگی سمیٹی زینہار — ہر بھلائی کی ملی دہ چند گر تجھکو جزا
خوانِ نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم — نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ کا
ہے یقیں تجھپر پڑے اصحابِ محشر کی نگاہ — جب کہیں۔ کسنے کیا حق میزبانی کا ادا
دولت و اقبالِ روز افزوں سے تیرے ہی عیاں — جو کہ حامی قوم کے ہیں اُن کا حامی ہے خدا
پرورش پاتی تھی جسکے سایۂ دولت میں قوم — لے گئی اُن کو بہاکر موجِ سیلابِ فنا
کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر — ہند میں اب تکیہ گاہِ امتِ خیر الورےٰ
یہ اگر بنتے نہ کشتیبان اس طوفان میں — کشتی اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا
رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل — ورنہ اُن کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا
مل گئے تھے گوہرِ دُرجِ شرافت خاک میں — خاک سے تو نے اُٹھایا اُن کو اور بخشی جلا
ہو رہے تھے دودمانِ علم و دولت جاں بلب — تو نے ایک اک کے چوایا حلق میں آبِ بقا
کول میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم — آبیاری سے ہے تیری ہی اُسے نشو و نما
ہے یہ وہ احسان جسکے بارِ منت سے کبھی — قوم کی گردن نہ ہلکی ہوگی بے روے ریا
تیرے ظلِ تربیت میں گر رہا یہ نونہال — ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اسکی طوبیٰ سے سوا
فرض اگر کیجے اسے دیوارِ کاخِ آرزو — تو وہ پشتیباں ہے جس سے اُسکی قائم ہے بنا

اور اگر کہیے کہ ہے یہ قوم کی کشتِ مراد
تو ہے اُسپر ابرِ رحمت کی طرح چھایا ہوا

۵۔ قصیدۂ ناتمام مرقومہ ۱۲۹۴ھ ہجری

سرسید احمد خاں دام بقاؤہم کی شان میں

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ ورنہ یاں سے کب کا نکل گیا ہے

اسپر بھی اے عزیزو۔ ہے جائے فخر تمکو
دینوں میں دینِ بیضا حق نے تمھیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمھارا جو گھر ہے رب کا پہلا
ہادی ہے وہ تمھارا جو ختم انبیا ہے

دی ہے وہ مصلحِ کل حق نے کتاب تمکو
جسنے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے

بخشی تمھیں حکومت حکمت تمھیں عطا کی
دَوراں سدا موافق تمسے یونہیں رہا ہے

اِس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جسنے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اُسپہ قوم کے ہیں۔ وہ قوم کی سپر ہے
قوم اُس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

درہم سے اور قلم سے۔ دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اُسنے وہ کس سے ہو سکا ہے

۵۔ یہ قصیدہ اُس وقت لکھنا شروع کیا گیا تھا جب کہ مدرسۃ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سرسید کے کام تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ مگر بسبب تکدراتِ دنیوی کے پورا نہ ہو سکا۔

ہمدردِ قوم ایسا ہمنے سُنا نہ دیکھا ۔ یہ دردِ اُسکو جدکی میراث میں ملا ہے
تعلیم کی تمھاری بنیاد اُسنے ڈالی ۔ ملکوں میں جسکا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرونِ اولیٰ کسنے کیا بتاؤ ۔ سیّد نے کام اگرچہ قوم میں کیا ہے

۶۔ قطعہ مرتبہ ۱۳۰۳ھ ہجری

مرثیۂ مہیں برادرِ راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم

کل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھکے چپ چپ ۔ حالی سے کہا ہمنے کہ اے بحرِ معانی
خاموش کبھی ہمنے تجھے یوں نہیں دیکھا ۔ کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی
شادی میں تری تہنیتیں ہمنے سُنی ہیں ۔ ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی
ہنسنا ہے نہ رونا ہے نہ نالہ ہے نہ نوحہ ۔ کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تونے ہی ٹھانی
دنیا ہے یہ اک دارِ فنا۔ جس کا۔ اثاثہ ۔ سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی
ہو جائے گر انساں یونہیں ہر رنج میں خاموش ۔ کس طرح دلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی
اک آہ بھری سُن کے یہ حالی نے کہ جس سے ۔ دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی
فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ ۔ ساحل پہ ہیں جو راہ سپرِ قاصی و دانی
حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت ۔ مشکل ہے کہ سنگ دل کی عزیزوں کو دکھانی
آتے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے ۔ موت ایکسے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی ۔ غم بھائی کا مر جانے کی ہے اُسکے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کیطرح بھائی کو پالا — سوکھی ہوئی کھیتی ہیں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش سے سنبھالا — جس بھائی کے سایہ میں کٹی اُسکی جوانی
شفقت نے دیا جسکی بھلا مہرِ پدر کو — دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتا بھی رہا بھائی گر اُس بھائی کے پیچھے — لذت نہیں جینے سے نصیب اُسکو اُٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جسکا عزیزو — کیا ڈھونڈھتے ہو اُسکی طبیعت میں روانی
یہ چُپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ — یہ چپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی
بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں — یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لنگھانی
پر آہ۔ کلی وہ جو ہے مُرجھا گئی دل کی — مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپ ہمیں کھلانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر — ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

۷۔ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۵ ہجری

بجناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض — کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے — اُس نے ممتاز کیا بھیجکے شاہی فرماں
نہ ہوئی مجھسے کوئی خدمتِ سرکارِ نظام — نہ کیا میں نے کبھی طوف درِ صدرِ زماں
نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لایقِ قدر — اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں
حق نہ تھا دولتِ عالی پہ کوئی حالی کا — جسکے جلدو میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں

ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں
ہیں مربی ہنر و بے ہنری کے جسطرح خار و گل دونو کو کرتا ہے نہال آب رواں
آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار ملک میں اُسکا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جواں
یہاں وہ اُن کھیتیوں کو دیکے گیا ہی پانی آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں
قوم اِسوقت ہی تعلیم کی جتنی محتاج ہے وہ عالم پہ ہویدا۔ نہیں محتاج بیاں
عزت۔ آسودگی اور ملت و مذہب اُن کا ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں
پھر نہ قدر اُنکی کچھ آنکھوں میں خلائق کی بلند اور نہ وزن اُن کا ترازو میں حکومت کی گراں
آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے درد کا جان لیا اُن کے کہ یہ ہے درماں
مدرسے قوم کے اِس ملک میں جو ہیں ممتاز جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشاں
اُن کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم چشمِ عالم میں مسیحائی پہ اپنی بُرہاں
کرتے ہیں زندۂ جاوید بنی نوع کو۔ جو بذل کرتے ہیں پئے تربیتِ اہلِ زماں
ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی۔ جس کا ملک پر قوم پہ تا دیر رہے گا احساں
یہی بخشش ہے یہی جود ہے راس الحسنات جس پہ موقوف ہے بہبودیِ نسلِ انساں
یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں
یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں
دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل کی ہمیشہ کے لئے ایک نے وھاں نہر رواں
اُس کی خواہش تھی کہ ہوتے ہیں پیاسے سیراب اِس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں

برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں — نہر جاری سے ہے ذات انکی سوا فیض رساں
بخت اُس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر — حامیِ علم و خریدارِ کمالِ انساں
اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جبتک — شکرِ احسان کا کرتے رہیں بعد از احساں
آسماں جاہ سے ہو تقویت ملکِ دکن — اور رہے ملک دکن ملجا و ماوائے جہاں
دولتِ قیصری و دولتِ آصفجاہی — ایک کی ایک زمانہ میں رہے پشتیباں

۸۔ قصیدہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۶ ہجری

تہنیت عید الفطر۔ بہ جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا — خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا
کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے — کہ اپنے صبر کا انعام ہمنے بھر پایا
رہینِ منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام — کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا
گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش — کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا
شگفتہ آتے ہیں اسطرح عیدگاہ سے لوگ — کہ گنج اُنھوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا
حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج — کہ دن خدا نے نمائش کا اُن کو دکھلایا
عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم — خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا
حکیم ہیں متفکر نہ زاہد افسردہ — خوشی نے دی ہے زمانہ کی کچھ پلٹ کایا
غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کھال میں مست — ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چکھوایا

اُدھر ہے فصلِ بہار اور اِدھر ہے عید الفطر ۔۔۔ سماں نشاط کا ہی شہر و دشت پر چھایا
کھلے ہیں اُس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول ۔۔۔ جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہے کمُلایا
ہزاروں سروِ خراماں ہیں شہر میں ہر سو ۔۔۔ جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مرجھایا
اگر خوشی کا زمانہ کی ہے یہی عالم ۔۔۔ تو سمجھو غم کا عوض غمزدوں نے بھر پایا
مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب ہیچ ۔۔۔ اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اِترایا
فریفتہ ہوئے جو ایسی ایسی خوشیوں پر ۔۔۔ اُنھوں نے آب کا دھوکا سراب پر کھایا
خوشی ہی جس سے عبارت وہ ہی خوشی اُنکی ۔۔۔ جنھوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا
جنھوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما ۔۔۔ جنھوں نے علم کا بجھتا چراغ اُکسایا
جنھوں نے مُلک کے امراض کو کیا تشخیص ۔۔۔ جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا
جنھوں نے خُلق سے اپنا بنایا غیروں کو ۔۔۔ جنھوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا
خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم ۔۔۔ کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا
ہوا زمین پہ جس سال آسماں مُمسِک ۔۔۔ رہینہ اپنی داد و دہش کا اُنھوں نے برسایا
ہوائے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد ۔۔۔ فضائے دہر کو خُلقِ حَسَن سے مہکایا
سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار ۔۔۔ لیا سنبھال اُسے جس نے ہاتھ پکڑایا
ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا ۔۔۔ نہ مانگ سکتے تھے جو اُنکے گھر پہ پہنچایا
نہ سمجھا آپ کو اک پاسباں سے بڑھکر ۔۔۔ اُنھوں نے لطفِ حکومت اِسی پر کچھ پایا
نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے ۔۔۔ ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وغا میں شیر مگر وقتِ رحم موم ضعیف | کسی کی آہ سُنی اور دل اُن کا بھر آیا
وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج | جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا
وہ چونک اُٹھے کہ گویا قیامت آپہنچی | جو در پہ آکے کوئی دادخواہ چلایا
نشاط و عشرتِ جاوید کی ہے اُنکو نوید | دل ایسا جنکو عنایت خدا نے فرمایا
سُنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف | سو آنکھ سے وہ **وزیرِ دکن** نے دکھلایا
بشیرِ دولت و دیں صدرِ اعظم اُمرا | نہیں ہے جسکا کوئی قربِ شہ میں ہمپایہ
جو ظلِ حق ہے رعیت کے سر پہ **شاہِ دکن** | تو **اعظم الاُمرا** ظلِ حق کا ہے سایہ
ہمیشہ جسکو ہے بہبودِ ملک مدِّ نظر | رفاہ و امن ممالک میں جسنے پھیلایا
اُٹھایا فتنہ نے جب سر فرو کیا اُسکو | پڑا عمل میں جہاں عقدہ اُسکو سلجھایا
بنائے نظم و نسق جسنے رکھی شوریٰ پر | مشیرِ کارِ خرد پروروں کو ٹھیرایا
دکن کو جسنے کیا مرجعِ خواص و عوام | **دکن** کا جسنے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا
نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرماں | جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا
بل انتظام کے رشتہ میں پڑ رہے تھے بہت | سو تکلے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا
لگا گئے تھے وزیرانِ رفتہ جو پودا | وہ صاحبی میں وزیرِ زماں کی پھل لایا
ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے **بلدہ** نے | کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہی شرمایا
زبانِ حال سے ماضی کو دیکھیے کیا نسبت | اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا
خدا دراز کرے عمرِ **اعظم الاُمرا** | **دکن** کو جسکی حکومت نے دن یہ دکھلایا

زمیں پہ سایہ فگن جب تک آسمان رہے
رہے دکن پہ حضورِ نظام کا سایہ

تھی کوئی چیز نہ حالی کے پاس لائق نذر
سو یہ چگانہ ناچیز پیشکش لایا

یہی بس اُسکے لئے ہوگا مایۂ نازش
جو اعظم الاُمرا نے قبول فرمایا

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۹ ہجری

تہنیت ولادت فرزند ارجمند در شبستان اقبال جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

فیضِ رب ذو المنن سے. مژدہ اے اہل دکن
نائبِ دولت کا نخلِ آرزو لایا ثمر

دی بشیر دولت و دیں کو وہ چیز اللہ نے
جس سے پایا دیدۂ یعقوبؑ نے نورِ بصر

جسکو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہ نے
حق نے دی جسکے عطا ہونے کی سارا کو خبر

جسکے ملنے سے ہوا داؤدؑ ممنونِ قضا
جسکے پانے سے ہوا ایوبؑ مرہونِ قدر

جسکے بدلہ میں علی الرغمِ شماتت پیشگاں
حق سے ختم الانبیاؑ نے پائے شبیرؑ و شبرؑ

جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی
جو ہے حاصل عمر کا اور زندگانی کا ثمر

جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز
جس سے ہیں اجداد زندہ اور اماجد نامور

صدرِ اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خلف
خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر

یہ پسر یارب بحقِ عترتِ خیر الورے
پائے عمرِ خضر زیرِ سایۂ مہر پدر

صدرِ اعظم کیطرح دربارِ آصف جاہ میں
جایگاہِ قربِ سُلطانی ہو اُس کا مُستقر

دولت و ثروت کو اُسکی ذات سے لگجائی شان
زیورِ علم و ادب سے ہو مُحلّی اِس قدر

سیرت و عادت میں اُس کی نکلے آن اجداد کی ۔۔۔ جوہر اخلاق فاروقی ہوں اُسمیں جلوہ گر ¹

ملک آصف جاہ میں سر آسماں جاہ اور وہ ۔۔۔ رات دن رکھیں اُجالا صورتِ شمس و قمر

۱۰۔ قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۹ہجری ²

اے صفر کی دوسری ۔ روز دوشنبہ مرحبا ۔۔۔ ہم نہ بھولینگے کبھی وہ تیری صبحِ جانفزا

ہمنے رکھا آکے جب بلدہ کی سرحد میں قدم ۔۔۔ پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

عزتِ قومی ۔ ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے ۔۔۔ اُسکے کچھ آثار دیکھے ہمنے یہاں بشکرِ خدا

کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم ۔۔۔ آکے بلدہ کے سوانہ میں لگا اُس کا پتا

بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے ۔۔۔ جھولیاں ڈالے گلے میں دربدر دیتے صدا

پہنچے لینے اُن کو وہ اعیان دار الملک سے ۔۔۔ دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا

قوم کو ہے جنپہ فخر اور ملک کو ہے جنپہ ناز ۔۔۔ سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قوے

صدرِ اعظم (یعنی مدار المہام ۱۲) نے ہمیں بخشا اقامت کے لیئے ۔۔۔ وہ سرا بستاں خجل ہو جس سے جنت کی فضا

ہم غریبوں کو سمجھکر اک سفارت قوم کی ۔۔۔ دی وہ عزت بشکر جسکا ہو نہیں سکتا ادا

پیشتر مہماں نوازی کا فقط سُنتے تھے نام ۔۔۔ آکے یہاں سمجھے کہ ہے مہماں نوازی چیز کیا

---

¹ اس میں یہ اشارہ ہے کہ نواب سر آسماں جاہ بہادر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں ۱۲

² یہ قصیدہ ۱۸ ستمبر ۱۸۹۱ء مطابق صفر ۱۳۰۹ ہجری میں بمقام حیدرآباد دکن جب کہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مع اکثر رفقائے جن میں سے ایک راقم بھی تھا بطور ڈپوٹیشن کے محمڈن کالج علی گڈھ کی طرف سے حضور سرکار نظام میں حاضر ہوئے تھے ایک جلسہ عام میں پڑھا گیا تھا ۔ جسکے صدر انجمن جناب نواب وقار الامراء بہادر تھے ۱۲ حالی

کی ہے نواب اقتدار الملک نے جو مرحمت
اُس نے کلفت کو سفر کے دل سے بالکل دھو دیا

یہ مقولہ ہند میں مدت سے ہی ضرب المثل
جو کہ جا پہنچا دکن میں۔ بس وہیں کا ہو رہا

ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری
جو دکن میں آکے دیتی ہے وطن دل سے بھلا

وارثِ ملکِ دکن ہے آج وہ محبوبِ خلق
نام پر دیتا ہے جسکے جان ہر چھوٹا بڑا

ہم کہ ہیں وکٹوریا کے عہدِ رافت میں پلے
امن و آزادی کی ہمنے کھائی ہے برسوں ہوا

جانتے ہیں ہم کہ پلتی ہے رعیّت کسطرح
کسطرح ہوتے ہیں مقبولِ جہاں فرمانروا

کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیرِ قلوب
کسطرح بوتے ہیں دل میں خلق کے تخمِ وفا

کر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر
تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اُس نے ادا

ہے یہی شاہِ دکن کی گلہ بانی کی دلیل
گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا

پوچھنے پچھنے کی اہلِ ملک سے حاجت نہیں
اُن کی خوشحالی پہ اُن کی تازہ روئی ہے گوا

دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار
خلق کو سرسبز دیکھا آکے یہاں اُنسے سوا

راہ میں دیکھے تھے ہمنے کوہ اگر گردوں شکوہ
آکے دار الملک میں دیکھے محل گردوں[8] نما

عاملوں کی سخت گیری سے ہیں سب آزاد یہاں
بینوا سے مُنعم اور مُنعم سے بڑھکر بے نوا

اغنیا میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں
جیسا بے پروا نظر آتا ہے یہاں ایک اک گدا

جتنی یہاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول
بے تعصُّب بے تکلُّف بے تصنُّع بے ریا

ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک
ایک کی تقریب میں ہمدم ہیں سب اور ہم نوا

8 یہ اشارہ ہے اُس محل کی طرف جو کہ نواب وقار الامرا بہادر نے بلدۂ حیدرآباد کے باہر جانب جنوب پہاڑ پر زرِ خطیر صرف کرکے اپنے رہنے کے لیے بنوایا ہے اور اُسکا نام فلک نما رکھا ہے ۔

دولتِ عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیئے
ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یہاں دوسرا

پارسی ہندو مسلماں یا مسیحی کوئی ہو
ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ہمکو یہاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ
رہگذر کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا

قصہ کوتہ ۔ بار جب ہمکو ملا دربار میں
کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا

دیکھکر اپنی رسائی تختِ آصف جاہ تک
واقعہ مور اور سلیماں کا ہمیں یاد آگیا

حضرتِ والا نے جس شفقت سے کیں نذریں قبول
اس پہ گر جاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہی بجا

جس توجہ سے سُنی رودادِ قومی درسگاہ
شکر سے اُسکے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برآ

جب سے کالج کی علیگڈھ میں بنا ڈالی گئی
دولتِ عالی ۔ مدد کرتی رہی اُس کی سدا

جو لگایا تھا درخت اُس کی ہمیشہ لی خبر
دمبدم پانی دیا یہاں تک کہ بارآور ہوا

اب ۔ کہ وقت آکر پڑا تھا بانیِ کالج پہ سخت
دولتِ عالی نے شرطِ دستگیری کی ادا

مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اوّل کل
کی اُسی دریادلی سے اُن کی پھر حاجت روا

خود علی گڈھ کالج اور اُس کے درو دیوار سب
راگ گائیں گے سدا احسانِ آصف جاہ کا

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تلک اسلام کی
جیتے جی ہوں گی نہ اُسکے طوقِ منت سے رہا

کی ہے سر سیّد نے جو کوشش فلاحِ قوم میں
اُس کو ہے اے اہلِ مجلس اک زمانہ جانتا

پر یہ سچ ہے سیّد سے بیڑا پار ہونا تھا محال
دولتِ عالی اگر بنتی نہ اُس کی ناخدا

تھا پڑا اسیّد کا ۔ سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز
دولتِ عالی نے اُس خشکی میں گنگا دی بہا

ہے روایت ۔ جبکہ ہجرت کر کے ختم المرسلینؐ
پہنچے یثرب میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

"جسطرح ہوتی ہے بانبی سانپ کی جائے پناہ — ہو گا ملجا اب مدینہ بھی یونہیں اسلام کا"
ہے بلا تشبیہ ۔ دار الملک آصف جاہ بھی — ہند میں اب مرکزِ اسلام بے رو و ریا
ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستاں میں انتخاب — دولتِ عالی نے چُن چُن کر لیا سب کو بلا
تربتیں اور خانقاہیں ۔ مدرسے اور مسجدیں — سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون و چرا
حجِ بیت اللہ سے ۔ جو ہر مسلماں پر ہے فرض — ہے دکن آنا مقدم ۔ شک نہیں اس میں ذرا
اول آنا چاہیئے یہاں استطاعت کے لئے — کیونکہ ہے بے استطاعت حج کو جانا ۔ ناروا
خرچ سے ہاتھ اک مسلماں کا ہو گر اتر میں تنگ — ہے دکن کی سمت وہ گردن اُٹھا کر دیکھتا
خواب آتے ہیں دکن کے اُسکو سوتے میں نظر — قوم کا بچہ مڈل سے جب ذرا آگے بڑھا
ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں — اور مدد کو جن کی وہاں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا
چلتے چلتے اُن کی گاڑی بھی اٹک جاتی ہے جب — کھینچنے کو اُسکے جاتا ہے یہیں سے ہینڈیا[8]
ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یاں وہ مثال — اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں بپا
تھا جہاز اک اُسمیں معمور اہلِ فضل و جاہ سے — لطمۂ امواج نے پُرزے دیئے اُسکے اُڑا
ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اُچھلے نہ پھر — بچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست و پا
کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں اُن کو نظر — اُس محیطِ بیکراں میں ایک زورق کے سوا
ہے وہ زورق فی المثل سرکار آصف جاہ کی — ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جسکا آسرا
ہے دعا ۔ جسوقت تک پانی سمندر میں رہے — یارب اس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا

8 جب گاڑی یا چھکڑا بیلوں سے نہیں کھنچ سکتا تو بیلوں کی جوڑی کے آگے تیسرا بیل لگا دیتے ہیں اسکو ہینڈیا کہتے ہیں ۱۲

ختم کر حالی سپاسِ صدرِ اعظم پر سخن ۔۔۔ بال بال اپنا ہے جسکے شکر میں جکڑا ہوا
تقویت سے جس کی ہر مشکل ہماری حل ہوئی ۔۔۔ انجمن کے منعقد ہونے کی دی جسنے رضا
پھر ادا کر جان و دل سے شکرِ صدرِ انجمن ۔۔۔ جسکے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا
جسنے قومی انجمن میں بن کے صدرِ انجمن ۔۔۔ قوم کو دی عزت اور اُنکی اُمیدیں دیں بڑھا
لیکے اذنِ صدرِ مجلس کیجے پھر قصدِ وطن ۔۔۔ ورنہ ہے حالی دکن کی دلفریب آب و ہوا
باندھ لیجے جلد اب رختِ سفر۔ ڈر ہے کہ ساتھ ۔۔۔ قافلہ سے چھٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

۱۱۔ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۹ ہجری 8

بمقام حیدرآباد دکن

یہاں بُلا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے ۔۔۔ اول اُسکا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں
خدمتِ والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے ۔۔۔ عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں
شاعری جسکو سمجھتے ہیں کمال ابنائے دہر ۔۔۔ جو لیاقت اُسمیں ہے درکار وہ ہم میں نہیں
شکر کرنا تھا ہمیں سرکارِ عالی کا ضرور ۔۔۔ چند نظمیں انجمن میں اسلیئے ہمنے پڑھیں
گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت ۔۔۔ اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں

8 سنہ ۱۳۰۹ ہجری میں جو راقم اور مولانا محمد شبلی نعمانی اور دیگر بزرگانِ قوم آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر کے ہمراہ علیگڈھ محمڈن کالج کی طرف سے بطور ڈیپوٹیشن کے حیدرآباد دکن میں بحضور سرکار عالی نظام حاضر ہوئے تھے اُس موقع پر ایک عام جلسہ بصدارت نواب وقار الامراء بہادر بشیر باغ میں منعقد ہوا تھا۔ جسمیں راقم نے اور مولانا محمد شبلی اور بعض اور صاحبوں نے کچھ نظمیں سرکار عالی کے شکریہ میں پڑھی تھیں جلسہ کے بعد جناب صدر انجمن نے مجھکو اور مولانا محمد شبلی کو خاص طور پر ہماری نظمیں دوبارہ سننے کے لیئے دولتخانہ پر طلب فرمایا تھا وہاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اُسیوقت موزوں کیا گیا تھا راقم نے پڑھا تھا۔

رہ گیا پر ہمسے اس کوشش میں باقی اِک قصور | در گذر فرمائینگے سرکار اُس سے۔ ہے یقیں
اَور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں۔ مگر | جھوٹ۔ جو اشعار کا زیور ہے وہ انمیں نہیں

۱۲۔ قطعہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ ہجری بمقام حیدر آباد

در شکر اضافہ وظیفہ بہ پیشگاہ جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر

اے بشیر دولت و دیں۔ نائب شاہِ دکن | اے مہمات دکن کا ذات پر تیری مدار
مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے | شکر اُسکا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار
جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے | پہلے ہو لیتے ہیں صدہا مشکلوں سے وہ دوچار
کوئی دنیا میں نہیں ہوتی بغیر اسکے فتوح | ہے اسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار
پر۔ ملا مقصود جب حالی کو اِس در سے ملا | بے تردُّد۔ بے تذلُّل۔ بے طلب۔ بے انتظار
قدردانی گر زمانہ میں یونہیں ہو جائے عام | پائیں بے مانگے مرادیں اپنی سب اُمیدوار
یارب اس سرکار کو۔ ہی جس سے عالم فیضیاب | جب تلک دنیا رہے دنیا میں رکھیو برقرار

۱۳۔ ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۱ء عیسوی مطابق ۱۳۰۹ھ ہجری

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں بمقام علی گڈھ پڑھا گیا

شُکر اس نعمت کا یارب کر سکے کیونکر زباں | تو نے رکھا ہمکو یہاں فقر و غنا کے درمیاں

اس نظم میں متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیا دونو کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلف ہلپ سے دولت عزت نیکنامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کرکے اپنے ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا ہو اور نے درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں بڑھ سکتے۔ اعلےٰ درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت و عزت

جب ہوئے بھوکے تو بخشی تو نے نان و نانخورش — پر نہ اتنی۔ معدہ و احشا پہ جو گزرے گراں

جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک — پر نہ ایسا۔ ہو صراحی جس کی یاروں سے نہاں

ڈھانکنا چاہا بدن جب۔ تو دیا تو نے لباس — پر نہ ایسا۔ جس کو حسرت سے تکیں خرد و کلاں

کھانے پینے کو کئے برتن ہمیں تو نے عطا — پر نہ ایسے۔ ٹوٹنے سے جنکے ہو خوف زیاں

سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں — پر نہ ایسا۔ جس سے اُٹھنا ہو طبیعت پر گراں

رہنے سہنے کو دیئے گھر تو نے ہمکو ہر جگہ — پر نہ ایسے۔ ہو تعلق جنسے مثلِ جسم و جاں

آنے جانے کو دیئے دو پانو یہاں تو نے ہمیں — جنسے ڈر ہے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں

راہ اور بے راہ یکساں جنکو ہنگامِ خرام — کوہ سدِ راہ جنکا اور نہ خندق اور کُواں

کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر — پر نہ ایسی۔ تختِ فرعونی کا ہو جسپر گماں

سیم و زر وقتِ ضرورت ہمکو تو دیتا رہا — پر نہ اتنا۔ ہو نگہبانی میں جسکی بیمِ جاں

آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز — پر نہ ایسی۔ جس سے ہوں محسودِ ابنائے زماں

نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں — تاکہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہمپر عیاں

راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد — تاکہ کھو بیٹھیں نہ ہم اُن راحتوں کو رائگاں

وقت پر کرتا رہا باران رحمت سے نہال

قحط اور طوفان دونو سے بچایا بال بال

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر — لومڑی جاتے ہیں بن جسکی بدولت شیرِ نر

چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیہ — ناکسوں کے ناز بیجا سہتے ہیں اہلِ ہنر

وزن میں علم و فضیلت جن کے ہے ہم سنگ کوہ — وہ سبک تر دانۂ خردل سے آتے ہیں نظر

فقر و حاجت میں نہو انساں کو جب صبر و شکیب — پھر نہیں کوئی بُرائی فقر و حاجت سے بتر

بھیک منگوائے جُوا کھلوائے یہ چوری کرائے — پت گنوائے آبرو کھوئے پھرائے دربدر

ہو سکے محتاج سے طاعت نہ یاد اللہ کی — لے سکے محتاج جورو کی نہ بچوں کی خبر

گہ زباں آلودہ اُس کی شکوۂ تقدیر سے — اور کبھی بوچھاڑ اُس کی آسمان پیر پر

گر بخیلوں کی مذمت پر کبھی آجائے وہ — ہو نہ سبّ و شتم سے سیری اُسے دو دو پہر

اُگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ — کھولدے غیبت کا دفتر اہلِ دولت کی اگر

گہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے — تاکہ دولتمند بھی کچھ دن رہیں آسیمہ سر

اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب — تاکہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر

بے حلاوت اُسکی دنیا اور مذبذب اُسکا دیں — خوفناک اُسکا ارادہ نیت اُس کی پر خطر

رات اُسکی حسرت آگیں اور دن اندوہگیں — شام اُس کی پر نحوست اور شوم اُسکی سحر

گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا — تھا۔ مگر ثروت میں اُس سے بھی زیادہ شور و شر

فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت سوا اسکے شکر کی طاقت نہیں

نشۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں آنا محال — اِس مےِ مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال

نفسِ اماره اور اُسپر چھیڑ مال و جاه کی — ڈھیر ہے بارود کا دیجے پتنگا جسمیں ڈال

بادِ صرصر آگ کو اسطرح بھڑکاتی نہیں — جسطرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال

ہضم کرنا اور پچانا مال و دولت کا ہے بس
نفس انساں میں اگر بالفرض ہی کوئی کمال

ورنہ مال وجاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم
اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال

عقل ٹھیراتی ہے جو افعال انساں پر حرام
کردیئے اُسکے لیئے سب مال و دولت نے حلال

فقر میں تھا نفس دوں وا ماندہ جس پرواز سے
آگئے ثروت نے دیئے پر واسطے اُسکے نکال

خواہشیں یوں نفس میں اب دمبدم بڑھنے لگیں
مغز میں جسطرح دیوانہ کے گوناگوں خیال

آپ کو گننے لگا بالاتر از ابنائے جنس
چیونٹوں میں ایک نے گویا نکالے پر و بال

مُسرفِ بے زر ہو جیسے قرضخواہوں میں گھرا
خواہشوں میں اسطرح جکڑا ہوا ہی بال بال

جُھک پڑی طبع دَنی گر بخل و خسّت کی طرف
ہوگئی فرزند و زن پر زندگی اُس کی وبال

اور اگر بھوت اُسکے سر پر چڑھ گیا اسراف کا
پھر نہیں گنجینۂ قاروں کچھ آگے اُسکے مال

آگیا غالب طبیعت پر گر استسقاے حرص
ہے سمندر سے بھی اُس کی پیاس کا بجھنا محال

باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اسقدر
جسقدر ثروت میں ہے دشوار پاس اعتدال

گلشن دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر
دیکھ اے روباہ نفس دوں خذر اُنسے حذر

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنہ سے بری

چین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہی
یہ جو ہے برزخ میان مکنت و دست تہی

فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ اور جنت اگر
مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی

وصل شیطاں کا ہو جسمیں ایسی جنت کو سلام
منزل اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

اِس کٹھن منزل میں ہے بُنیا یہی اک بے خطر | ہیں ادھر کھڈ اور چڑھائی ہے اُدھر البرز کی

رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بَین بَین | ہیں حسد اور کِبر کے امراضِ مُہلک سے بری

اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک | دیکھکر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل دہی

سُنکے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و ناز | مِلکے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گرخنا کبھی

لذّتِ فقر و غنا دونو سے ہیں وہ آشنا | اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی

جو گذرتی ہے گدا پر اُس سے ہیں وہ باخبر | کیونکہ حالت گاہ گاہ اُنپر بھی گذری ہے یہی

امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے | کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی

اِس لیے جب دیکھتے ہیں عُسرتِ ابنائے جنس | جوشِ ہمدردی سے بیکل اُن کا ہو جاتا ہے جی

اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا | جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی از خود رفتگی

مست کی بے اختیاری تشنگی مخمور کی | واردات ایک ایک کی ہے سربسر اُنپر کھلی

جنّت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر
گندم اور زقّوم دونو اُنکے ہیں پیشِ نظر

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت انسے ہے | منتظم ہر قوم و ملّت کی جماعت انسے ہے

مشکلیں اکثر انھیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل | بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت انسے ہے

ہے انھیں کے دم سے جو ہے گرمیِ ہنگامہ آج | ساری قومی مجلسوں کی زیب و زینت انسے ہے

ہے جہاں دولت یہی ہیں نظمِ دولت کے کفیل | ملک کی دولت میں ہی جو خیر و برکت انسے ہے

ہاتھ میں انکے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام | عقل و دانش میں ہی جن ملکوں کی شہرت انسے ہے

ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر — شاہ ہوں یا ہوں گدا دونو کو قوت انسے ہے

آدمیت سیکھتے ہیں انسے سب چھوٹے بڑے — نوعِ انساں ہیں بقائے آدمیت انسے ہے

یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یہاں — رونقِ بازارِ جنسِ علم و حکمت انسے ہے

پاؤگے انمیں طبیب انمیں ادیب انمیں خطیب — ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت انسے ہے

پاؤگے ان میں مہندس پاؤگے انمیں حکیم — آدمی بمصداق رحمانی خلافت انسے ہے

کرتے ہیں اخلاق ادنےٰ اور اعلےٰ انسے اخذ — آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت انسے ہے

ان میں قوموں کے ہیں مصلح انمیں ملکوں کے وکیل — آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت انسے ہے

پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں — ہے جہاں قوموں میں یکرنگی و وحدت انسے ہے

دم سے ہے وابستہ انکے قوم کا سارا انتظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

گر نہ ہو ہر حال میں ان کی مصالح پر نظر — ہیں مفاسد گرد و پیش انکے فراہم سربسر

کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں — ہے انھیں بھی شر سے یہاں بچ بچ کے بِتانا عمر بھر

گھاٹیاں فقر و غنا کی انکے ہیں دونو طرف — اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر

ایک جانب پستی فطرت ہے اور دُوں ہمتی — ایک جانب مستی و غفلت ہے اور کبر و بطَر

جھک پڑے گر اسطرف تو مُفت کھو بیٹھے اُنھیں — وہ جو اُڑنے کے لیئے حق نے دیئے تھے بال و پر

ڈھل گئے گر اُسطرف تو اُس بلا میں پھنس گئے — جسمیں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر

برکتیں اللہ کی اُس قوم پر جس قوم میں — رہ سپر یہ طبقۂ والا ہو سیدھی راہ پر

ہیں معطل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست
سب کی پڑتی ہے انھیں کے دست و بازو پر نظر

جو قُوے اُن کو ملے ہیں کام میں لائیں اُنھیں
تاکہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی بسر

فرض ہیں جو انکے ذمّہ خالق اور مخلوق کے
اُن میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آٹھوں پہر

قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اُسے
کیونکہ اُسکے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر

گو نجاتِ انساں کو مکروہاتِ دنیا سے نہیں
جیسے بچتا گوشت سے ناخن چھٹاتا ہے مگر

کام دنیا میں سنوارے ہیں جنھوں نے قوم کے
تھے نکموں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر

سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے کام
اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر

جسطرح اس انجمن کے رُکن آئے ہیں تمام
قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جان آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی

اتفاق قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل
رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی

مال و دولت نامبارک ہے نہو گر اتفاق
قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہی یہی

یہاں وکیل ایک اک ہے شہر اور ملک کا قایم مقام
دانہ کو کرتی ہے جو خرمن وہ برکت ہے یہی

رایگاں جائے گا یاروں کا نہ یہ رنجِ سفر
راحتیں جس کی طفیلی ہیں وہ زحمت ہے یہی

فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں ہو کے مجتمع
ملتے ہیں جس کی بدولت دل وہ ملت ہے یہی

تم ہمارے کام آؤ ہم تمھارے آئیں کام
جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی

قوم کی خدمت میں ہے مُضمر ربوبیت کی شاں
جو کہ پجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز ملک میں عزت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی

سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی

کر رہا ہے قوم کے سنڈل کو یہ مجمع وسیع جزر سے افزوں ہے مد جسکا وہ رجعت ہے یہی

اتفاقاً گر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد ڈر نہیں اسکا کہ خود قانون قدرت ہے یہی

ہے کبھی افراطِ باراں اور کبھی ہے قحطِ آب طینتِ عالم میں خاصیت ودیعت ہے یہی

کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلت ہے یہی

دیگ تو پکتے ہی پکتے کی دھیمی آنچ میں کچھ اُبال آیا تو ہے اُسمیں غنیمت ہے یہی

انجمن ہے قوم کی ہنگامہ شادی نہیں

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

۱۴۔ مسدّس مرتبہ سنہ ۱۳۰۱ ہجری

مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی

اے جہان آباد۔ اے اسلام کے دار العلوم اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم

تھے ہنرور تجھ میں اتنے۔ جتنے گردوں پر نجوم تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھکو جہان آباد کا

نام روشن تجھسے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علم دیں جیسے اُمتی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں جو تھا مُحدِّث تھا وہ تیرا خوشہ چیں ۔۔۔ تھی محدِّث خیز اے پاتخت تیری سرزمیں

تھا القفقہ بھی مسلم تیری خاکِ پاک کا

بیہقیِ وقت تھا ایک اک فقیہ اِس خاک کا

شاذ و نادر تھا تصوّف میں کوئی تیرا نظیر ۔۔۔ آب و گِل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر

تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہرِ منیر ۔۔۔ تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مُستنیر

آج جس دولت کا بازار جہاں میں کال ہے

تیرا قبرستان اُس دولت سے مالامال ہے

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم ۔۔۔ آن کر اُسنے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم

جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم ۔۔۔ بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی

شہر شہر اس جنس کی یہاں تجھسے ارزانی ہوئی

خاک سے اُٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور ۔۔۔ اک جہاں شیوا بیانی سے ہے اُن کی باخبر

راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر ۔۔۔ سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر[8]

حُسنِ صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد[+] تھا

حُسنِ معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم ۔۔۔ جنمیں تھی اسلامیوں کی چارسو عالم میں دُھوم

---

8 غاتفر سمرقند کے قریب ایک قطعۂ زمین ہے جہاں کا سرو خوبیِ زیبائی و راستی میں ضرب المثل ہے ۱۲ + نوشاد اور ختن دو شہر قدیم ترکستان میں تھے جو حسن خیزی میں مشہور تھے

دولت واقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم   کھیتیوں پر تیری آ کر آتے تھے اُٹھ جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں

تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جسطرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام   تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہورِ انام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام   شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں

طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال   ڈھل گئے سانچے میں گویا اُسکے عادات و خصال

آکے بن جاتا تھا یھاں نقصان انساں کا کمال   تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال

آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یھاں

چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یھاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب   آن کر لیتے تھے یھاں ٹھیکی جہاں کے انتخاب

بستے تھے اطراف سے آآکے تجھ میں شیخ و شاب   کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جمگھٹا تھا تجھ میں تُرک و فُرس و رُوم و زنگ کا

دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبع دوراں کا ہے جیسے اقتضا   ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا

جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا   وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آگیا

گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار
تجھ پہ اے دار الخلافت انقلاب آنے لگے — غیب سے تجھکو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالعِ شفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے — تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دار العلوم اُٹھنے لگا علم و ہنر
ہو گئے تیرے مُحدِث راہیِ دار السلام — کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام — رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام
مجلسیں برہم ہوئیں یروز بر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے
چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب — مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب — اس گلستاں سے نہ اُٹھی پھر صدائے عندلیب
جنکو کھو بیٹھے نظیر اُن کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اُسکا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر
کر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سفر — گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
جھڑ گئے تاجِ شرف سے تیرے سب لعل و گہر — تجھ کو اے دار الخلافت کھا گئی کس کی نظر
علم ہے باقی نہ اب دولت ہی تیرے پاس وہ

اے گل پژمردہ تیری کیا ہوتی بو باس وہ

دورِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا   بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یہاں تیری پھر اُگلے وہ لعل بے بہا   جس سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا
عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی   پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گذاری تیرھویں تو نے صدی   پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دورِ اکبری
علم دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں دُھوم

ملک میں ہر سو وہی پھر بول بالا تھا ترا   تھا جہاں علم و ہنر گودوں کا پالا تھا ترا
تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اُجالا تھا ترا   پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا
چاند نکلا تھا گہن سے جو وہ پھر گہنا گیا
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے   واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے   کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے
ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اُسکو بھی اے دلّی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی — ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی — اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

تجھ میں ہے دلّی! کوئی اب ایسا مقبولِ جہاں؟ — نازشِ دار الخلافت مرجعِ ہندوستاں
ہند سے لے تا عرب کشمیر سے تا انڈماں — بچہ بچہ کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں؟ — واقعاتِ زندگی کر دیجے گر اُس کے بیاں
سمجھیں اک افسانہ ناواقف اُسے اور داستاں — ہے تعجب خیز الحق سیرتِ محمود خاں

یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہرِ انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اُس کا تھا دیوان خانہ مُلک کا دار الشفا — خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اُسکے در سے ملتی تھی دوا — فکر نذرانہ کا تھا اُن کو نہ شکرانہ کا تھا

اُسکے استغنا سے جُھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کِھل مزدور کا

بے حقیقت اُسنے سمجھا مال و دولت کو سدا — تھے برابر اُسکے نزدیک اغنیا اور بینوا

گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا — کوئی مفلس کا نہ تھا پرسانِ حال اُسکے سوا

کرتے ہیں جو دعوئ ہمدردئ نوعِ بشر
اُسنے باطل کر دیئے تھے اُنکے دعوے سر بسر

طبِ مسلمانوں کی لی اُسکی مسیحائی نے تھام — ورنہ اب تک اُسکی تُرکی ہو چکی ہوتی تمام
رونقِ طبِ جدید اور اُسپہ میلِ خاص و عام — درسگاہوں اور دواخانوں کا اُسکے انتظام

دیکھ کر تھا اک زمانہ اُس کی خوبی کا مُقر
طبِ یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

سر جنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمالِ حِیَل — آگیا تھا رائے میں زود اعتقادوں کی خلل
دیں مگر اُس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل — طبِ یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل

سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اُسکے حملوں سے ہوئی عُہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب — پر اُلجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجأ و ماوٰے اُسیکا تھا مطب — اُسکے بیماروں کو۔ گو مایوس ہوں یا جاں بلب

سوءِ تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مُہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جسقدر — کرتے ہیں معلوم جو جو اُنسے امراضِ بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھکے اُنگلی نبض پر — اُسکی اک اُنگلی پہ تھے قربان سو تھرما میٹر

نارسا تھیں دوربینیں اہلِ صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہِ دوربیں اُس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن پیر و جواں۔ خُرد و کلاں تھے قوی پشت اُس سے ایسے جیسے پشتہ سے مکاں
جسکو نسخہ دیدیا لکھکر وہ یہ سمجھا کہ ہاں زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یہاں

گو کہ ماتم ملک میں ہے اُسکا ہر سو آج کل
پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب اور چارہ گر جو کہ تشخیص مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر
خلق کو تکیہ ہو جن کی رائے اور تدبیر پر شہر میں ہوں مرجعِ کل۔ ملک میں ہوں نامور

جمع ہوں محمود خاں کے ذات میں اُنکی کمال
ہے یہ سب ممکن۔ مگر محمود خاں ملنا محال

راستی اور راستبازی اُس کی تھی ضرب المثل اُسکے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل
امتحاں کے وقت جب تھا نظمِ عالم میں خلل راستبازوں کی گئی تھی ٹھیک جب ہر سو نکل

کھوٹ سے اُس آنچ میں نکلا وہ خالص اسطرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کُندن جسطرح

وہ زمانہ جب کہ تھا دلّی میں اک محشر بپا نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غُل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موج زن تھا جبکہ دریائے عتابِ ذوالجلال

باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھکر یاروں کو جب آنکھیں چُرا جاتے تھے یار   ساتھ دینا تھا کسیکا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار   شہر میں تھی چارسو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اُسکے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

ہو رہا تھا جب کہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں   کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پُتلا عیاں
ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کنواں   بال سے باریک تر تھی راہ اُن کے درمیاں

راہرو دُگدا میں تھے اور راہ پر خوف و خطر
اُسنے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ   عدل تھا مجرم کا دشمن اور بَری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ   پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اُسنے کی
اہلِ انصاف اُسکو بھولے ہیں نہ بھولینگے کبھی

بالیقیں جن مُلزموں کو اُسنے سمجھا بے خطا   مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا   جو کہ تھے نادار۔ کی اُن کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی خو جسکی نہ تھی　دی گواہی جسنے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی
جسنے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی　ہاتھ سے جسنے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی

بیگناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پانو ایک اُسکا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جبکہ عنقا تھی دیانت بینَ ابناء الزماں　تھی امانت جسکی اُسکے پاس ہلکی یا گراں
خوف میں پاس اپنے رکھا اُسکو مثلِ پاسباں　کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن واماں

ایک عالم ناخدا ترسی میں جب بیباک تھا
اُسکا دامن تھا کہ ہر دھبے سے بالکل پاک تھا

وضعداری میں نہ تھا اُسکا زمانہ میں بدل　وضع میں اُسکی تغیر تھا نہ عادت میں خلل
وقت کی تاثیر کا اُسپر نہ چلتا تھا عمل　انقلابِ دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل

اُسکے آگے اِن نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اُس پہ چلتی کچھ زمانہ کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرزِ زندگانی اختیار　اُسمیں فرق آیا نہ وقتِ واپسیں تک زینہار
کوہ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار　وضع اُسکی جو کہ تھی وضع سلف کی یادگار

قوم کے از یادرفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہد عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علایق کا تھا گو بارِ گراں　پر ہر اک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں

پابگِل دنیا میں۔پر دنیا کے غم سے برکراں   رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شاد ماں

ظاہرا پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا

دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اھل اللہ کا

منقبض اُسکو نہ مکروہات میں پایا کبھی   غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی

دل کسی بادِ مخالف سے نہ کُملایا کبھی   تلخیٔ دوراں سے چتون پر نہ میل آیا کبھی

کی بسر دار المحن میں بزم عشرت کی طرح

عمر کاٹی دوزخِ دنیا میں جنت کی طرح

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار   قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار

گُل کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادِ بہار   رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار

کرتے ہیں جب اِن حوادث کے نظر انجام پر

قوم میں اک ہمکو سناٹا سا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار   اہل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار

ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہوں گے کشت زار   جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار

مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یھاں

سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یھاں

یا یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبتِ قحط الرجال   ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال

دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اُسکی مثال   ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بیمثال

ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی — تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی
داستان کوئی بیاں کرتا تھا حُسن وعشق کی — اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم — راگنی نے وقت کی لینے دیا ہمکو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سَم — کوئی یہاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

۱۵۔ ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا

یہ خاک۔ آج جس پر ہیں جمع اہل آرا — یہاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گذر چکی ہیں — آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا
کل جشن فتح تھا یہاں ہو آج جشن شادی — ہر دم عروج پر ہو اسلام کا ستارا
بلبن کے آج مہماں خاقاں ہیں اور سلاطیں — اصطخر ہے کہ دلی بلبن ہے یا کہ دارا

فیروز شہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آمد آمد | دولھا بنا ہوا ہے تزئیں سے شہر سارا
تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل | بہر مدافعت ہے میدان میں صف آرا
مغلوں کے اُڑ رہے ہیں کل جشن فتح و نصرت | تیمور سے زمانہ ہے بر سرِ مدارا
آتا ہے آج بابر لودی پہ فتح پاکر | ہیں شوقِ شاہِ نو میں پیر و جواں خود آرا
کل سُوریوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے | مغلوں کا آرہا ہے گردش میں کچھ ستارا
ہی جشن فتح پھر آج چغتائیوں میں برپا | اقبال نے ہی گویا مغلوں سے قول ہارا
جس دُھوم سے ہی گھر گھر جشنِ جلوس اکبر | ہے گرد اُسکے آگے جشنِ قباد و دارا
شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا | تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارہ
طیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے | گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدہ* دوبارا
اطرافِ ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے | پاکر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا
ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر | بالائے تختِ طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن اُنکے اب تک سب زیبِ داستاں ہیں

اے خاکِ پاکِ دہلی اے تختگاہ شاہاں | پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں
ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سو | پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یہاں
تقریبِ جشن جسمیں ہو کچھ نہ جز اُخوت | ملکوں سے جمع آکر جسمیں ہوئے ہوں اخواں
پایین و صدر کا ہو جسمیں نہ کچھ تفاوت | خُرد و بزرگ کی ہو جسمیں نشست یکساں

* [illegible] جشن سدہ وہ جشن ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے اول جمشید نے پتھر میں سے آگ نکالی تھی اسی کی خوشی میں بڑی دھوم سے امرا [illegible]

جن کو نہ ہو بلاوا حاکم کا اور نہ قدغن | لایا ہو کھینچکر دل اُنکو نہ حکم سُلطاں
خادم ہوں جسقدر وہاں مخدوم قوم ہوکے | مخدوم جتنے ہوں وہاں سب قوم پر ہوں قرباں
خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ وہاں تواضع | ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں
ٹھہرائیں جسکو چاہیں وہ آپ میر مجلس | چاہیں جنھیں بنائیں وہ آپ میر ساماں
آئے ہوں اس غرض سے سب ملکے تاکہ سوچیں | دنیا میں کسطرح ہوں سرسبز پھر مُسلماں
ہندوستاں میں کیونکر باقی رہے نشانی | اُسقوم کی کہ تھا کل جنکے وہ زیر فرماں
نکلیں تو کیونکہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے | اعزاز نے تھا باندھا جنکے بڑوں سے پیماں
اُن مدرسوں کا کیونکر جاری رہے افاضہ | جنکے سبب سے ہے زندہ نامِ حدیث و قرآں
جو مسجدیں ہیں بہرِ ذکرِ خدائے واحد | محفوظ حادثوں سے کیونکر ہوں اُنکے ارکاں
جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر ہو | اپنی طرف سے لیکن ہو سعی فرضِ انساں
ای شہ نشین اسلام ای معدنِ سلاطیں | ای پائے تختِ سادات ای دارِ ملکِ مغلاں

تو جشن گاہ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے؟

شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے | شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے
دولت کے تھے وہ جلوے ملت کا ہے یہ نقشہ | کاغذ کی تھیں وہ ناویں بیڑا یہ نوح کا ہے
بے روح تھے وہ قالب ہے اسمیں روحِ خوشی | موجِ سراب تھے وہ یہ چشمۂ بقا ہے
میلے نہ وہ بچھڑتے روح اُنمیں گر یہ ہوتی | رہتا ہے آندھیوں میں روشن یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر
اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے

بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا
یہ چھت نہ سمجھو سر پر یہ سایۂ ہما ہے

گم گشتہ بخت جسکو پھرتے ہیں ڈھونڈھتے ہم
لگتا ہے کچھ تو اُس کا لگتا نہیں پتا ہے

وہ مشکلیں کرینگے اب حل ہمیں تمھیں کچھ
جن مشکلوں کا ہمکو اور تمکو سامنا ہے

ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے
معذور ہیں وہ اُنسے شکوہ نہ کچھ گلا ہے

فوجِ کمک کو اکثر سمجھا ہے فوج دشمن
حملہ کمک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے

نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہوا ہے جب دن
انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے

قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہمکو
ابتک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہے جان پر جب
لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بیخبر ہیں
پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفات بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر روتا ہے ناخدا جب

گلشن میں فصل گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچیں و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی
بیفکر و بیخبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے انکا اور جا رہے کہاں ہیں

فضل و کمال اُنکے کچھ تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

تم سے بھی تو تھا مو عزت کو قوم کی کچھ — اپنے تو قافلے سب پا در رکاب یہاں ہیں

اک خضر رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے — رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں

خدمت میں انکی حالی کہتا ہے یہ ادب سے — اسوقت رونق افزا یہاں جتنے مہرباں ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو — ورنہ بگڑنے کے یہاں آثار سب عیاں ہیں

عرصہ ہوا کہ ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں — قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

گھڑیال اور مگرمچھ ہیں انکو نگلے جاتے — دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو ورنہ رہنا یہاں اس طرح پڑے گا — بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روز بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ نہ جائیں

اشعارِ متفرقہ

اسمیں اکثر وہ اشعار ہیں جو لوگوں کی فرمایش سے خاص خاص موقعوں پر اُردو یا فارسی وغیرہ میں لکھے گئے ہیں

تمہید رقعہ شادیِ عروسی

شکر کیجے کونسی نعمت کا خالق کی ادا — ایک سے ہی ایک نعمت اُس کی بندوں پر ہوا
اُس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی — جس نے جو مانگا وہی اُسنے مہیا کردیا
نخل تر کو پھل دیا اور پھل کو بخشا رنگ و بو — سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب اور ضیا
کھیتیوں کو مینہ دیا ماں باپ کو اولاد دی — اُس سے دی دنیا کو رونق اِس سے آنکھوں کو جلا
عمر روز افزوں عطا فرمائی پھر اولاد کو — کل چھٹی تھی جن کی ہے دن آج اُنکے بیاہ کا
آؤ اُسکے شکر میں سب ملکے باہم شاد ہوں — تا کہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعامِ خدا

ایضاً

چھٹی بیاہ یا تیج تہوار ہو — لب آب یا صحن گلزار ہو
گل و لالہ ہو یا ہو عطر و گلاب — مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب
یہ سارے خوشی کے ہیں ساماں جب — کہ ہوں ایک جا جمع احباب سب
بزرگوں سے محفل کی شوکت بڑھے — عزیز اور پیاروں سے عزت بڑھے

جہاں اسطرح جمع ہوں چار یار ہیں اُس بزم پر لاکھ گلشن نثار

ایضاً

شکر کہ از فضلِ خدائے جہاں وقتِ خوش از پردہ برآمد عیاں

شادیِ دل راسبب آمد بدست فرصتِ بزم طرب آمد بدست

تا شود از مقدمِ اہلِ کرم کلبۂ ما غیرتِ باغِ ارم

ایضاً

رفت آسیبِ زمستاں بادِ نوروزی وزید دوستداراں رابشارت باد و یاراں را نوید

طرحِ بزمِ خرمی باہمدگر باید نہاد نغمۂ شکرِ الٰہی دمبدم باید کشید

ایضاً

سلامٌ مِن مُحِبٍ مستکینٍ یلیہ الخیر والبرکاتُ تتریٰ

سلامٌ رِدفُہٗ رَوحٌ وراحٌ وبَین یَدَیہِ للاَحبابِ بُشریٰ

ودَعوۃُ شاھِدِینَ وغائبِینا مِنَ الاِخوانِ والخلّانِ طُرّاً

خاتمۂ رقعۂ شادی

فاَطیبُ العَیشِ فِی الدُّنیا وارغَدُہٗ رھِینۃٌ بزیاراتِ الاَحِبّاءِ

ایضاً

ہزار دیدہ و دل فرشِ راہِ یارانے کہ از مسرت یاراں مسرت اندوزند

بہ شادی و طرب ہمدگر شوند انبار ہزار رُخ ز فروغ دلے برافروزند

ایضاً

کارِ احباب ساختن بتواں — دوستاں را نواختن بتواں

تا بہ دہر ابر و باد خواہد ماند — از شما لطف یاد خواہد ماند

اشعارِ غزل ناتمام

اس زندگی کے ہاتھوں چین ایک دن نہ پایا — یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں

حاضر ہو جب نہ دل ہی ہی باغ و راغ یکساں — ہم دوستو گئے بھی ۔ تو کیا گئے چمن میں

ہی اک خراش دل میں ۔ ڈر ہے کہ بھر نہ آئے — زخمی ہے قیرواں میں اور مشک ہے ختن میں

لو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوتی ہے ورنہ — اے فاختہ دھرا ہے کیا سرو و نارون میں

ایضاً

کسقدر یارو ہوا ہے انقلاب — آگیا یاروں کے اقراروں میں فرق

خود بتا دے گا تمھیں دورِ زماں — بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق

اِن پہ ہم قرباں ہیں وہ ہم پر نثار — ہے بہت پیاروں میں اور یاروں میں فرق

ایضاً

گر نہ ہو نیتِ گدا میں فرق — آئے کیوں شاہ کی عطا میں فرق

ہیں وفادار اور بھی لیکن — ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

اشعار قصیدۂ ناتمام

یادِ ایام کہ تھی باغ جوانی پہ بہار — نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار

نشہ میں چور تھے اک بادۂ پرزور کے ہم — جسکا راحت میں نہ کلفت میں اُترتا تھا خمار
سر پہ وہ دیو قوی آکے چڑھا تھا اپنے — یاد تھا جسکا نہ عامل کو نہ سیلنے کو اُتار
روکتا تھا نہ جسے غار نہ خندق نہ کُواں — تھے ہم اُس توسنِ سرزور پہ دن رات سوار
رہتے تھے اُس شترِ مست کی صورت بے قید — ہاتھ سے جسنے شترباں کے تڑالی ہو مہار
پند گو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دل سوز — اُن کی صحبت سے تھے اُتنے ہی زیادہ بیزار
خیر خواہ اور تھے غمخوار مربی جتنے — انکی صورت سے ہمیشہ ہمیں چڑھتا تھا بخار
ملکے ہمجولیوں سے جان میں جان آتی تھی — ہنسنے اور بولنے پر زیست کا تھا اپنی مدار
اب اُمنگیں ہیں وہ دل میں نہ ترنگیں باقی — تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں لیل و نہار

صدائے گدایانِ قوم

ڈھونڈھنے خضرِ مبارک پے کو یہاں آئے ہیں ہم — چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم
ڈر ہے جو خوشدل ہیں وہ سُنکر نہوں پژمردہ دل — سخت عبرت خیز لیکر داستاں آئے ہیں ہم
ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن — لیکے اُسکا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم
علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے — آج اس در پر اُسیکے نوحہ خواں آئے ہیں ہم
قوم کھو بیٹھی ہی جو **عباسیوں** کی یادگار — جستجو میں اُسکی مشعل لیکے یہاں آئے ہیں ہم
تاکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا — اسلیئے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم

8 پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے چند باہمت لوگوں نے جنھوں نے اپنی جماعت کا نام گدایانِ قوم رکھا ہے ریاست بہاولپور میں چندہ وصول کرنیکے لیئے جانیکا ارادہ کیا تھا۔ اُنکا قصد رئیس کے حضور میں یہ اشعار پڑھنے کا تھا لیکن غالباً اُنکا جانا نہیں ہوا۔ چونکہ رئیس بہاولپور بنی عباس میں سے ہیں اور عباسیوں کی خلافت میں علم کو بہت ترقی ہوئی تھی اسلیئے یہ مضمون اسطرح ادا کیا گیا ۱۲

خود غرض ٹھیرائیں یا مکار ہمکو یا گدا ... ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم

فخر سب بیجا ہیں اُنکے قوم ہے جنکی ذلیل ... فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

ہی بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل ... اسلیے یہاں بن بُلائے میہماں آئے ہیں ہم

تشنگی اپنی بُجھائی ہوگی اے آبِ حیات ... لیکے مونہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

مژدہ قدوم حضور شاہزادہ ویلز در ہند

مژدہ ہو اہلِ مشرق اب دن پھرے تمہارے ... مغرب سے سوے مشرق آیا ہے مہر تاباں

گلہ کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے ... ہے ایسے گلہ باں پر گلہ کی جان قرباں

ہندوستاں بھی تجھ سے کچھ آجکل نہیں کم ... لے معدنِ بزرگی اے خاکِ انگلستاں

تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن ... ہند بھی ان دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں

مہماں ہے آج اُن کا اُس شاہ کا ولی عہد ... روئے زمیں کے سلطاں جسکے ہوئے ہیں مہماں

شکریہ عطائے مدرسہ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع اجمیری دروازہ دہلی بحضور جیمس لائل لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب از طرف طلبائے انگلو عربی سکول دہلی[8]

آئیے اے دلی کے دل آرا ... شہر دعاگو سب ہی تمہارا

شکر کا ہم کو گو نہیں یارا ... پر یہ ہے کہنا فرض ہمارا

8 یہ نظم چونکہ صغیر سن طالب علموں کے لیئے لکھی گئی تھی تاکہ وہ ہزآنر کے روبرو مجتمع ہو کر بطور کورس کے گانے کی لَے میں پڑھیں اسلیئے بچوں کی سمجھ کے موافق نہایت سیدھے سادے الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں ۱۲

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

ہے دلّی کے فخر کا یہ دن ، شہر میں آیا شہر کا محسن
وصف تمہارا گو نہیں ممکن رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر کیسے کیسے رعیت پرور
جنسے ہے ہندستان منوّر فخر ہے انگلستان کو جن پر
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آر کلارک احسان کا پتلا آدمی کی صورت میں فرشتہ
تھا دلّی پر فضل خدا کا تم نے جو دلی میں اُسے بھیجا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آب و ہوا سے شہر کی ساری آئی تھی خلقت جان سے عاری
تم نے لگا کر نل اک باری چشمۂ حیواں کر دیا جاری
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

یوں تو ہیں سب احسان مسلّم سب سے ہے یہ احسان مقدم
تھے تعلیم میں کم سب سے ہم تم نے مدد کی اپنی پیہم

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

جوبلی کے جو خاص وظیفے پانچ برس کو ہمکو ملے تھے
لطف سے میعاد اُنکی بڑھاکے جیت لیئے دل آپ نے ہمسے

جبتک ملک آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا
مانگے تانگے پر تھا گذارا مٹ گیا اب خلجان یہ سارا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

درس کے کمرے جسمیں ہیں اکثر   قدرِ ضرورت سے کچھ بڑھکر
بورڈروں کے رہنے کو ہیں گھر   کھیلنے کو میداں ہی سراسر

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

شہر میں جا کالج کو عطا کی   کیں اصلاحیں آب و ہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی   شرطِ حکومت تمنا ادا کی

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

تم میں ہیں جو موجود فضائل   وہ نہیں کچھ محتاج دلائل
لوگ سب اُنکے دل سے ہیں قائل   او! سر لائل۔ او! سر لائل

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

اشعار مدحیہ

بحضور سر ڈینس افزیٹرک لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب۔ انبالہ کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے

قیصر ہند کے ہیں سیکڑوں احسان جہاں   اُسکا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احساں
حکمراں آئے ہیں پنجاب میں ابتک جتنے   ایک سے ایک کا پلہ ہے عدالت میں گراں

جبکہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا۔ اُسدم ۔۔۔ وقتِ رخصت تھا ہر اک اُنکو بحسرت نگراں
حال جو ہوتا ہے بچوں کا بچھڑ کر ماں سے ۔۔۔ یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں
جانشیں اُنکے ہوئے آنکے جب سر لائل ۔۔۔ عہدِ سابق کو گئے بھول سب ابنائے زماں
شکر سے عہدہ بر آ اُسکے نہیں ہو سکتے ۔۔۔ رحم و انصاف ہوا ذات سے جو اُنکی عیاں
اُٹھ گیا سر سے جب اس مُلک کے سایہ اُن کا ۔۔۔ ہاتھ میں آپ نے لی آکے حکومت کی عناں
کار فرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ ۔۔۔ معدلت آپ کی اُسوقت سے مشہور ہے یہاں
حیدر آباد میں۔ میسور میں۔ کلکتہ میں ۔۔۔ نیکنامی کے کیئے کام۔ رہے آپ جہاں
ہے یہ اب آپ سے اُمید کہ پنجاب میں بھی ۔۔۔ مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہونگی آساں
بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈینس بھی ۔۔۔ چھوڑ جائینگے ہر اک دل پہ عقیدت کے نشاں

انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل رُبا امیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا ۔۔۔ جب وہ ترے دل سے ہو جائیں گی سراپا
وہ عالمِ جوانی جسپر کہ تو ہے مفتوں ۔۔۔ جائے گا ٹوٹ جس دم اُس کا طلسم سارا
جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تونے اُسکو ۔۔۔ تھا جو کہ تجھکو اپنا آرام دل سمجھتا
چل دینگے جب وہ سارے اُن بلبلوں کی مانند ۔۔۔ بعد از بہار جو رُخ کرتیں نہیں چمن کا
جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ ۔۔۔ کون آکے دے گا تجھکو اُسکے سوا سہارا
بے مہریوں سے تونے جسکو کیا ہے غمگیں ۔۔۔ تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آکے لے گا

جسطرح وہ پرندہ جو فصلِ گل میں جاکر پھر موسمِ خزاں میں آکر ہے ہمسے ملتا

دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں تو ہے انسان کی دولت یا میں
ہے زمانہ میں بڑی بات تری دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنسکے یہ دولت نے کہا تجھکو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب ۔ جس کو خدائی مانے اُسکی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے لیتے ہیں توشۂ عقبےٰ مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے لقب ادبار ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشوونما علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال لاکھ رکھتا ہو کوئی حُسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں ۔ مگر میں نہ ہوں ۔ تو نہیں کچھ قدر بشر
چند روز آگئی میں جس کے کام زندہ تاحشر رہا اُس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا وہ سدا خوار و نگونسار رہا
مونہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
چاہتے ہیں مجھے سب خرد و کلاں پھرتے ہیں دُھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو / کسی آغاز کا انجام نہ ہو
کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا / درمیاں گر نہ قدم ہو میرا
ہیں رُکھائی سے مری سب لرزاں / میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں
جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں / ہو اگر شیر تو روباہ کروں
الغرض ہے مری وہ شانِ عظیم / کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم
جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھکو / میری عظمت نہیں باور تجھکو
تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا / جسنے مجھ سے تجھے گمراہ کیا
وقت نے سُن کے کہا اے دولت / شک نہیں اسمیں ذرا اے دولت
ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر / اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھکو خبر
تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی / اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی
کیجئے فرض تجھے گر چشمہ / تو ہوں اُس چشمہ کا میں سرچشمہ
میں ہوں یا تو ہے اہاں امکاں؟ / پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں
تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں / تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
ہے قرابہ ترا گر عطر آگیں / میں ہوں اُس عطر کی واللہ زمیں
ہے عبث تجھکو تفوق کا خیال / تو ہے گر مال تو میں راس المال
جنکے قبضے میں ہوں میں اے دولت / تجھپہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت
لاکھ بار اُنسے اگر بھاگے تو / بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُنکی مٹھی میں ہے تو اے دولت / طائرِ رشتہ بپا کی صورت
نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود / جس کا نایاب ہی عالم میں وجود
کھو کے مجھکو کوئی پاتا نہیں پھر / جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر
ایک پل میری اگر دیجے گنوا / لیجے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اُٹھا
تو اگر اپنی لُٹا دے ثروت / پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت
ہیں اسیواسطے جو اہلِ تمیز / میری ایک ایک پل اُنکو ہے عزیز
میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس / ہے مِرا جاگتے سوتے اُنھیں پاس
جانتے ہیں حکما و عُرَفا / مجھکو سرمایۂ دین و دنیا
دل ہیں جن کے مری کچھ قدر نہیں / اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہی نہ دیں
نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام / نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ اُنھیں دین کی دولت ہاتھ آئے / اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیائے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوۃ / نہ ہو قدرت ہیں حج اُن کی نہ زکوۃ
نہ مدد اُنسے کچھ اپنی کی جائے / نہ خبر اُنسے کسی کی لی جائے
گُن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت / ہے مگر تنگ مجالِ فرصت
بس زیادہ نہیں مُہلت مجھ کو / بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اسمیں ہے میرا سراسر نقصاں
کہ ہے انمول مری ایک اک آں

ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جنمیں کچھ قدرِ قلیل
اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل

اُن کو ایسوں سے نہیں ملنا روا
جو لیاقت رکھتے ہیں اُنسے سوا

اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں
دیکھنا لازم پہاڑ اُسکو نہیں

سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر
شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر

چاہیئے دن کو نہ نکلے زینہار
ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرمسار

قطعاتِ تاریخ اور تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

راقم کو فی الواقع مادۂ تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے۔ اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسنِ اتفاق سے بغیر اسکے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادۂ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اسپر صرف مصرع لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے۔ لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اسلیئے اکثر طوعاً و کرہاً یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اُپچ سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔

ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیئے آیا کرتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کرکے اُسکے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ تو یہ قفل بغیر کنجی کے کھولدے۔ اُسنے کہا بھائی میں نے نبوت کا دعوے کیا ہے۔ آہنگری کا دعوےٰ نہیں کیا۔ اُنکا مطلب اِس نقل سے یہ تھا کہ ہمنے خدا کی طلب میں درویشی اختیار کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل ورسیانا بھی بننا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے ملک میں اُن لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اور

توکسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے۔ اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی اُنسے اُسوقت متعلق ہوجاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے مثلاً کسی کے اصطبل کی مرمت ہوئی۔ یا گھوڑا اختہ کیا گیا۔ یا کسی کی مینا مرگئی۔ یا مرغ پالی جیتا۔ یا بلّی نے بچے دیئے ایسے وقت میں شعرا کو مقابلہ کے امتحان کا موقع ملجاتا ہے۔ جو شخص مادّۂ تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمایش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا ہے اُسکا فی الجملہ اعتبار بڑھجاتا ہے راقم چونکہ تاریخ نکالنے میں سدا سے ہیٹا تھا اسلیئے ہمیشہ اس امتحان سے کترا تا رہا لیکن بُری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمایش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی تھیں اُنمیں سے جسقدر سر دست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کردی گئیں۔ تاکہ دیوان کے ضروری اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہوجائے۔

تاریخ وفات مرزا غالب مرحوم دہلوی

غالب نے جبکہ روضۂ رضواں کی راہ لی
ہر لب پہ آہِ سرد تھی ہر دل میں درد تھا

اُسدن کچھ اہل شہر کی افسردگی نپوچھ
دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا

حالی کہ جسکو دعوئ تمکین و ضبط ہے
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا

تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستاں نژاد
عرفی و انوری کا مگر ہمنبرد تھا

8 یہ تاریخ خود غالب مرحوم کی غزل کے ایک مصرعہ سے نکالی گئی ہے۔ اُنکی غزل کا مقطع یہ ہے وہ یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ تن کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا، اخیر مصرع کے اعداد ۱۲۷۹۶ ہوتے ہیں۔ جب انمیں سے لفظ تاریخ کے عدد یعنی ۱۲۱۱ اور لفظ فکر کے عدد یعنی ۳۰۰ کا تخرجہ کیا گیا تو ۱۲۸۵ باقی رہے اور یہی اُنکا سال وفات ہے مختصر صورت تاریخ کی یہ ہوئی ۱۲۷۹۶ - (۱۲۱۱ + ۳۰۰) = ۱۲۸۵ھ

اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد — اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا
ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جانگزا — دل تھا کہ فکرِ سال میں بے صرفہ گرد تھا
ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا — (سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا)
"تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیرِ فکر — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"
۱۱ ۱۲ ۳۰۰ ۶ ۹ ۷ ۲

تاریخِ وفات محمد ابراہیم جوان مرگ طالبِ علم بی اے کلاس دہلی کالج

محمد براہیم چوں ترکِ جاں گفت — زنخلِ جوانی ثمر برنخوردہ
بگفتم زروئے الم سالِ فوتش — بجاں آفریں جان شیریں سپردہ
۱ — ۱۲۹۲ + ۱ = ۱۲۹۳ ھ

تاریخِ وفات سیّد خواجہ ناصر وزیر مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیر راہیِ ملکِ بقا — سب ہوئے اندوہگیں شہر کے برنا و پیر
دل نے کہا ہر جگہ پھبتی ہے چیز اک جدا — باغ میں نسرین و گل چرخ پہ مہرِ منیر
عیش میں شعر و غزل۔ سوگ میں تاریخِ مرگ — غیب سے آئی ندا "خلد میں ناصر وزیر"
۹۸ ۱۲ ھ

تاریخ طبع جغرافیہ تمثال مؤلفہ خواجہ سیّد شہاب الدّین حسن صاحب دہلوی

وہ جغرافیہ جسکی تھی احتیاج — چھپا مژدہ اے طالبانِ کمال
نئی طرز کا ہے یہ جغرافیہ — عیاں جس سے ہے ربع مسکوں کا حال
ملی طرفہ تر اس کی تاریخ طبع — وہ خود طرفہ ہے جیسے قیل و قال
اگر سال ہجری کی ہے جستجو — تو جغرافیہ خوب بتاتا ہے سال
۹۹ ۱۲ھ
ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی — کہو اسکو جغرافیہ بے مثال
۱۸ ۶ ۸۲

تاریخ بہ پایاں رسیدن بنائے سید مہدی علی مرحوم رئیس گلاؤٹھی در بلند شہر

علی آں سیدِ والا کہ باشد — بنامش مہرباں جزوے ز جزا
بود با ذاتِ او توام سیادت — چناں کز نام او مہر ست پیدا
چو ایں کاشانہ را بنیاد بنہاد — بعہدِ حاکمِ بیدار و دانا
گروس آں فیض گستر کز وجودش — شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا
چنیں گفتمش حالی سالِ تعمیر — مکان بے نظیر آباد بادا
۱۲ ھ ۹۹

تاریخ اورنگ نشینی حضور آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی خاں بہادر فرماں روائے ملک دکن

بہ سالِ فرخ و ماہِ سعید و روزِ فرخندہ — نظام الملک محبوب علی خاں آصفِ ثانی

بہ تختِ سلطنت بنشست و حالی گفت تاریخش
برائے وے مبارک تاج و اورنگ جہانبانی
ھ ۱ ۳ ۰ ۱

تاریخ تالیف قواعد اُردو مؤلفہ خواجہ شہاب الدّین حسن صاحب دہلوی

قواعد ہے یہ اردو کی کہ جس کا
بیاں شافی ہے اور ترتیب محکم

کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی
زیادہ حجم میں اور نفع میں کم

مگر یہ مختصر ہے اک رسالہ
کہ ہیں جسمیں قواعد سب فراہم

وجود اسکا ہے گو سب سے مؤخّر
یہ خوبی میں ہے اکثر سے مقدم

جو قیمت پوچھئے تو ہے بہت سہل
نہ دینار اسمیں لگتے ہیں نہ درہم

اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب
تو ہے اے طالبو "اکسیر اعظم"
ھ ۱۳ ۰ ۲

تاریخ رحلت نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

دردا کہ ضیاء دین احمد بربست
رختِ سفر از جہاں کہ جائے الم ست
۹ ۲ ۹

ازطاق و زایوان و ز بزم و جلسا
بگسستہ بہ رحمتِ الٰہی پیوست
۱۱۰ ۶۸ ۴۹ ۹۴ ۶۹۴

---

8 یہ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ ۹۲۹ میں سے جو کہ ضیاء دین احمد کے اعداد ہیں ۳۲۱ جو کہ طاق - ایوان - بزم اور جلسا کے اعداد کا مجموعہ ہے تخرجہ کرکے باقی یعنے ۶۰۸ کو ۶۹۴ میں جو کہ رحمت الٰہی کے اعداد ہیں ملانے سے ۱۳۰۲ حاصل ہوتے ہیں اور یہی نواب مرحوم کا سال وفات ہے مختصر صورت تاریخ کی یہ ہے ۹۲۹ - (۱۱۰ + ۶۸ + ۴۹ + ۹۴) = ۶۰۸ + (۶۹۴) = ۱۳۰۲ھ

تاریخ طبع دیوان منشی اقبال حسین صاحب متخلص بہ عاشق

جواں مرد آزادہ عاشق کہ نیست — در اقرانِ خود کس مر او را قریں
نہ صیاد و ہموارہ از حسن خلق — پئے صیدِ آزادگاں در کمیں
نہ سحار و پیوستہ زافسون نطق — کشد ز آشیاں بازو شیر از عریں
ہے بار دار جبہہ اش انبساط — اگر مہربان ست و گر خشمگیں
نہ بینیش گہ سرکہ بر ابرواں — نہ یابیش افتادہ چیں بر جبیں
دو سال ست کافسونِ مہر و وفاش — ربودست صبرم ز جانِ حزیں
دلے دیر پیوندِ نا آشنا — کہ بودست فارغ ز مہر و ز کیں
ندانم کہ عاشق چہ افسوں دمید — کہ در باخت خود را بمہرش چنیں
سررشتہ ہیہات دادم ز دست — سخن ز آسماں بود و رفت از زمیں
کنوں رانم از طبعِ دیوان سخن — کہ شد جلوہ فرما بہ نوعے گزیں
دریں روزہا کز صروفِ زماں — سخن شد مُہان و سخنور مہیں
عروسِ سخن مے نیرزد بجو — بہ حسن ار بود غیرتِ حورِ عیں
صد آباد بر عاشق و عزم او — کہ در دورِ ناسازگاری چنیں
زمعنی بہ بیگانہ و آشنا — فشاندست گنجینہ از آستیں

چو دیوانِ اردوے عاشق کہ ہست | صنمخانۂ طرفہ گفتی زچیں
بہ پیرایۂ طبع آراستند | شنیدند از ہر کنار آفریں
سخن کش نبود آرزشے درجہاں | زشادی نہ گنجید در پوستیں
چو حالی ہے جست تاریخ طبع | صنمخانۂ عاشق آمد سنیں

تاریخ بنائے جاہ درمحوطۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بحساب سال بعثتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بحسن سعی جناب آنریبل سر سید احمد خاں بہادر

بدایت کیجیے گر سال ہجرت کی محرم سے | تو کہیے سالِ بعثت کا مہِ شوال کو مبدا
کلام اللہ اترا آخرِ ماہ مبارک میں | ہوا اسواسطے شوال مبدا سال بعثت کا
نکالے یہ مبارک سن جنابِ سید احمد نے | بنایا جسنے دار العلم میں یہ چشمۂ زیبا
زروے سال بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش | کہا ہاتف نے حالی سے کہ "چشمہ فیض احمد کا"

تاریخ طبع ترجمہ تاریخ دربار قیصری بحساب سال عیسوی

پنجاب کے ادارۂ تعلیم عام نے | ایک اور کام ملک کے حق میں کیا ہے خوب
دربار قیصری کی جو تاریخ تھی چھپی | اب ترجمہ اُسکا مرتب ہوا ہے خوب
ہیں لفظ دلکشا تو مضامین ہیں دلنشیں | ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب

چھپکر ہوا تمام تو حالی نے یوں کہا | "دربار قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب"
۸۲ ۱۸ عیسوے

تاریخ بنائے مہماں سرا در موضع موں واقع پنجاب بحساب سال عیسوی

بحرِ کرم آں وزیر چند کہ باقی ست | نامِ بزرگانِ موں زبذل ونوالش
ساختہ منزل گہے چو بہرِ غریباں | تکیہ گہ ہر غریب آمدہ سالش
۷۷ ۱۸ ۶

تاریخی بر حملے مقتبس از قرآن مجید

تاریخ وفات غفران مآب نواب محمد مصطفے خاں مرحوم دہلوی رئیس جہانگیر آباد متخلص بہ شیفتہ و حسرتی

جَزَاھُم بِمَا صَبَرُوا جَنّاتٍ وَحَرِیْرًا
۷ ۷ ۲ ۱ ھ

آیہ قرآنی میں بما صبروا جنّۃً وحریرًا ہے۔ چونکہ تاریخِ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اسلیئے جنّۃً کی جگہ جنّاتٍ کردیا گیا ہے۔ جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجاے فروحٌ وریحانٌ وجنّۃُ نعیمٍ کے ھُنا روحٌ وریحانٌ وجنّاتُ النعیمِ کردیا ہے۔

چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد وآلام بے نظیر صبر واستقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے اسلیئے اس آیت کا مضمون اُنکی وفات کے نہایت مناسب

تصور کیا گیا۔ یعنی جناب باری نے بعوض اُنکے صبر کے بہشت اور بہشت کا لباس اُنکو عنایت کیا۔

تاریخ وفات نواب محمد نقشبند خاں مرحوم ولد اوسط نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد

وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ

۱۲۹۴ ہجری

چونکہ عزیز موصوف ایک وجیہ و شکیل آدمی تھے اور اُنکی وفات عنفوانِ شباب میں واقع ہوئی تھی اسلیئے یہ آیت اُنکی تاریخ وفات کے لیئے نہایت مناسب اور موزوں سمجھی گئی۔ اللہ تعالےٰ اہلِ جنت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ "پہنائے گئے اُنکو چاندی کے کنگن" بجاے مضارع کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا اُنکی مغفرت ہو چکی۔ اور اہل جنت کے تمام حقوق اُنکو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حُسن اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونو کی تاریخ وفات قرآن مجید سے برآمد ہوئی اور پھر ایک ہی سورت یعنی سورۂ دہر سے نکلی۔ اور دونوں آیتیں اہل جنت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بناے آئینہ خانہ در ریاستگاہ بہاول پور

کَاَنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنَ الْقَوَارِیْر

۱۲۹۶ ہجری

قرآن مجید میں اصل آیت " اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ " ہے تاریخ میں بضرورتِ تکمیل اعداد اور نیز بمقتضائے مقام اِنَّهٗ کی جگہ کَاَنَّهٗ کردیا گیا ہے مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پورے نہیں ہوتے تھے اسلیئے قَوَارِیۡر میں الف لام بڑھاکر اَلْقَوَارِیۡر کردیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں جب سبا کی بادشاہزادی بلقیس اول ہی دفعہ وارد ہوئی تو اُسکو شیش محل کے صحن پر جسمیں آئینے لگے ہوئے تھے یہ گمان ہوا کہ گویا پانی بھرا ہوا ہے اُسنے فوراً پائینچے چڑھائیے۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا " اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ " یعنی یہ تو ایک محل ہے جسمیں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ تاریخ بنامیں اِنَّهٗ کی جگہ کَاَنَّهٗ کردینے سے یہ معنی ہوگئے کہ گویا یہ وہی سلیمانؑ کا شیش محل ہے۔

یہ تاریخ ایک دوست کی فرمایش سے جو اُسوقت بہاول پور میں ملازم تھے بھیجی گئی تھی مگر ایسا سنا گیا تھا کہ پسند نہیں آئی۔ نہ اسلیئے کہ اسمیں دوجگہ اپنی طرف سے تصرف کیا گیا ہے بلکہ اسلیئے کہ نواب صاحب کا نام اسمیں نہیں تھا۔

تاریخ ولادت فرزند درحرم سرائے نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا۔ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ

ھ ۱ ۳ ۸

اس آیت سے سنین مطلوبہ یعنی ۱۳۰۸ھ اسطرح نکلتے ہیں کہ آیت کے جملہ اُولیٰ یعنی "حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا" کے اعداد ۱۶۵۴ ہیں۔ انہیں سے هٰذَا کا تخرجہ اور ملک کریم کا بجائے اُسکے

تعمیہ کرنے سے ۱۳۰۸ حاصل ہو جاتے ہیں۔

تخرجہ و تعمیہ کا اشارہ گویا "اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ" سے نکلتا ہے۔ کیونکہ اس جملے کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے کہ نہیں ہے "هٰذَا" مگر "مَلَكٌ كَرِیْمٌ"، تو اس سے یہ مطلب مستفاد ہوگا کہ اوپر کے جملے میں هٰذَا کی جگہ مَلَكٌ كَرِیْمٌ رکھدو۔ اور سطرح ۱۳۰۸ حاصل ہو جائینگے اصل آیت میں حَاشَ لِلّٰہِ ہے بضرورت لام اضافہ کرکے لِحَاشَ کردیا گیا ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے (حاشاللہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو ہو نہو کوئی معزز فرشتہ ہی) جو عورتیں زلیخا کی فریفتگی پر اُسکو ملامت کرتی تھیں جب حضرت یوسفؑ دفعۃً اُنکے سامنے آئے تو اُسوقت جو الفاظ اُنکے مونہ سے نکلے تھے اُنکو قرآن میں اسطرح نقل کیا گیا ہے۔

تاریخ وفاتِ مہین برادرِ راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر

سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

۱۳ ھ

یہ تاریخ برادر زادہ راقم حافظ اخلاق حسین سلمہ اللہ تعالی نے اپنے والد مرحوم کی وفات سے چند روز بعد عین تلاوت کے وقت قرآن مجید سے اقتباس کی تھی جس سے بے کم و کاست سال وفات برآمد ہوتا ہے چونکہ یہ مادہ ندرت سے خالی نہ تھا اسلیئے بوجہ اتحاد کے اپنی تاریخوں کے ساتھ اس تاریخ کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ یہ تاریخ برادر مرحوم کے سنگِ مرقد پر جو کہ دلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے جوار میں واقع ہے کندہ ہے۔

قطعات تاریخ از نتائج طبع جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر

چونکہ برادر مرحوم کی بہت سی تاریخوں میں سے یہ چند قطعے باقی رہ گئے تھے اور انکی اشاعت کے لیے کوئی اور موقع نہ تھا اسلیئے بطور یادگار کے انکو بھی اپنے دیوان میں شامل کرلیا گیا ہے۔

تاریخ وفات جناب مولٰنا قلندر علی زُبیری پانی پتی غفر اللہ لہ متخلص بہ عالم

آن قلندر علی وحیدِ زماں — در نجابت زُبیری و سندی
خاکِ پانی پت از سکونتِ او — در جہاں شد عَلَم بہ مُستندی
مُرد و باخویش بُرد حکمت و علم — مانند خلقے بہ کوے نابلدی
جز دلِ او کہ بود جملہ صفا — نقد ہر کیسہ جیدست و ردی
جز کتابش[۸] کہ بُد ہمہ حسنات — درج ہر نامہ نیکی ست و بدی
گفت سالِ وفاتِ او مظہر — رفت عالِمؔ بہ جنتِ اَبدی

۲ ۱۲ ۹۳

تاریخ وفاتِ حافظ سعد اکبر مرحوم بانی مدرسہ اسلامیہ پانی پت

۸ کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے ۱۲
عالم مولوی قلندر علی مرحوم عالم تخلص کرتے تھے ۱۲

چو سعدِ اکبر آں یارِ گرِ قوم　　کہ مر اہلِ وطن را بود یاور
سوے جنت زدنیا رخت بربست　　ازیں غم تافت دلہا ہمچو آذر
دریغ آں نیک خواہِ جملہ احباب　　دریغ آں غمگسارِ ہر برادر
دریغ آں درسگاہِ اہلِ اسلام　　کہ ماند از مُردنش بے برگ و بے بر
چنیں سالِ وفاتش یافت مظہر　　شدہ جنت مقامِ سعدِ اکبر
۱۳ ھ

تاریخ اورنگ نشینی حضور نواب آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علیخاں بہادر دام اقبالہ فرمانروائے دکن

شاہِ دکن چوں نہاد حسبِ مرادِ عباد　　افسرِ دولت بہ فرق پاے بر اورنگ داد
سالِ جلوسش خرد گفت کہ بے سر شدہ　　فتنہ و فسق و فجور شر و فریب و فساد

ایضاً

عیاں شد چو عیدِ جلوسِ نظام　　بسے خوشتر از عیدِ وصلِ حبی[illegible]
خرد فرقِ اعدا تراشیدہ گفت　　کہ "نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب"
۱۳ ھ

تاریخِ ولادت فرزندِ ارجمند در کاشانۂ اقبال حضور نظام دام اقبالہ

شد چو خورشیدِ شرف طالع بمشکوے نظام　　قدسیاں گفتند شمعِ پاک [illegible]

مظہر اندر فکرِ تاریخِ ولادت رفتہ بود
عقل گفت "این لعل از کانِ شرافت آمدہ"
ا ۔ ب ۔ ۱۳ ہجری

تاریخ مدار المہامی نواب میر لایق علی خان مرحوم در سرکارِ عالی

دوش کردم ز عقل چند سوال
کوست حلّالِ مشکلات و عُقد

گفتمش کے بود کہ شاہ دکن
بنشیند بہ مسندِ اَب و جَد

گفت جشنِ جلوس فرخ او
در ہزار ست و سیصد ست و اَحَد

گفتمش پس کہ باشدش دیوان؟
قرعہ بر لایقِ علی خاں زد

گفتمش سنگہا دریں راہ است
گفت زو وا کہ حق بہ خواجہ رسد

گفتمش خواجہ کے شود دیوان؟
گفت "حق میرسد بمرکز خود"
ا ۔ ب ۔ ۱۳ ھ

تاریخ بنا و مرمت مسجد مولنا حاجی ابراہیم حسین صاحب انصاری اثنا عشری پانی پتی دام ظلہم العالی

جعفری مذہب بنا فرمود
بیتِ حق را کہ اعظم ست و قدیم

خبرش داد مُلہم صادق[8]
کرد تعمیر کعبہ ابراہیم
ب ۔ ۱۳ ھ

[8] بانی مسجد یعنی مولنا ابراہیم حسین صاحب کے والد کا نام اعظم علی اور اُن کے چچا کا نام جعفر علی اور دادا کا نام صادق علی تھا یہ تینوں نام اور خود بانی کا نام قطعہ تاریخ میں نہایت خوبی سے آیا ہے ۱۲